آج کا پاکستان

با تصویر

مادام کیمی میرپوا

مترجم : محمد حسن رالع

مکتبۂ جدید

پہلی بار مئی ۱۹۶۶ء
پرنٹر رشید احمد چودھری
پبلشرز مکتبۂ جدید لاہور

اِس کتاب کے پہلے انگریزی ایڈیشن
کے متعلق

صدرِ محترم فیلڈ مارشل محمد ایوّب خان
نے فرمایا ہے:

’’مَیں سمجھتا ہوں یہ کتاب بڑی دلکش ہے اور پاکستان کے بہت سے مقامات کو عمدگی کے ساتھ اور نہایت دلچسپ پیرائے میں بیان کرتی ہے۔‘‘

تشکّر

میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل محمدؐ ایوب خان کی انتہائی ممنون ہوں، کہ جب بھی میری ان سے ملاقات ہوئی، انہوں نے میری حوصلہ افزائی فرمائی، اور اپنی سرزمین کے متعلق میری تحریروں کی ہمیشہ داد دی۔

میں زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بے شمار اہل پاکستان اور غیر ملکی باشندوں کی شکر گذار ہوں جنہوں نے میرے سفرناموں کو بڑی دل چسپی سے پڑھا اور پسند کیا، اور جن کے خطوط میری زندگی کا گراں قدر سرمایہ ہیں۔ میں ان سب کی خدمت میں تہِ دل سے ہدیۂ تشکّر پیش کرتی ہوں۔

اٹلی کی آلویٹی کمپنی اور پاکستان میں ان کے ایجنٹس شاہنواز لمیٹڈ شکریے کے مستحق ہیں، جن کی محبوب مشینیں، اس مسودے کی تکمیل میں میرے دست و بازو بنیں۔

ریمنگٹن رینڈ والوں کا شکریہ بھی مجھے ادا کرنا ہے، جن کی ٹائپ مشین پر میرا اوّلین مسودہ معرضِ وجود میں آیا۔

واپڈا کے محکمۂ تعلقات عامہ کے قابلِ احترام ڈائریکٹر میجر حسن کے لیے

میرے ذہن و قلب سراپا سپاس ہیں کہ انہی کے قیمتی مشوروں سے منگلا ڈیم کا باب موجودہ اہمیت، وقعت اور معلومات کا حامل ہوا۔ "نوائے وقت" کے مسٹر عبیداللہ حسبِ ضرورت میرے غیر سرکاری سیکرٹری بنے، ان کی بھی میں ممنون ہوں۔ اسی قابلِ قدر اردو اخبار کے محمود شام، اور "پاکستان ٹائمز" راولپنڈی کے محمد حسن رابع، کی تعریف کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں، جنہوں نے میری تصنیف کا نہایت خلوص اور اہتمام سے اردو ترجمہ کیا۔

اور آخر میں —— پاکستان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتی ہوں۔ یہ وہ سرزمین ہے، جس سے مجھے انتہائی محبت ہے —— خدا اس کی روشنی تابندگی کو ابدیت اور جاودانی عطا فرمائے۔

کیمی میرپوا

۹، مئی ۱۹۶۶ء

فہرست

مشرقی پاکستان : ———

شخصیات : ———

تمہید

میں بحیرۂ عرب کے کنارے کراچی میں کلفٹن کے ساحل پر اونٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ میرے چاروں طرف سیاہ ریت اور چمکتا ہوا سورج تھا۔ پھیری والے عجب زبان میں چلّا رہے تھے اور اپنا سامان، پپیتے، چھپائی مٹھائی، اور نمکین بسکٹ کھا رہے تھے۔ اپنے مالک کے اشارے پر اونٹ مجھے لیکر اُتھلے پانی میں اُتر گیا۔ یہ جولائی ۱۹۵۸ء میں کراچی کی گرمیوں کی شام تھی۔ ایک ایسے شخص کے لئے جو ایشیائی آمدورفت کے ذرائع کا عادی نہ ہو یہ سواری خوفزدہ کرنے کے علاوہ مضحکہ خیز بھی ہے۔ میں یہ سوچ کر ہنس رہی تھی کہ میرے لئے ہزاروں میل دور اپنے گھر نیویارک سے علی بابا کی سرزمین میں آنا کتنا عجیب ہے۔

ایک ہفتہ بعد میں لاہور میں تھی۔ مغل فنِ تعمیر اور تاریخ کا خوبصورت شہر۔ لیکن یہ میرے لئے نہیں، میں یہاں کی رہنے والی نہیں۔ ایک ہفتے بعد میں امریکہ لوٹنے والی تھی۔ یہ میرے سفر کی آخری رات تھی۔ جمخانہ میں دوستوں سے ملنے کا وعدہ، ٹیکسیوں کی ہڑتال، بیکار پڑا ہوا ٹیلیفون، بے چین خیالات، یوں محسوس ہوتا تھا گویا میں کسی چیز کی کمی محسوس کر رہی ہوں۔ اسے وجدان کہہ لیجئے۔ میرے اندر عجیب بے چینی تھی۔ مجھے جمخانہ پہنچنا چاہیئے۔ میرے ہوٹل کے دو مہمانوں نے میری مدد کی اور مجھے آدھی رات کو وہاں پہنچا دیا، لیکن میرے تمام دوست کب کے

جا چکے تھے۔ میں تنہا اندھیرے میں بیٹھ گئی۔ محسوس ہوتا تھا کہ میں گھر واپس آ گئی ہوں۔ ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے مدھم موسیقی کی آواز آئی۔ ایک عورت نے جسے میں جانتی تھی، میرا نام ہلکے سے پکارا۔ "یہاں آیئے"۔ اسنے کہا "تھوڑی دیر ٹھہریئے اور میری سہیلیوں سے ملیئے"۔ آرام دہ کرسی کو بادلِ نخواستہ چھوڑ کر ہچکچاتے ہوئے میں وہاں پہنچ گئی۔

تقریباً اٹھارہ ماہ قبل اپنے آرٹسٹ ساتھی پیٹر کی موت کے بعد سے میں کسی جگہ کی بھی نہ تھی مرنے سے پہلے اس نے جو کہا تھا مجھے اب بھی یاد ہے۔ "کیمیل، میں سفر کرنا چاہتا ہوں، میں تاج محل دیکھنا چاہتا ہوں اور شالامار میں ٹہلنا چاہتا ہوں ۔ اور میرا یہ چھوٹا سا تھیلا جس میں میرے ہسپتال کے معائنے کی چیزیں ہیں رنگوں اور برشوں سے بھرا ہوا ہوگا۔"

میں نے اس تھیلے کے بارے میں پھر کبھی نہیں سوچا۔ نیویارک میں اپنی آخری رات میں نے یہ کسی اجنبی کو دے دیا۔ یہ پیٹر کے خون سے بھرے ہوئے ان کپڑوں کی تلخ یاد دلاتا تھا۔ جس روز اسے ہسپتال چھوڑنا تھا۔ ٹھوکر کھا کر گرنے سے اس کا سر پھٹ گیا تھا۔

رنگ اور برش تھے نہ سفر، صرف میری آوارہ گردی اور ہم آہنگی کی کوششیں باقی تھیں کسی کی سالگرہ کی تقریب تھی۔ تعارف کے بعد اچانک کسی نے مسکرا کر مجھ سے پوچھا، "ہیلو مادام، آپ اتنی دور کیسے آ گئیں؟"

خوف سے ملتا جلتا جذبہ میرے اندر دوڑ گیا۔ یہ اجنبی کون تھا جو اس بے تکلفی سے مجھے مخاطب کر رہا تھا۔ اسے کیسے معلوم ہوا کہ میں اتنی دُور سے آئی ہوں۔ اس کا چہرہ پُرشفقت اور آواز دوستانہ تھی لیکن پھر بھی میری بے چینی بڑھتی گئی۔ مدھم یادیں اُبھر آئیں، مجھے یاد نہ آ سکا کہ اس سے پہلے میں نے اُسے دیکھا ہے۔ گویا میرے خیالات کو پڑھتے ہوئے اس نے دوبارہ بات کی۔ "اچھا تو آپ کو یاد نہیں جب میں آپ کے افریقہ جانے سے پہلے، آپ کے پڑوسیوں

کے ساتھ نیویارک میں آپ کے گھر آیا تھا؟ آپ کو آخری وقت چیزیں بیچنا یاد نہیں؟ جب میں اقوامِ متحدہ میں پاکستان کا نمائندہ تھا میں نے اپنے مکان کے لئے آپ سے کچھ چیزیں خریدی تھیں۔ واپس آنے سے پہلے میں نے ساری چیزیں بانٹ دیں لیکن چھوٹا تھیلا اپنے پاس رکھ لیا۔ سامان میں یہ نہایت ضروری چیز ہے۔ سفر کے دوران میں ہمیشہ اسے ساتھ رکھتا ہوں۔"

میں دنگ رہ گئی اور بمشکل بول سکی۔ "آپ" میں بڑبڑائی۔ "آپ ہی وہ آدمی ہیں، وہ تھیلا ابھی تک آپ کے پاس ہے؟" درد سے چپ چاپ میں کرسی میں اور بھی دھنس گئی اور وہ آدمی اپنے سفر کے بارے میں باتیں کرتا رہا۔ اس نے تاج محل دیکھا تھا اور شالامار میں ٹہلا تھا۔ پھر اچانک میری تکلیف کو بھانپتے ہوتے وہ خاموش ہوگیا اور میرے آنسوؤں میں بھیگے ہوئے چہرے کو دیکھنے لگا۔ "کیا وہ تھیلا آپ کو بے حد عزیز ہے؟" اس نے کہا۔ "اگر یہ بات ہے تو میں اسے واپس کر دوں گا......" میں جواب نہ دے سکی کیونکہ میرا درد خوشی میں بدل گیا تھا...... پیٹر کے تھیلے نے ان تمام جگہوں کا سفر کیا تھا جہاں وہ جانا چاہتا تھا۔ "نہیں، نہیں" میں نے آگے جھک کر اجنبی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "آپکو وہ ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہیئے۔ آپ سے ملاقات ایک ایسے شخص کو بہت نزدیک لے آئی ہے جو بہت دُور چلا گیا ہے۔ آپ نے مجھے خوش کر دیا ہے......"

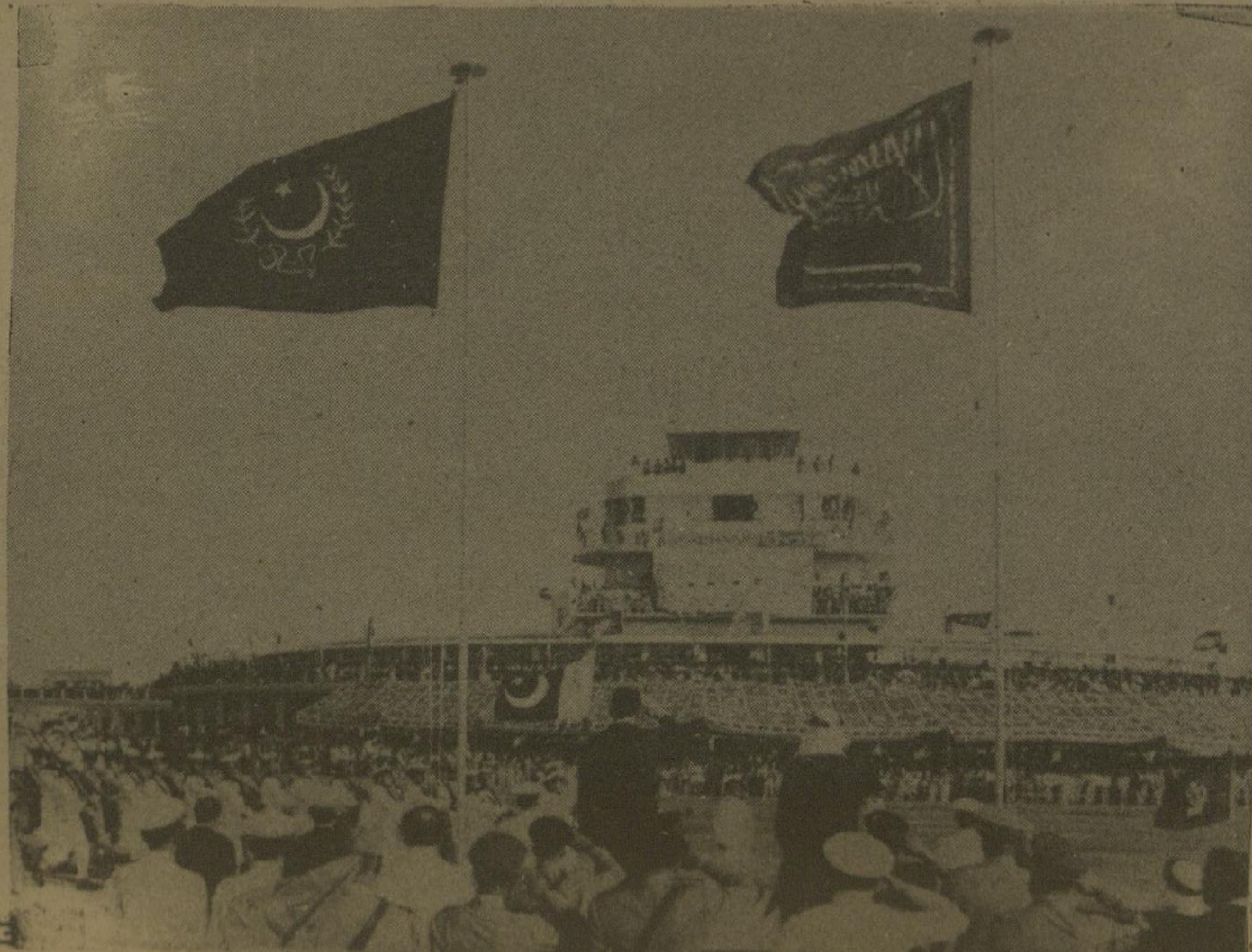
بہت عرصہ بعد جب اس بات کا اثر زائل ہوگیا تو میں نے محسوس کیا کہ یہ تو ضرور ہونا تھا ورنہ جولائی کے مہینہ میں میرے دل میں لاہور آنے کی خواہش کیوں پیدا ہوتی جب کہ اس زمانہ میں یہاں کی گرمی نقطۂ عروج پر ہوتی ہے اور سڑکوں پر چلتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے گویا شعلوں میں چل رہے ہیں؟۔ میں جس سے بھی ملی اس نے کہا۔ "اس زمانہ میں لاہور نہ جائیے۔ وہاں بے حد گرمی ہوتی ہے۔ یہ وہاں جانے کا موسم نہیں۔" لیکن میں ضد میں وہاں گئی۔ اپنے سفر کے دوران میں

بے شمار شہروں میں گئی۔ لزبن، روم، ممباسہ، کلیما نجارو، نیروبی اور پھر کراچی کے راستے گویا ایک پلان کی طرح میرا بے ترتیب پروگرام نقطۂ عروج کی طرف سیدھا راستہ بن گیا۔ یہ میرے لئے ابتدا اور نیا آغاز تھا۔ میرے درد کی شدت کم ہوگئی۔ میرا غم دُور ہوگیا۔ یہ تو ضرور ہونا تھا۔ یہاں میں گویا پلان کے مطابق آئی۔ زندگی کے بے کراں نقشہ پر ایک معمولی انسان کسی انجانی قوت کے ذریعے کھنچا چلا آیا جو ایک معجزہ معلوم ہوتا تھا...... آخر کیوں؟ ایک اجنبی وہ نھیلاے کر، جو پیٹر استعمال کرتا تھا، اپنے ملک کس طرح چلا آیا؟۔ اس رات میں نے ایک عام سی تقریب میں پہنچنے کے لئے اتنی سر توڑ کوشش کیوں کی؟ اس اجنبی نے مجھے اتفاق سے کیسے پالیا اور ماضی کی ایک یادگار سامنے لاکر مجھے قوت بخش دی جب کہ میری ہمت جواب دے چکی تھی؟

نئے عزم اور ولولہ کے ساتھ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ پیٹر کہیں آس پاس مجھے باہمت بننے اور کام کرنے کی تلقین کر رہا تھا، میں نے نئے جوش سے کام شروع کر دیا۔ میں نے جو کچھ لکھا فروخت ہوگیا اور دُور بیٹھے ہوئے ایڈیٹر میرے اُوپر مسکراتے ہوئے اور چیزیں طلب کرتے رہے۔ اب میرے سفر کا ایک مطلب تھا۔ "مجھے یہاں آنا ہی تھا" میں نے ان مقامات کے بارے میں لکھنا شروع کر دیا جو میں نے دیکھے تھے ۱۹۵۹ء کے شروع میں میں "ڈان" کے الطاف حسین (جو اب وزیر صنعت ہیں) سے ملی جنہوں نے مشورہ دیا کہ میں اتوار کے میگزین کے لئے پاکستان کی زندگی پر اپنے سفر کا کالم لکھنا شروع کر دوں۔ انہوں نے تمام انتظام مجھ پر چھوڑ دیا۔ میرے ذہن میں کا کس بازار کا وسیع سمندر اور اس کا ستر میل لمبا ساحل آیا۔ مجھے قبائلی لوگوں کا حسن اور درۂ خیبر کے اندر دنی گاؤں میں گزارے ہوئے دن یاد آتے اور میں ہمالیہ کے اُوپر سلسلہ قراقرم میں گلگت کا دم بخود کرنے والا ہوائی سفر جو دُور دراز نیپال میں پہاڑی گاؤں شرگیلا کو جاتا تھا، گوپی کے آبِ حیات اور اپنے میزبان راجاؤں کو کس طرح بھول سکتی تھی۔ میں تاریخ اور وقت کے اوراق پر چلی تھی اور

مغل عمارتوں کی خوبصورتی میں رہی تھی۔ میں سوچتی کتنے پاکستانیوں نے وہ کچھ دیکھا ہوگا جو میں نے دیکھا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ وہ میرے سفر میں شرکت کریں اور میں نے اپنے کالم کا نام "پہلے پاکستان دیکھیے" رکھا۔

یہ بے حد مقبول ہوا اور دور دور سے لوگوں نے ان مقامات کو دیکھ کر جن کے بارے میں میں نے لکھا تھا مجھے خوشی بھرے خط لکھے اور اس طرح "پہلے پاکستان دیکھیے" کا پہلا ایڈیشن وجود میں آیا اور فوراً بعد ہی دوسرا چھاپنا پڑا۔ بہت تھوڑے عرصہ میں دونوں ایڈیشن ختم ہو گئے اور لوگوں کی مانگ باقی تھی۔ یہ محسوس کرتے ہوئے کہ ۱۹۶۰ء کے دونوں ایڈیشنوں کے بعد پاکستان میں بہت سی تبدیلیاں آئی ہیں۔ پانچ سال اسلامی جمہوریہ پاکستان میں رہنے کے بعد میں نے اس کے نئے دور کے بارے میں لکھنا شروع کیا جس میں سیاحوں اور تاجروں کے لئے مزید کارآمد باتیں اور مزاح کا عنصر بھی شامل ہے۔



بین الاقوامی
ہوائی
مستقر،
کراچی

سیّاح پاکستان میں

۲۹ اگست ۱۹۶۴ء کو خوشی کے نعروں اور رنگ برنگ تقریبات کے ساتھ پاکستان کی پہلی آبدوز کشتی کراچی کی بندرگاہ میں داخل ہوئی، یہ خوشی کس بات کا اظہار تھی؟ پاکستان ترقی کی شاہراہ پر آگے بڑھ رہا ہے - یہ پاکستان کی شاندار بحریہ میں قابلِ قدر اضافہ ہے ... ہر لحظہ ترقی ہو رہی ہے اور سمندری راستہ سب کے لیے کھلا ہے۔

یہ اوراق الٹتے ہوئے آپ سیاحی پر پہلی کتاب پڑھ رہے ہیں جو اس ملک میں پہلی مرتبہ اس کی رومانی زبان —— شاعروں اور عظیم لوگوں کی زبان —— اردو میں لکھی گئی ہے۔ یہ کتاب ایک غیر ملکی خاتون کی تصنیف ہے جو خود بھی ایک سیاح تھی —— جو گوگا سے صرف دو چار روز کے لیے آئی تھی لیکن اس ملک کے پُر خلوص لوگوں کی سادگی، خوش گوار دھوپ، خوش باش رکشے والوں، لا ابالی اخبار فروشوں اور دوست نواز پاکستانیوں سے مسحور ہو کر اس نے یہاں سات سال گزار دیے کراچی —— دُنیا کے کونے کونے سے سڑک، سمندر اور ہوائی جہاز سے لوگ چلے آتے

ہیں۔ سیلونی، ترک، لبنان، مشرق وسطے کے دوسرے لوگوں کے ہمراہ تیل سے کمائی ہوئی دولت کو خرچ کرنے کے لئے کویتی، امریکی، انگریز اور یورپی جو مشرق قریب کا سحر محسوس کرنے اور یہاں کی مصنوعات استعمال کرنے کے مشتاق ہیں۔ ہوائی جہاز سے سفر کرنے والے بڑی امیدوں کے ساتھ کراچی کے بین الاقوامی ہوائی مستقر پہ اترتے ہیں اور خواہ وہ اکیلے ہوں یا کسی گروپ کے ساتھ، جیٹ طیارہ ہر ایک کے لئے طلسماتی قالین کی حیثیت رکھتا ہے...... ایشیا الف لیلےٰ کی سرزمین ـ جہاں خواب سچ ثابت ہوتے ہیں۔

بعض اوقات سیاحی ایجنٹ سفید تیز لو والے پھول سے ان کا استقبال کرتا ہے اور وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ مہم شروع ہو رہی ہے۔ ان کے دل میں کیا ہے؟ عورتیں گھوڑوں پر سوار صحراؤں کے شیخوں کے بارے میں سوچتی ہیں جن کی کاٹھیاں سرخ مخمل اور نقرئی کشیدہ کاری کا نمونہ ہیں۔ وہ دلکش ساڑھیوں، مہین ریشم اور شاید ایک لمبے، سیاہ اور خوبصورت مرد سے رومان کے بارے میں سوچتی ہیں جو مغل بادشاہوں کی پشت میں سے ہو جسے ان کی خوبصورتی متاثر کر سکے۔ وہ عظیم سفر شروع کر رہی ہیں۔ کون جانتا ہے کیا درپیش آتے۔؟

مرد کیا سوچتے ہیں؟ وہ، برقعوں میں چھپی ہوئی عورتیں، حیران کن چیزیں، پولو کے مقابلے، مہاراجوں کے کھیل، یہ نہ جانتے ہوتے کہ یہاں اس قسم کے خطابات نہیں۔ صرف حکمران ہیں جو پہاڑی ریاستوں پر حکومت کرتے ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا انھیں کوئی ایسی خوبصورت لڑکی ملے گی جو ان کی بات سمجھ سکے۔ کسی بڑے ہوٹل میں پہنچنے کے بعد، جو بیچ لگژری میٹروپول، پیلیس، سینٹرل یا نسبتاً کم مہنگا برسٹل، ڈی لکس یا تاج ہو سکتا ہے، ان کا پہلا کھانا چاول اور سالن اور مشرق کے تمام دوسرے مصالحہ دار کھانوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بعد کے اثرات سے بچنے کے لئے ان کھانوں کو رفتہ رفتہ کھانا

چاہیئے۔ ان میں یک لخت دوستی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ بیروں سے گپ لڑاتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں وہ کہاں سے آتے ہیں اور کہاں جا رہے ہیں۔ بیرے چست و چالاک ہیں۔ وہ ان کی طرف توجہ دیتے ہیں اور اس طرح کافی بخشش کما لیتے ہیں۔ ایک عام سیاح ایشیا میں ملازموں کی تعداد دیکھ کر بہت متاثر ہوتا ہے اور یہ ہمدردی اس بیرے پر مرکوز ہو جاتی ہے جو گو صرف چند گھنٹوں کے لئے اس کی ضروریات پورا کرنے کے لئے مقرر ہے لیکن عموماً اس وقت سوتا ہے جب اس کے ذمے کا آخری مہمان بھی آ جائے۔ بعض اوقات بالکل اس کے برعکس ہوتا ہے اور مہمان خوف محسوس کرتا ہے جب وہ اپنے اچھے بیرے کو آدھی رات کے وقت اپنے دروازے کے آگے فرش پر ہلکا سا کمبل بچھائے سویا دیکھتا ہے۔ بہت سوں نے زمین کی سختی کو کم کرنے کے لئے انھیں تکیے دئیے ہیں، بغیر یہ جانتے ہوئے کہ بیرا دل میں سیاح کو کوستے ہوئے دھیمی مسکراہٹ سے تکیہ قبول کرے گا۔ اور کیا اسے نہیں معلوم کہ تمام عمر وہ پکے فرش پر سوتے آئے ہیں اور اسے پسند کرتے ہیں۔

کراچی میں پہلی صبح کو وہ اپنے متعلقہ ملک کے سفارت خانے میں اپنی ڈاک لینے اور مہمانوں کے رجسٹر پر دستخط کرنے جاتے ہیں۔ گھر سے آیا ہوا خط۔ وہ خود کو کتنا اہم محسوس کرتے ہیں کیونکہ یہ خط ان کے کراچی کے پتے پر آیا ہے۔ امریکی سیاح اپنے سفارت خانہ کی خوبصورتی سے مسحور ہو جاتے ہیں اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ وہ بلند آواز سے چلانا چاہتے ہیں "یہ میرے ملک کی نمائندگی کرتی ہے۔ میں اس کو برقرار رکھنے کے لئے ٹیکس ادا کرتا ہوں"۔ وہ عملی طور پر اندر جا کر سفیر سے کہنا چاہتے ہیں ـــ "ہیلو، میں کیلیفورنیا سے آیا ہوں، دوست تم کیسے ہو"۔ لیکن اس کے بجائے وہ امریکی استقبال کرنے والے سے بات کرنے بیٹھ جاتے

ہیں کیونکہ جب تک کہ وہ کوئی اہم ترین شخصیت (VIP) نہ ہوں وہ مدار المہام وزیر ـ چچا سام کے ارکانِ سفارت کے پاس نہیں جا سکتے کیونکہ انھیں کے ذمہ اس سے کہیں زیادہ اہم کام ہیں۔ بہرحال، عام طور پر وہ ڈاک کے عملہ سے دوستی کر لیتے ہیں جو آنے والے بیشمار سیاحوں کو مستعدی اور خوشدلی سے جواب دیتے ہیں۔ پاکستانی ان میں دلچسپی لیتے ہیں اور آنے والے امریکی اس دلچسپی سے لطف اٹھاتے ہیں۔ وہ متعجب ہوتے ہیں اور ایسی گرمجوشی کا مظاہرہ کرتے ہیں جو وہ اپنے ملک میں اجنبیوں کے ساتھ نہیں کرتے۔

یورپی اور برطانوی لوگ نسبتاً بہتر رہتے ہیں۔ ان کے سفارتی عملہ کو دوستی کرنے کا زیادہ وقت ہوتا ہے اور عرب سیاح تو اپنے سفارت خانے پہنچتے ہی چائے پینے لگتے ہیں۔ اس کے بعد مقامات کی سیر آتی ہے۔ فریئر ہال سے شروع ہو جاتیے اور اشتیاق ایک دم بڑھ جاتا ہے۔ اس عظیم الشان عجائب گھر میں بدھ زمانہ اپنی تمام تر عظمت کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے پھیلا ہوا ہے۔ وہ یہاں نوٹس لیتے ہیں اور تصویریں کھینچتے ہیں اور فریئر ہال گارڈن میں سیر کو نکل جاتے ہیں۔ پاکستانیوں کو شلوار اور قمیض میں دیکھ کر انھیں تعجب ہوتا ہے اور عورتوں اور بچوں کے بھڑکیلے کپڑے دیکھ کر وہ مچل جاتے ہیں۔ وہ ان سے باتیں کرتے ہیں جن کا جواب کبھی انگریزی میں ہوتا ہے اور کبھی ملتا ہی نہیں۔ بہرحال باہمی سمجھ ضرور ہوتی ہے اور ایک غریب' کام سے فراغت پاکر آئے ہوئے چپڑاسی اور امیر کبیر امریکی سیاح کے درمیان خیر سگالی کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ پاکستانیوں کی نگاہ میں ہر سیاح امیر ہے اس کے علاوہ اور ہو بھی کیا سکتا ہے؟ وہ ان ممالک سے آئے ہیں جہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں۔ سیاح بچوں کو چوسنے والی مٹھائی اور اگر ان کا باپ آس پاس موجود ہو تو اسے سگرٹ دیتا ہے۔ اس سے بہتر دوستی اور کیا ہو سکتی ہے؟

تعریف پھوٹ پڑتی ہے اور یقین کیجئے کہ پاکستانی زندگی کے ہر شعبہ میں اس دوستانہ قدم کے بعد اکثر بے حد غریب گھر پر آنے، چائے پینے اور خاندان کے افراد سے ملنے کی دعوت ملتی ہے۔ سیاح کو سب سے زیادہ کیا چیز حیران کرتی ہے؟ یقیناً برقعہ میں چھپی ہوئی عورت اس میں بالکل چھپ کر وہ اسے کیسے برداشت کرتی ہیں؟ انھیں گرمی نہیں لگتی؟ انھیں بتایا جاتا ہے کہ بہت سی عورتیں چھوٹی لڑکیوں کی طرح بے پردہ پھر سکتی ہیں لیکن رسم و رواج اتنے کڑے ہیں کہ وہ اپنے شوہروں کو خوش کرنے کی خاطر بھی ایسا نہیں کر سکتیں۔ وہ سوچتی ہیں کہ ان کے والدین کیا کہیں گے اور اس تکلف کو چھوڑتی نہیں۔

بازار اور دکانوں میں گھومتے ہوئے لوگوں کی بھیڑ امریکنوں اور یورپینوں کا پیچھا کرتی ہے انھیں اس پر تعجب ہوتا ہے۔ وہ سنجیدگی سے چل رہے ہیں اور اپنے کام میں مصروف ہیں لیکن پھر بھی لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ آخر کیوں؟ یہ بات انھیں بتانی پڑتی ہے ان کے کپڑے مختلف ہیں اور ان کا مغربی انداز نمایاں ہے۔

انکی آنکھوں میں استعجاب کی جھلک ہے گویا وہ ہر لمحہ کوئی حیران کن چیز دیکھنے کی منتظر ہیں اور پھر ہر ایک کے کندھے پر کیمرہ جھول رہا ہے وہ ہر جگہ جانے کے لئے ٹیکسی لیتے ہیں (جو اس ملک میں بے حد سستی ہیں)، اور ان کا غیر ملکی پن واضح ہو جاتا ہے "مس گے پیرس"، اور "مس امریکہ" کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور جوانی اور خوبصورتی کو دیکھ کر خواہ وہ کسی قومیت کی ہو، پاکستانی مردوں میں سیٹیاں بجنی شروع ہو جاتی ہیں۔ سکنڈے نیویا کی سرخ عورتیں خاص توجہ کا مرکز بنتی ہیں اور لوگ انھیں پسند کرتے ہیں۔ ہجوم بڑھتا جاتا ہے اور وہ خوش ہوتی ہیں۔ وہ کلفٹن کے ساحل پر اونٹ کی سواری کرتی ہیں اور

بوہری بازار سے سنہری چپلیں خریدتی ہیں۔ وہ بے شمار ساڑھیاں، تانبے کے برتن اور تحائف خریدتی ہیں اور ٹیکسی ڈرائیور عموماً ان کے ہوٹل سے باہر آنے اور داخل ہونے کی تاک میں رہتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور کا ہمیشہ کوئی بھائی یا رشتہ دار ہوتا ہے جو دوسروں کی نسبت اچھی دستکاری کی چیزیں بیچتا ہے وہ انویریٹی روڈ پہ ہو سکتا ہے یا دور ویسٹ وہارف پر۔ سارے دوکاندار اس کے رشتہ دار ہوتے ہیں۔ آخر سیاح کو سانپ کی ٹانگوں والی ہاتھی دانت سے منقش چھوٹی سی میز تو ضرور لینی چاہیئے۔ ٹیکسی ڈرائیور کو معلوم ہوتا ہے کہ بہترین چیز کہاں سے مل سکتی ہے۔ اس طرح اسے جو کچھ مل جائے یہ اس کی بزنس ہے۔ عموماً اس کی کوشش ہوتی ہے کہ سیاح کو اچھی چیز ملے۔ یہ کام بہت کامیاب رہتا ہے اور ہر شخص خوش ہو جاتا ہے۔ سیاح فخر محسوس کرتا ہے کہ اس کے ساتھی کو ہر چیز معلوم ہے۔

دلچسپی کی ایک خاص چیز سپیرے ہیں۔ کار میں بیٹھا ہوا سیّاح اچانک چیخ اٹھے گا کیونکہ میٹروپول کی وکٹوریہ روڈ کی طرف فٹ پاتھ پر پلوتھی مارے داڑھیوں والے سندھی بین بجاتے رہتے ہیں۔ ان کے پاؤں کے نزدیک بڑی ٹوکری سے ایک سانپ نکلے گا اور آہستہ آہستہ اونچا ہوتا جائے گا۔ ٹیکسی رک جائے گی۔ مس ٹورسٹ دروازے کو مضبوطی سے تھام لے گی اور کہے گی۔ "کیا سانپ کود کر نکل آئے گا؟ یہ کاٹ لے گا؟ یہ خطرناک ہے؟ وہ اس کی تصویریں لے گی تاکہ گھر جا کر لوگوں کو دکھا سکے۔ خواہ وہ خوف سے کانپ رہی ہو لیکن کیمرہ بین کی دھن پہ ناچتے ہوئے سانپ کی تصویریں لیتا رہے گا۔ جب اسے بتایا جاتا ہے کہ سانپ اپنے مالک کے قابو میں ہے تو اس کی جان میں جان آتی ہے۔ موسیقی کے بند ہونے پر وہ بیٹھ جاتا ہے اور سو جاتا ہے۔

سفر اب شروع ہو گیا ہے۔ سیاح ٹھٹھہ اور عظیم الشان مغل مقبرے اور منگھوپیر پر مگرمچھ دیکھتے ہیں وہ علاقائی رقص دیکھتے ہیں اور ہوٹل کے برآمدے میں کسی سے اتفاقیہ ملاقات کے بعد اس کے گھر جاکر چائے پیتے اور سموسے کھاتے ہیں۔ وہ اپنے میزبانوں کو، اگر انھیں لندن، نیویارک، پیرس، ڈنمارک یا ٹمبکٹو جانے کا اتفاق ہو، اپنے ہاں آنے کی دعوت دیتے ہیں اور بین الاقوامی رشتے مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جاتے ہیں۔

آہ! لاہور کے عجائبات۔ شالامار باغ، عظیم قلعے اور پرانی مسجدیں، ہر سیاح یہاں تصویریں لیتا ہے۔ کچھ باہمت لوگ دریائے راوی پر چلے جاتے ہیں اور پاکستان کے ڈرائنگ روم، ہر سورج ڈھلنے کے نظارے سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ کچھ فلم اسٹوڈیو چلے جاتے ہیں اور اردو اور انگریزی میں بنتی ہوئی فلمیں دیکھتے ہیں کیونکہ اپنے ملک میں تو عموماً انھیں یہ موقعہ ملتا نہیں۔ لاہور میں انھیں بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے وہ فلیٹیز یا پارک لگژری میں ٹھہرتے ہیں مشرقی مصنوعات کی دکانوں پہ جاتے ہیں اور وہ چیزیں دیکھتے ہیں جو انھیں کراچی میں نظر نہیں آتیں۔ وہ خوش قسمت لوگ جو فروری میں یہاں آتے ہیں مشہور گھوڑوں کی نمائش دیکھتے ہیں جہاں بڑے بڑے لوگ موجود ہوتے ہیں "گھر کے لوگ یہ تمام باتیں سن کر کتنے متعجب ہوں گے"۔ پھر پنڈی بس کے ذریعے راولپنڈی اور ٹیکسلا کی طرف جہاں آثار قدیمہ کے خزانے موجود ہیں۔ راستہ میں وہ نئے دوست بناتے ہیں اور ایک بار پھر ان کے دل میں مختلف سوال اٹھتے ہیں۔

"عورتیں کام کرتی ہیں یا گھروں میں رہتی ہیں؟ کیا یہاں ہر کام بجلی اور بٹن دبانے کے ذریعے ہوتا ہے؟ کیا یہ سچ ہے کہ یہاں کچھ ایسی ہیں جو امیر نہیں ہیں؟ اور ایسے ہی بے شمار سوالات، چائے خانوں پر، جو بے شمار ہیں، سیاحوں کو چائے کے پیسے

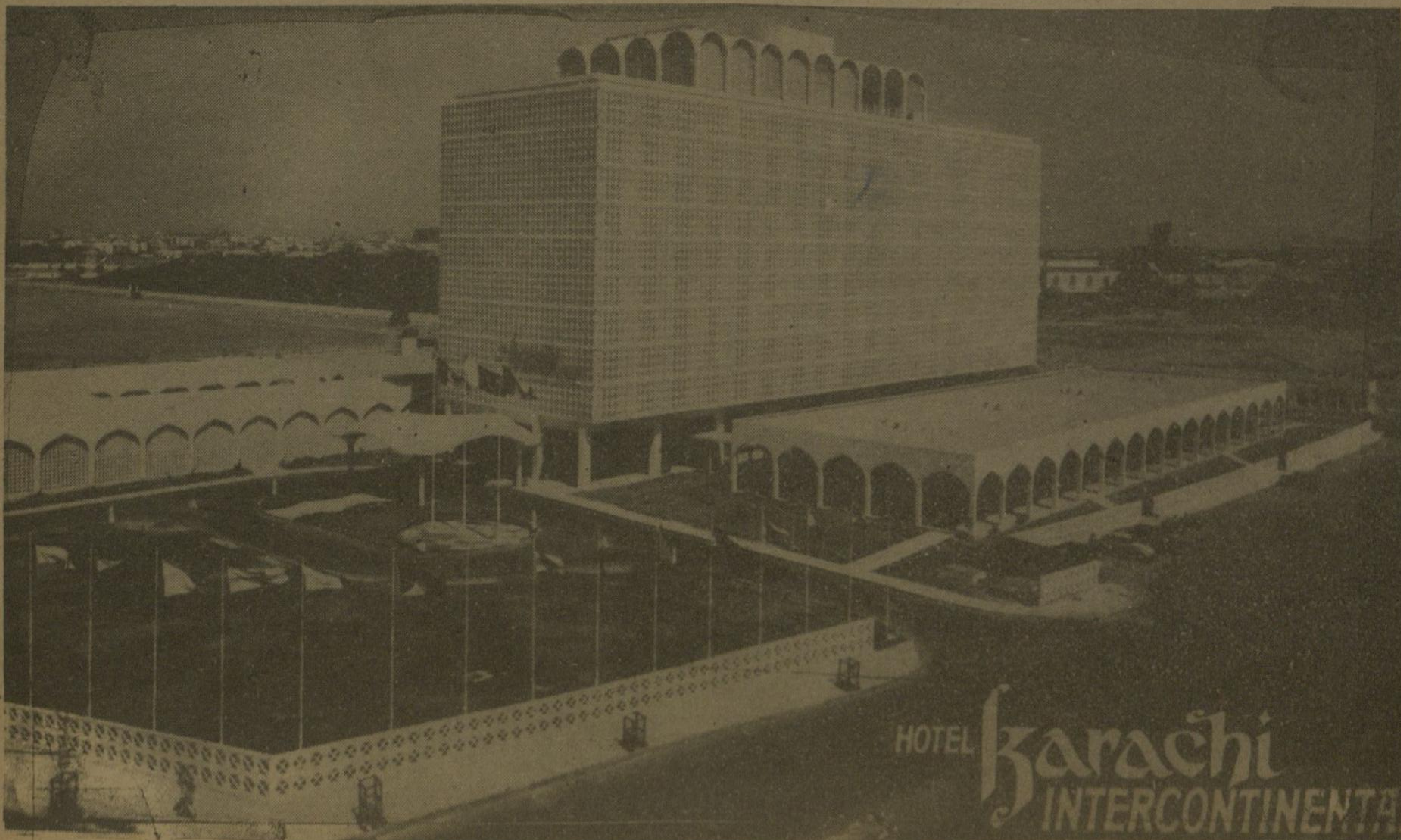
دینے کی اجازت بھی نہیں دی جاتی۔ بہت سے پاکستانی اصرار کرتے ہیں "آپ ہمارے معزز مہمان ہیں آپ کو ہمارے ساتھ بیٹھ کر کھانا پینا چاہیئے"۔ پھر سوالات ہوتے ہیں جو اکثر سیاسی نوعیت کے ہوتے ہیں اور پھر موضوع بدل جاتا ہے۔ سیاح انھیں بتاتے ہیں کہ وہ کتنے عرصہ سے خیبر پاس دیکھنے کا خواب دیکھ رہے تھے جہاں تاریخ بنی اور سوات جو سوئٹزرلینڈ کی طرح ہے۔ ہم سفر انھیں ان جگہوں کے بارے میں بتاتے ہیں اور ان کا اشتیاق بڑھتا جاتا ہے۔

پشاور میں ٹورسٹ بیورو سے انھیں تمام معلومات حاصل ہوجاتی ہیں آخرکار وہ خیبر پاس پہنچ جاتے ہیں۔ جن راستوں پہ سکندر اعظم نے سفر کیا اب وہ ان پر چل رہے ہیں وہ قبائلی پٹھانوں سے ملنے کے لئے رکتے ہیں، ان کی بندوقوں اور بچوں کی تعریف کرتے ہیں اور انھیں بتاتے ہیں کہ عظیم خیبر آ کر وہ کتنے خوش ہیں۔

آخری مقام سوات، ہمالیہ کے علاقہ یا مشرقی پاکستان ہو سکتا ہے پھر انھیں پڑھی ہوئی باتیں یاد آتی ہیں کہ والئ سوات روز اپنے دفتر میں دربار عام منعقد کرتا ہے۔ ملاقات کا وقت لیئے بغیر وہ اندر داخل ہو جاتے ہیں۔ والی اپنی میزبانی کے لئے مشہور ہے۔ اور وہ اس بات کا ذرا برا نہیں مناتا، والی چائے منگاتا ہے اور اپنے لڑکے ولی عہد اورنگ زیب کو بلاتا ہے اور سیاحوں سے پوچھتا ہے کہ پاکستان انھیں کیسا لگا وہ دیر تک مختلف موضوعات پر باتیں کرتے رہتے ہیں۔ مہمان یہ سوچ کر خوش ہو جاتے ہیں کہ اپنے ملک میں وہ مسٹر اور مسز شلٹز، اسمتھ، جونز یا سہنیکنز، دوستانہ ممالک کے عام شہری ہو سکتے ہیں لیکن اس وقت وہ ایسے آدمی سے باتیں کر رہے ہیں جو شاہی خاندان سے ہے۔ گو مسٹر اور مسز "ٹورسٹ" کو عموماً پاکستان کے صدر

سے ملنے کا موقعہ نہیں ملتا لیکن سفر کے دوران وہ بے شمار لوگوں سے ملتے ہیں اور انھیں بہت کچھ معلوم ہو جاتا ہے۔

اپنے ملک جاتے ہوئے بادلِ نخواستہ وہ کراچی لوٹتے ہیں۔ ہر شخص ایک ہی بات سوچ رہا ہے .... " اگر زیادہ سے زیادہ لوگ سفر کرنے لگیں اور غیر ضروری تنقید کے بغیر لوگوں کو ایسے ہی رہنے دیں جیسے یہ رہتے آئے ہیں تو دنیا میں کتنا امن ہو" عزیز سیاحو' یہی اصل چیز ہے۔ پاکستانی آپ سے محبت کرتے ہیں، آپ کی آمد کے خواہشمند ہیں اور ترقی کے لئے آپ کی کوششوں کو سراہتے ہیں۔ وہ آپ کو باہمت اور ذہین سمجھتے ہیں۔ وہ محبت سے آپ کا پیچھا کرتے ہیں اور اپنی معلومات، دکھ، درد اور خوشیوں میں آپ کو شریک کرنے کو تیار رہیں۔


HOTEL Karachi INTERCONTINENTAL

کراچی ہر ایک کے لئے

کراچی :- پاکستان کا سب سے بڑا شہر - ہر کنڈوں کی طرح دن بہ دن گنجان ہوتا اور پھیلتا جا رہا ہے۔ صنعتی، تجارتی اور ثقافتی ہر پہلو سے ترقی پذیر ہے۔ لیکن اس تیز رفتاری میں بھی کراچی کی فضا نرم دلی اور ہمدردی ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً دوسرے اضلاع کے لیے گشتی کتب خانے یہاں سے جاتے ہیں۔ دفتروں کے وہ ملازم جو سائیکلوں پر بے شمار ٹفن کیریر اٹھائے دوپہر کا کھانا پہنچاتے ہیں۔ گرم گرم اور لذیذ کھانا — کوٹھیوں سے اور جھونپڑیوں سے بھی - یہیں یہ نظارہ بھی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی بارات کو راستہ دینے کے لیے ٹریفک خود بخود رک جاتی ہے۔ اور کراچی کا جدید ترین ہوائی مستقر — جو ایشیا میں سب سے اہم ہے. وسعت اور بوقلمونی کا حامل — ایک جیٹ طیارہ سے کچھ دور گدھا گاڑیاں آرام کر رہی ہوتی ہیں اور ان کے مالک ہوا میں اڑتی سفید قمیص اور کھلی سفید شلوار کے ساتھ ان پر سوار - کسی خاص سامان کے منتظر ہوتے ہیں - کیونکہ مسافر زیادہ تر لندن، پیرس اور نیویارک کے کپڑوں میں سوار نہایت ہلکے پھلکے نکلتے ہیں - یہ ہے کراچی — ہر جگہ ایک تضاد — انبساط فرحت کی کیفیت — ساری سردیاں دھوپ چمکتی ہے۔ اور گرمیوں میں خنک سمندری ہوا چلتی ہے — یہ ہے کراچی درخشندہ سے بھی کہیں زیادہ - کیونکہ اس کے باشندے اسے یہی بنانا چاہتے ہیں۔

دوسرے ملکوں سے آنے والوں کے لئے پاکستانیوں میں بڑی محبت پائی جاتی ہے۔ عموماً اس محبت کا اظہار اگرچہ نہیں ملتا، لیکن کراچی کے شہری اس جذبے کا اظہار خوب کرتے ہیں۔ غیر ملکی کسی بھی قوم سے ہو، اس جذبے کی شدّت کا یہ عالم ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اپنے وطن میں ہی محسوس کرتا ہے — چند برس گزرے مجھے ہونو لولو، اور ہوائی جانے کا اتفاق ہُوا، وہاں جولائی میں کسی ہوٹل میں پہلے سے کمرہ محفوظ کروائے بغیر رہنا اتنا ہی مشکل تھا، جس طرح لاہور میں مارچ کے سالانہ ہارس شو کے وقت سخت دشواری ہوتی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ میں ایک خاتون منیجر سے کہہ رہی تھی کہ چونکہ ہمارا جہاز (بحری) تاخیر سے آیا، اس لئے میں اسے اپنی آمد کی بروقت اطلاع نہ دے سکی۔ نہایت ہی مدھم آواز میں مَیں بڑبڑائی (جیسے مجھے کچھ کہتے ڈر لگتا تھا —— اور مجھے اس پر سخت شرم آرہی ہو) کہ میں دور کراچی سے آسٹریلیا کے راستے آئی ہوں۔ اس لئے مجھے اپنی آمد کی صحیح اطلاع دینا مشکل تھی — میرے الفاظ کا اثر بڑا تعجب انگیز ہُوا۔ اگر مَیں نے یہ کہا ہوتا کہ مَیں وینس سیارے کی رہنے والی ہوں تو بھی تعجب اس سے زیادہ نہ ہوتا —— "کراچی" — اس نے تعجب سے کہا۔ "آپ کراچی سے آرہی ہیں، پاکستان کا کراچی —— ! یہ واقعی خاص بات ہے، ہم آپ کے لئے کمرہ ابھی تلاش کرتے ہیں۔" اور اس نے واقعی ایک کمرہ — خوبصورت اور معقول نرخوں پر — تلاش کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر میں نے دہلی، بمبئی یا ٹوکیو کہا ہوتا تو وہ اثر نہ ہوتا جو کراچی کے نام سے ہُوا۔ پھر الاسکا میں بھی یہی بات ہوئی۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میرے کراچی میں رہنے سے ہی یہ حیران کن واقعات رونما ہوئے۔

کراچی میں تو ایسے عجیب و غریب واقعات قریباً روزانہ ہوتے رہتے ہیں۔ اور یہ ایک مسلّمہ امر ہے۔ بعض اوقات یہ علی بابا کی کہانیوں کا حصّہ معلوم ہوتے ہیں۔ موٹر گاڑیوں کے

بہتے دریاؤں کے ساتھ ساتھ اونٹ بھی غلّے سے لدے چھکڑے بڑے ناز سے کھینچ رہے ہوتے ہیں۔ انہی جانوروں میں سے ایک اپنے مالک بشیر کے لئے خوش بختی اور شہرت کا باعث بن گیا...... ایک آدمی کی مرضی ہے کہ وہ کسی شیشوں سے لپٹی بار بر شاپ سے شیو کرائے یا سڑک کے کنارے کھلی ہوا میں بیٹھ جائے...... میکلوڈ روڈ یا بریڈی سٹریٹ کے اردگرد کہیں بیٹھ جائے، خطوط نویس آپ کے مکمّل خط لکھ دیتے ہیں (ان میں محبّت کے خطوط بھی شامل ہیں)...... سڑک کنارے بیٹھے درزی اور موچی آپ کو اسی وقت سی بھی دیتے ہیں اور مرمّت بھی کر دیتے ہیں ـــــــ کہیں سانپ سپیرے کی بین سے مست ہو کر جھوم رہے ہوتے ہیں ـــــــ اور نیچے کلفٹن کے ساحل پر آپ ایک اونٹ پر بیٹھ کر بحیرۂ عرب کے کنارے خوب لُطف اُٹھا سکتے ہیں۔

سر سے پاؤں تک برقع میں لپٹی ہوئی باپردہ خواتین آپ کے پاس سے گزرتی ہیں۔ ساڑھی میں یا شلوار قمیص میں ملبوس عورتیں اس خطۂ ارض پر لباس کے مشرقی طرز کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ یہ ان بے شمار امتیازات میں سے چند ہیں، جنہیں مغربی آنکھیں دیکھتی ہیں۔ اس سے بیشتر کہ آپ سب کچھ دیکھ سکیں اور لُطف اُٹھا سکیں ــــ عربی النسل گھوڑے پر سوار صدر کے باڈی گارڈ گھوڑے کو دوڑاتے آجائیں گے۔ ان کی سُرخ اور سنہری یونیفارم دُھوپ میں خوب چمکتی ہے ــــ جب یہ دستہ گزر جائے، تو آپ کے پاس کوئی سندھی نجومی پہنچ جائے گا، جو آپ کو روشن مستقبل کی نوید دے گا۔ اس کی ہتھیلی پر کوئی سکّہ رکھ دیں۔ نہیں! معاف کیجئے ایک یا دو روپیہ۔ اور سارا دن یہ مناظر، یہ لُطف اور یہ دوستی کے تماشے ہی دیکھنے میں آتے رہتے ہیں۔ کراچی کے لوگ دنیا کے سب سے پیارے لوگوں میں سے ہیں۔ کراچی کے اصل مکیں چست، جسیم اور طویل القامت ہیں۔ وہ اب بھی شہر کے پرانے حصّوں رنچھوڑ لائن،

کھارادر، میٹھادر، لیاری، صدر میں رہتے ہیں۔ ان کی طرزِ زندگی قدیم ہے۔ جدید شہر میں ہونے والے بیسویں صدی کے تیز رفتار تغیرات نے ان میں کوئی فرق نہیں ڈالا۔ کراچی پاکستان کا صنعتی اور تجارتی حصّہ ہے۔ اہم ترین غیر ملکی اور مقامی تاجروں کے دفاتر شہر کے عین درمیان میں ہیں، جن کے ملازمین مختلف طبقوں اور نسلوں سے متعلق ہیں۔ چند برس پہلے تک کراچی ملک کا دارالحکومت تھا ـــ اس لئے یہاں بے شمار ڈپلومیٹ رہائش پذیر تھے۔ نئے دارالحکومت اسلام آباد کے مکمل ہونے تک ان میں سے اکثر یہیں مقیم ہیں۔ تقسیم کے بعد بھارت سے آنے والے ہزاروں مہاجرین کو کراچی میں روشن مستقبل نظر آیا اس لئے اُنھوں نے یہاں پناہ لے لی۔ اس طرح ملک کے دوسرے کئی علاقوں کے باشندے یہاں تجارت کی ریل پیل دیکھ کر کھنچے چلے آئے اور یوں کراچی کی آبادی ۲۰ لاکھ سے بھی تجاوز کر گئی۔ باہر سے آنے والے اتنے زیادہ ہیں کہ یہاں کے اصل مکیں اب اقلیت بن گئے ہیں۔

ان باتوں نے کراچی کو ایک بین الاقوامی فضا بخش دی ہے جو پاکستان میں اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ اس مسلم آبادی میں خوبصورت کھلتے قد والے پٹھان اور شمال مغربی سرحد کے بلوچی، مشرقی بازو کے سانولے بنگالی، قابلِ فخر پنجابی، سندھی، میمن، آغا خان کے پیرو بوہرے اور خوجے جو سب کے سب مسلم ہیں، وہ بدھ مت، جین مت کے پیروکاروں، پارسیوں ہندوؤں، گوا، یورپ اور امریکہ کے مسیحیوں کے ساتھ شانہ بشانہ چلتے ہیں۔ ہر ایک نے زندگی کا ایک ایسا اسلوب اختیار کر لیا ہے۔ جہاں کسی امتیاز کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر شخص اس خطۂ ارضی کی نعمتوں کے ساتھ اپنے اپنے عقائد پر عمل کرتا ہے۔

کراچی کا ایک اور منفرد اور کثیر التعداد طبقہ وہ مچھیرے ہیں جو کیماڑی بندرگاہ،

بابا بھٹ اور منوڑہ جزیروں کے قریب رہتے ہیں۔

مچھلی بندرگاہ کے ذریعے انہیں مزید خوشحالی نصیب ہوگئی ہے۔ اس بندرگاہ کی جدید سہولتوں نے مچھلی کی فراہمی میں اضافے کے ساتھ ساتھ انکی آمدنی میں بھی اضافہ کیا ہے۔ ۵۴۰۰ فٹ چوڑے بحری راستے کے عین سامنے خاصی طویل خشک زمین ہے جہاں مچھلیوں کو دھونے، تولنے اور نیلام کرنے کے لئے لایا جاتا ہے، بہت بڑے شکاروں کو محفوظ رکھنے کے لئے سرد خانوں کے پلانٹ بھی موجود ہیں۔ خشک مچھلیوں اور جھینگوں کے لئے لیبارٹریاں بھی بنائی گئی ہیں۔ کیونکہ خشک مچھلی اور جھینگے بکثرت برآمد کئے جاتے ہیں۔ بحری سائنسدان بندرگاہ کے جدید میرین فشریز ریسرچ سٹیشن میں روزانہ کام کرتے ہیں۔ اس تحقیقاتی مرکز کا اپنا عجائب گھر اور لائبریری ہے۔ جہاں آنے والے ایک ایسی دُنیا میں داخل ہو جاتے ہیں، جو گہرائیوں کے بھیدوں کے لئے وقف ہے۔

کراچی کے ماہی گیروں کو پہلے اتنا اچھّا زمانہ نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ وہ نہیں ہیں جو ان کے آباؤ اجداد ہوا کرتے تھے۔ اب وہ سمندر میں اپنا پرانا کانٹا ڈال کر جانوروں کے رحم وکرم پر نہیں بیٹھے رہتے۔ ان کے آلات بھی مشینی دَور میں داخل ہو گئے ہیں۔ اب وہ مکران کے ساحل سے دُور دُور تک چلے جاتے ہیں۔ گہرے سمندر میں ماہی گیری بازار میں ان کی فروخت میں بے پناہ اضافہ کرتی ہے۔ اس نئی بندرگاہ نے ان کی زندگی پر بڑا نمایاں اثر ڈالا ہے۔

سویز سے سنگاپور تک کوئی جگہ بھی یہاں کے حسن اور فائدے کا مقابلہ نہیں کر سکتی معاون ہاتھ سمندر پر کا نشان امریکی امداد کا صحیح مفہوم ادا کرتا ہے۔ پاکستانی تعاون کے ساتھ جس سے زرِ مبادلہ کی کثیر تعداد حاصل ہوئی ہے۔ اور ایسی صنعت کو فروغ دیا ہے جس

نے ایشیا میں مچھلی کی سب سے ترقی بخش تجارت کو سائنسی استحصال بخشا ہے۔

یہ تمام کارخانے پاکستان کی ملکیت ہیں۔ پاکستان پہلا اور واحد ملک ہے جس میں مچھلیوں اور جھینگوں کو برآمد کرنے کے لئے پیکنگ اور پروسیسنگ کے لیے جدید ترین مشینری کے کارخانے قائم ہیں۔ اسے ایس۔ ایس۔ ماہیا کہتے ہیں۔ اس کا آغاز تین چار برس پہلے ہی ہوا ہے۔ ماہیا مچھلی کو صنعت بنانے کا ایک بیرایہ آغاز ہے۔ یہاں ہر چیز خود کار ہے۔ لندن کی لائڈز نے اس کا بیمہ کیا ہے۔ نیوا ورلینز کے اور امریکی ٹیکنیکل ماہرین کافی عرصہ یہاں ٹھہرے رہے۔ پھر انہوں نے یہ کارخانہ تربیت یافتہ پاکستانی ماہرین کی پوری تحویل میں دے دیا۔

پاکستان کے سب سے بڑے شہر کے لئے یہ بڑی تعجب انگیز مہم ہے۔ سیّاح جب یہاں دھوپ میں چمکتے پانیوں کے ساتھ بندرگاہ کے گرد گھومتا ہے، اور وہ ان مچھیروں کو اپنے مخصوص انداز میں دیکھتا ہے تو اسے بہت لطف آتا ہے۔ کراچی کے ماہی گیر اپنے مخصوص دلکش لباس شلوار قمیص میں ملبوس ہوتے ہیں۔ ایک نفع بخش صبح کی دکانداری سے فارغ ہو کر دوپہر سے پہلے گھر جاتے ہوئے ان کے چہرے تمتما رہے ہوتے ہیں، جیبوں میں سکّے کھنکھتے ہیں۔ دل میں یہ خیال ہوتا ہے۔ بال بچّوں کے لئے آج کا کھانا بھی مل گیا۔ اور انشاء اللہ کل بھی ـــ اور منتخب ذریعہ معاش کے طفیل ہر روز ہی کھانے کو مل جائے گا ـــ اسی ذریعۂ معاش سے جو ان کے آباؤ اجداد سے وابستہ ہے لیکن اب اس قدیم زمانے کی بے شمار دقتوں سے بھی نجات مل گئی ہے۔ ان میں سے کئی ایک سہ پہر کو کشتی رانی کرتے ہیں۔ مسافروں کو قریبی جزیروں اور ساحلوں پر لے جاتے ہیں۔ اور چند ایک روپے مزید کما لیتے ہیں۔ مناظر کے دلدادہ لوگوں کو وہ نظارے دیکھنے کا موقع دیتے ہیں جو ان کے محبوب شہر نے اس گرم اور نیلگوں سمندر کے ساحلوں پر ان کے لئے سجا رکھے ہیں۔

کراچی کی تاریخ اس کے لوگوں کی طرح رنگین ہے۔ قدیم مورخین اس بات کے قائل تھے کہ کراچی وہ بندرگاہ ہے جسے ایک سیاح نیرسش نے ۳۲۵ ق م میں سندھ سے زیریں علاقے کی طرف جاتے ہوئے "جنتِ سکندریا" کا نام دیا تھا۔ سمندری جہازوں کے لئے ناموزوں پاٹ جانے کے باعث یہ مچھیروں کا گاؤں ـــــ کراچی بن گیا۔ یہ اس قدر خوبصورت تھا کہ مسافر اسے ریگستانِ سندھ میں OASIS کے نام سے پکارتے تھے۔ کلہوڑوں نے بھی اس پر حکومت کی۔ اگرچہ پہلی مرتبہ تالپور فتح علی خان نے کراچی فتح کرنے کو جو چند ایک مہمات بھیجی تھیں وہ ناکام رہی تھیں۔ ایک اور حملہ خان آف قلات نے کیا تھا۔ جس نے بعد میں تالپوروں سے شکست کھائی۔ سندھ کے سر چارلس نیپئر نے اپنے ۲۰۰۰ سپاہیوں کے ساتھ اور بغیر کسی کشت و خون کے کراچی کو فتح کر لیا۔ اور یوں ۱۰ فروری ۱۸۴۳ء کو کراچی برطانیہ کے زیرِ اثر چلا گیا۔

اس کے بعد نیپئر کو حیدر آباد سندھ کا گورنر اور افواج کا کمانڈر مقرر کیا گیا۔ نیپئر نے صدر مقام حیدر آباد کی بجائے کراچی میں منتقل کر لیا۔ اس نے اپنی ذہانت اور پیش بینی سے یہ دیکھ لیا کہ کراچی ایک دن عظیم شہر بن جائے گا۔ اس نے کراچی کی عظمت کو اپنے ان مشہور الفاظ میں قلمبند کیا ـــ تو ایک روز مشرق کی شوکت و عظمت ہو جائے گا۔

کاش میں تجھے دوبارہ دیکھ سکوں۔

اے کراچی ـــــ تیری عظمت و شکوہ کے دنوں میں،

اس انگریز گورنر نے یہاں بڑی تیزی سے تعمیر و ترقی کے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا اور کراچی کو ایک بہت بڑا فوجی مرکز بنا دیا۔ اس نے سپاہیوں کے رہنے کے لئے نیپئر بیرکس بنوائیں۔ ہسپتال اور سینی ٹوریم تعمیر کروائے ـــــ منوڑا کی بندرگاہ اور روشنی گھر اس نے بنوائے تھے۔ پولیس کا نظام بھی اس نے رائج کیا۔ مارسٹن ہاؤس اور مارسٹن روڈ کراچی میں

اب بھی لفٹیننٹ مارسٹن کی یاد دلاتی ہیں جو نیپئر کی فوج میں پہلا کپتان تھا۔ پھر اس نے دوپہر کے بارہ بجے توپوں سے گولے چلانے کا ایک دانشمندانہ اہتمام کیا۔ جس سے شہر کے ہر شخص کو صحیح وقت کا علم ہو جاتا اور لوگ اپنے اپنے کلاک بارہ پر کر لیتے۔ موجودہ گاندھی گارڈن کا منصوبہ بھی اسی نے بنایا تھا۔ سر چارلس نے ۱۰ اراگست ۱۸۴۷ء کو استعفیٰ دیا اور دو مہینے بعد کراچی سے چلے گئے۔ کراچی پھر صوبہ بمبئی کا حصہ بن گیا اور سیکنڈ کمشنر سر بارٹل فریئر نے نیپئر کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کرنا چاہا۔ کراچی اور کوٹری کے درمیان اس نے پہلی ریلوے لائن شروع کروائی۔ ڈاک کا نظام، پکی سڑکیں، پل، ڈاک بنگلے اور کچہریاں فریئر نے ہی بنوائی تھیں۔ اپنے وقت میں اس نے جو "شہری تنظیم" قائم کی، میونسپل کارپوریشن اس کی ترقی یافتہ شکل ہے۔ دلکش فریئر ہال (کراچی کا مشہور عجائب گھر) اور خوبصورت فریئر ہال گارڈن کی بنیادیں بھی اسی نے رکھی تھیں اور یہ آج بھی اس کے نام پر ہی قائم ہیں۔

ان دنوں برطانوی لوگوں کا پسندیدہ مشروب "چائے" تھا اور مسلمان لسّی پیتے تھے۔ جلد ہی چائے پینے کی عادت سارے ملک میں پھیل گئی۔ مسلمان بھی اس سے خوب لطف اندوز ہوتے تھے۔ اور اب اگرچہ انگریز مدّت ہوئی، جا چکے ہیں لیکن چائے پینے کی عادت انگریز کی دوسرے طور طریقوں کی یاد بھی دلاتی رہتی ہے۔ کراچی کے لوگ اسے دل سے پیتے ہیں —— اور لسّی فراموش ہو چکی ہے۔

تقسیم کا زمانہ کسے یاد نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں (جو اس وقت سب ہندوستانی سمجھے جاتے تھے) میں اختلافات کے باعث یہ مرحلہ درپیش آیا۔ دونوں کے تمدّن اور معاشرتی نظام مختلف اور باہم متصادم تھے۔ برّصغیر میں ایک الگ مسلم مملکت کی تجویز معروف شاعر اقبالؔ نے پیش کی تھی اور قائداعظم محمد علی جناح اسے معرضِ وجود میں لائے تھے۔ پاکستان کے حصول کے



مسز کینیڈی، بشیر شتربان کے اونٹ کی سواری سے لُطف اندوز ہو رہی ہیں

لئے اس عظیم قائد کو بے شمار مراحل اور دقتوں سے گزرنا پڑا۔ اور آخر کار انھوں نے اپنے مسلمان بھائیوں کے لئے آزادی حاصل کر ہی لی۔

۱۴ر اگست ۱۹۴۷ء کو قائد اعظم کا خواب ایک حقیقت بن گیا اور ان کی قیادت میں پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ پندرہ اگست کو قائد اعظم نے دارالحکومت کے لئے کراچی کو منتخب کیا اور یوں یہ مرکزی حکومت کا صدر مقام بن گیا۔ پیرایۂ آغاز کے طور پر پاکستان کا نام منتخب کیا گیا، جس کا مطلب ہے "پاک لوگوں کی زمین"——— یہ آغاز تھا ایک نومولود بچے کی زندگی کا آغاز تھا ——— اگرچہ مسرت بے اندازہ تھی لیکن بھارت سے ہزاروں مہاجرین اس حقیقی مسلم مملکت میں نئی زندگی اختیار کرنے کے لئے آرہے تھے۔ یہ مناظر جہاں دلدوز تھے وہاں یہ مفلسی اور غربت میں اضافے کا سبب بھی تھے۔ بے شمار لوگ گلیوں میں رات بسر کرتے اور سرکاری دفاتر برائے نام تھے ——— عارضی طور پر سرکاری ملازمین کے لئے بعض مکانات لے لئے گئے تھے۔ اور دفتری سہولتوں کی قلت اس قدر تھی کہ ایک دفتر میں ایک کاغذ اور لفافہ بھی قیمتی چیز بن گیا تھا ——— لیکن ایک نوخیز پاکستانی کے لئے خود مختار آزادی کا حصول ہی ان سب سے بڑھ کر تھا۔

کراچی کو قائد اعظم کی جائے پیدائش ہونے کا شرف بھی حاصل ہے۔ انھوں نے ۲۵ر دسمبر ۱۸۷۶ء کو وزیر مینشن میں آنکھ کھولی۔ جو اب ایک قومی یادگار کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ کراچی نے آزادی کے ایک برس بعد ہی قائد کی اچانک اور جلد موت کے غم اندوہ کو برداشت کیا، اور اپنی زندگی کو رواں دواں رکھا۔

کراچی نے مشقتوں، سیاسی سازشوں، ناانصافیوں اور دفتری بددیانتیوں کو بھی برداشت کیا اور اپنی زندگی کو رواں دواں رکھا۔

کراچی اس وقت اور چمکا جب ۱۹۵۸ء میں فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کا دور شروع ہوا اور اپنے آپ کو سربلند رکھا۔

کراچی نے اس وقت بھی کوئی شور و غوغا نہ کیا جب ۱۹۵۹ء میں اس سے دارالحکومت کا شرف ایک ہزار میل دُور راولپنڈی میں منتقل کر دیا گیا جو عبوری دارالحکومت بنا۔

کراچی اس آزمائش میں بھی زندہ رہا اور پہلے سے زیادہ فراخ دل اور وسیع بن گیا۔

کراچی کے لئے اور بھی بہت چیزیں سوچنے کی تھیں۔ کورنگی کی نئی آبادی میں تیس ہزار نئے گھر تعمیر کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ جہاں بے شمار مہاجرین منتقل ہو گئے۔ اس بستی کی تعمیر کے لئے معروف یونانی ماہرین تعمیر ڈوکسیاڈز ایسوسی ایٹس دُنیا بھر کے ماہرین میں سے منتخب کئے گئے۔ اور انہوں نے ۱۹۵۹ء میں چھ ماہ کے مختصر عرصے میں زمین کے سینے پر تیس ہزار گھر بلند کر دیئے۔ کم آمدنی کے طبقے کی رہائشی سہولتوں کے لئے ۱۹۶۲ء میں نئے کراچی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا اور اسی سال اسے مکمل بھی کر لیا گیا۔ مجھے اس بستی کی تاثر انگیز افتتاحی تقریب کبھی نہیں بھولے گی۔ یہ رسم صدرِ پاکستان نے ادا کی تھی ——— مجھے یاد ہے کہ سب سے پہلے ایک چھوٹے سے بڑھئی نے سنہری چابی حاصل کی اور وہ اپنے چھوٹے بیٹے کے ساتھ زندگی میں پہلی بار اپنے حقیقی گھر میں داخل ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور اسکے اپنے دروازے کا تالا کھولنے میں دوسرے لوگوں کو اس کی مدد کرنا پڑی۔ ایسی باتیں اور کہاں ہو سکتی ہیں کہ نو کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کے ملک کا صدر اپنی مصروف زندگی میں سے اس قدر وقت نکالے تاکہ وہ اپنے سب سے چھوٹے طبقے کے شہریوں کی مسرت اور خوش بختی میں شریک ہو سکے ——— یہ صرف کراچی میں ہی ممکن ہے۔ جھونپڑیوں، فٹ پاتھوں پر گذر اوقات کرتے ہزاروں کُنبے حکومت کے زیرِ اہتمام اسی ہفتے ان نئی رہائش گاہوں میں منتقل ہو گئے جہاں ہر ایک کا اپنا ایک صحن تھا۔

اس روز مسّرت اور خوشی کا جو عالم تھا اس کا مقابلہ کسی قومی دن کی رنگینیاں بھی نہیں کر سکتیں۔

حکومت کراچی میں ابھی مزید بستیوں کی تعمیر کا ارادہ رکھتی ہے۔

کراچی نے اپنے سیاحوں کو نہیں بھلایا ہے۔ مسافروں کی کثیر تعداد کو سمانے کے لئے جدید اور نفیس ہوٹلوں کی تعمیر جاری ہے ———

یہ کراچی ہی ہے جہاں مسافروں اور سامان کی نقل و حمل کے لئے پہلی سرکلر ریلوے شروع کی گئی ———

یہ کراچی ہی ہے جہاں بادشاہ، ملکائیں اور دوسری بہت اہم شخصیات سب سے پہلے آتی ہیں ———

یہ کراچی ہی ہے جہاں وہ سخت جاں سیّاح سب سے پہلے پہنچتے ہیں (جن کی تواضع بھی اہم شخصیات کی طرح ہی کی جاتی ہے)

اور یہ بھی کراچی ہی ہے جہاں سیاحوں کو وہ تفریح اور سرخوشی ملتی ہے جس میں بیسویں صدی کی آسائشیں بھی شامل ہیں اور الف لیلوی دور کا سحر بھی ———

پہلے ہوٹلوں کو لے لیجئے۔ مختلف گاہکوں کے لئے مختلف سامانِ خورد و نوش موجود ہے۔

میٹروپول کراچی کا سب سے بڑا ہوٹل ہے ——— اس میں پانچ سو مہمانوں کے لئے خوبصورت اور ایئرکنڈیشنڈ کمرے ہیں۔ میٹروپول کی اپنی ایک دُنیا ہے جہاں باغات میں ڈاکخانہ ہے اور بے شمار دکانیں اور دفاتر ہیں ——— ایک ایسی دُنیا ہے جہاں لندن اور نیویارک کے مہمان سڈنی اور پانامہ سے آنے والوں سے ملتے ہیں ——— اطمینان، شان و شوکت، آرام اور سرخوشی کی دُنیا ——— میٹروپول کے بیرے، گھنٹی سننے والے لڑکے، ——— اور دربان سب خدمت کے لئے ہر وقت تیار رہتے ہیں۔



کلفٹن کا ایک منظر | کلفٹن اُونٹ کی سواری



اگر تفریح کی تلاش ہو تو یہاں بنکیوئٹ ہال ہیں، رقص گاہیں ہیں۔ جہاں ایسے ایسے فنکار ہیں جن کے جذبات انگیز مظاہروں سے گرمیوں کی شامیں اور چمک رکھتی ہیں۔ کھلے GRILLRON اور بھری پری بار میں خدمت کے علیحدہ اخراجات نہیں لئے جاتے۔ دوسری منزل پر ایسی دُنیا ہے جہاں ہر قدم سکون چھایا ہوا ہے۔ کمروں میں بستر بچھے ہیں، سفید رنگ کی چادریں چمکتی ہیں۔ اور ہر وقت خدمت گار تیار ملتے ہیں۔

میٹروپول کے مہمان خوش قسمت ہیں۔ اب یہاں باغیچوں کے اوپر ایک نیا (TAVERN) ہے۔ جسے 'چکن ان' (چوزوں کی سرائے) کہا جاتا ہے — ذرا تصور کیجئے کہ کراچی میں ایک ایسی جگہ، جہاں آپ چوزے ایسی لذیذ چیز کھا سکتے ہیں۔ یہاں نہ صرف ہر قسم کے چوزے میسر ہوتے ہیں بلکہ چوزوں کے تکے بھی۔ ان چوزوں کو ہم انسانوں سے زیادہ عمدہ اور خالص غذا ملتی رہی ہے۔ ان کی پرورش اور دیکھ بھال بڑے آرام دہ ماحول میں ہوئی اپنے چھوٹے چھوٹے دلوں میں یہ احساس انہیں بھی ہوتا ہوگا کہ وہ کوئی خاص چیز ہیں کیونکہ انھیں رہنے کو مخصوص شاہانہ ماحول ملتا رہا ہے۔

بڑی بڑی تمام ہوائی کمپنیوں کے دفاتر میٹروپول میں ہیں۔ پین امریکن ائرویز کو باغ کا ایک نمایاں گوشہ میسر ہے۔ اس دفتر سے اگلے کمرے میں ایک چھوٹا سا لیکن صاف ستھرا دارالمطالعہ ہے۔ مہمان ہر وقت آسکتے ہیں۔ سکینڈے نیوین ائر لائنز کا خوبصورت دفتر بھی باغ میں ہی ہے۔ بی۔ او۔ اے۔ سی کی ایک شاخ بھی یہاں موجود ہے۔ ایریانا افغان ائرلائنز، ٹی۔ ڈبلیو۔ اے اور ائر انڈیا کے دفاتر بھی ساتھ ساتھ واقع ہیں۔

جرمنی کی ہوائی کمپنی لفتانسا کا دفتر تو میٹروپول کے بڑے باغ کے دروازے کے ساتھ ہے۔ انھیں اتنی کامیابی نصیب ہوئی ہے کہ اب ان کے خاصے دفاتر ایک قطار میں واقع ہیں۔ کسی

دروازے سے اندر چلے جائیے، وہ زمین کے کسی بھی کونے کے لئے آپ کی بُکنگ کر دیں گے۔

کتابستان کی کتابوں کی ایک دوکان بھی ہے۔ اس کے مہتمم ایک نہایت شریف دل انسان عباسی صاحب ہیں جو ادب، دانش اور سامانِ تصویر کشی فروخت کرتے ہیں۔ اس طلسماتی باغ میں ایک سیلون بھی ہے۔ سنیک بار بھی ہے۔ اور مرنی کی ادویات کی واحد دوکان بھی ہے (معاف کیجئے یہ کمیسٹ کی دوکان ہے) اس کے مالک ایک وجیہہ شکل پارسی ہیں اور انہوں نے آئرلینڈ کا یہ خوبصورت اور پرانا نام رکھا ہے۔ اگلے دروازے سے آپ ڈاکٹر کے دفتر میں ڈاکٹری معائنہ کے لئے چلے جائیے یا "شیرنیر گفٹ" میں داخل ہو جائیے جہاں پاکستان کی خاص چیزیں دستیاب ہیں۔ اور چیونگ گم بھی ہے۔ پاکستان ویسٹرن ریلوے کے دفتر میں سفر کے متعلق معلومات مسکراہٹوں کے ساتھ بتائی جاتی ہیں۔ میٹروپول کے باغات میں ایک ایسی جگہ بھی ہے، جو دن رات چمکتی ہے۔ یہ چمک وہ ہے جس سے پاکستانی محبت کرتے ہیں اور یہی وہ چمک ہے جس سے سیّاح بھی محبت کرتے ہیں۔ یہ کولمبو جیولرز ہیں جو رات گئے تک دوکان کھولے رہتے ہیں تاکہ رات کے کھانے کے بعد خریداری کو آنے والے مایوس نہ ہوں۔ وہ صرف چمکتے موتی نہیں فروخت کرتے ہیں، بلکہ حسن، سلطان اور بابا آفریدی مفکر دوست ہیں۔ اپنی مرضی کے مطابق خوب دیکھئے، وہ کہتے ہیں — جو چاہیئے چُن لیجئے، یہ آپ کا اپنا ہے —— چند سکّوں کے عوض۔

نورد یکس، اس ہوٹل کے اپنے ڈرائی کلینرز ہیں۔ یہاں بڑی رونق رہتی ہے۔ اگر آپ صرف ایک رات ٹھہرنا چاہتے ہیں تو خوش باش پروپرائٹر مسٹر آغا آپ کے سفر کی گرد سے بھرے کپڑوں کو آپ کے جانے سے پہلے ہی دھلوا دیں گے۔ پیاری پیاری گفتگو بھی ہو گی اور چائے کی ایک پیالی بھی ہو جائے گی۔ یونس ان کا ذاتی رفوگر ہے جو اس مہارت سے کپڑے رفو کرتا ہے کہ بالکل معلوم ہی نہیں ہوتا۔ اور آپ کا دل چاہتا ہے کہ کاش آپ کے کپڑوں میں بھی کوئی سوراخ ہوتا۔

فوٹو گرافر، گیری اور اس کی سفری ایجنسی نیشنل اینڈ گرینڈ لیز بنک سے بالکل ساتھ والے کمرے میں ہے۔ گیری سفری انتظامات کے ماہر ہیں۔ اور آپ کے لئے پاسپورٹ سائز کی تصویریں مُفت تیار کر دیتے ہیں۔ یہ بھی بڑا بارونق گوشہ ہے۔ پاسپورٹ تصویروں والا ٹریول ایجنٹ، بنک اور ال اٹیلیا ایئر لائن سب ساتھ ساتھ موجود ہیں۔ یہاں باغ میں ال اٹیلیا کا کراچی آفس اتنا بڑا نہیں ہے لیکن پارسی، مسلمان اور یورپی عملے کی دوست داری بڑی دلکش ہے۔ خواہ آپ آسٹریلیا جا رہے ہوں خواہ کاراماکی زیبن نیول میں ـــــ وہ آپ کے لئے پُوری توجّہ وقف کردیں گے۔

سوس ایر کے میٹروپول میں سب سے بڑے دفاتر ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کا ماحول آپ کے گرد و پیش رہتا ہے ـــــ جو یقیناً مُوثر بھی ہے۔

پاکستان کے بہترین جفت ساز کنگسن کی بھی میٹروپول کے باغات میں ایک دوکان ہے جہاں جوتوں کی ہاتھوں سے آرائش کی جاتی ہے۔ کراچی کے اہلِ ذوق اس چھوٹی سی کارگاہ اور شوروم میں جمع رہتے ہیں۔ کنگسن کا انتظام تین زندہ دل رشتہ داروں کے ہاتھ میں ہے۔ اگر آپ صرف ایک ہفتے کے لئے بھی آئے ہیں۔ تب بھی وہ بالکل نیا فیشن، اطالوی یا آپ کا پسندیدہ کوئی بھی ڈیزائن آپ کے جانے سے پہلے پہلے تیار کریں گے۔ اور اس کی قیمت ۵۰ روپے سے زیادہ نہ ہو گی۔

کنگسن سے صرف چند قدم کے فاصلے پر جدید ہائیڈرالک لفٹیں لگی ہوتی ہیں جو باغیچوں کے پیچھے سے سب مہمانوں کو ہر منزل تک لے جاتی ہیں۔ پہلی منزل پر کیتا بونا کا سیلون ہے جو صنفِ لطیف کے آرائشِ حُسن کے لئے وقف ہے۔ اس آرام گاہ میں خوبصورت اور دلکش ائیر ہوسٹسوں سمیت، تمام مہمان میٹروپول کی کھلی تیسری منزل پر دھوپ کا لطف اٹھاتے ہیں۔ سب سے اوپر اور پانچویں منزل پر ایک چھوٹا سا جدید جمنازیم ہے، جہاں ورزش کے عادی مہمان کسی خرچہ کے بغیر ہی آسکتے ہیں۔ میٹروپول کے پروپرائٹر مسٹر منوالا زیادہ وقت میٹروپول میں گذارتے ہیں۔ ہر شخص کو

ان کے گھر سے زیادہ آرام پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں ۔ بیرے اپنی مذہبی عبادت کے ساتھ ساتھ مہمانوں کی پوری طرح خاطر مدارت کرتے ہیں ۔ ایک مرتبہ ایک پرائیویٹ پارٹی پہ ایک بیرے کو باقی ماندہ دو مُرغ پیش کئے گئے ۔

اس نے انہیں تحسین بھری نگاہوں سے دیکھا لیکن یہ کہتے ہوئے لینے سے انکار کر دیا کہ اسلامی طریقے سے ان کی گردنیں ذبح نہیں کی گئیں اس لئے یہ ہمارے لئے ممنوعہ خوراک ہے ـــــ لیکن یہ یقین ہو جانے پہ انہیں ایک پکے مسلمان قصاب نے ذبح کیا تھا ، اس نے چوزے اُٹھا لئے ۔

میٹرو پول کے اخراجات یورپی ہوٹلوں اتنے ہی ہیں ۔ یہ ۴۸ روپے فی بستر ، صبح کی چائے اور ایک اچھے خاصے ناشتے سے شروع ہوتے ہیں ۔ ائر کنڈیشننگ کے بغیر کمروں کے دس روپے روزانہ کم ہیں ۔ انتظامات بڑے معقول ہیں ۔

میٹرو پول سے باہر ٹیکسیاں قطاروں میں کھڑی آپ کی منتظر رہتی ہیں ۔ اس سٹینڈ کا غیر سرکاری سربراہ " بادشاہ " ہے جو کراچی کے نئے پرانے حصے میں کسی بھی جگہ جانے کے لئے تیار رہتا ہے ۔ اگر سفر لمبا ہو تو تمام اچھے مسلمانوں کی طرح وہ نماز کے وقت گاڑی روک کر نماز ادا کرتا ہے ۔

میٹرو پول کے بالکل ساتھ ہی پیلس سینما ہے جہاں تازہ ترین فلمیں دکھائی جاتی ہیں ۔ اور اس سے آگے مڈل ایسٹ ایرلائنز کے دفاتر ہیں ۔ ان کی کتنی خوش قسمتی ہے کہ وہ شہر کے عین درمیان میں ہوتے ہوئے ان کے سامنے ایک چھوٹا سا باغ اور رو رویہ دلکش درختوں سے آراستہ گلی ہے ـــــ ایم ۔ ای ۔ اے لبنان کی ایک محبوب کمپنی ہے ۔ جس کے طیّارے بمبئی سے کراچی ہوتے ہوئے بیروت جاتے ہیں ـــــ اور پھر لندن کے شہر کی طرف ۔ راستے میں وہ ہر شخص کی مرضی کے مطابق قیام کرتے ہیں ۔ ان کے طیّارے میں سفر سے عالمِ عرب کی مسرّتوں کا صحیح لطف ملتا ہے ۔

ایک اور جدید ہوٹل بیچ لگژری ـــــ بحیرہ عرب کے ساحل پہ ایک مرکزِ تسکین کی طرح موجود

اس وقت آپ گھبرائیں نہیں۔ یہ صحیح ہے۔ انہوں نے اس کا مخفف ڈھونڈھ لیا ہے۔ تمام سڑکیں کونٹی نینٹل کو جاتی ہیں۔ اس کے اخراجات نیویارک کے چھوٹے ہوٹلوں سے بھی بہت کم ہیں۔ پچاس روپے روزانہ اور شہر میں بہترین سروس —— مہمانوں کے لئے ایک تازہ پانی کا تیرنے کا تالاب ہے۔ پول سپروائزر انچارج بھی بڑی دلکش شخصیت ہے۔ ڈی لکس سیلون، تحفوں کی دوکانیں اور ایک مشرقی زیورات کی دکان بھی ہے۔ جو انتہائی خوبصورت اور معیاری ہیں لیکن ان کے نرخ اتنے زیادہ نہیں۔

ہوٹل میں گھومتے پھرتے آپ کو کبھی نقدی کی کمی محسوس نہیں ہوگی کیونکہ یہاں یونائیٹڈ بنک کا شاندار دفتر ہے۔ اور حبیب بنک کا بھی —— اسی طرح پی۔ آئی۔ اے، پین امریکن اور لفتانسا کے دفاتر بھی موجود ہیں جو آپ کو اس نیک زمین پر کسی بھی سمت لے جانے اور پھر واپس لانے کے لئے حاضر ہیں —— کہاں واپس لانے کے لئے؟ یقیناً کراچی انٹرکانٹی نینٹل میں ——

میٹروپول سے امریکہ کے سفارت خانے تک کا فاصلہ صرف پانچ منٹ کا ہے۔

عمارت نے کراچی جم خانہ کو گھیر رکھا ہے۔ خوبصورت عمارت اس رنگ و روغن میں لپٹی چمک رہی ہے جو بکسلے پینٹس آف پاکستان کا عطیہ تھا۔ کراچی جمخانہ سیاحوں اور مقامی شہریوں دونوں کا ہر دلعزیز کلب ہے۔ چیف ٹینس کوچ نور احمد کی ہمہ تن متوجہ نگاہوں کی نگرانی میں بے شمار لوگ ٹینس کھیلتے ہیں۔

اسی بلاک میں کے ایل ایم کا صدر دفتر ہے۔ اس عمارت کی کھڑکی میں حسین جمیل گڑیاں ہالینڈ کا مخصوص قومی لباس پہنے پُر فضا منظر میں متحرک دکھائی دیتی ہیں۔

دوسرے ہوٹل، جو سیاحوں میں مقبول ہیں اور جن کا کرایہ بہت کم ہے۔ سنٹرل، کولمبس، میرامیر، ایکسیلیٹر، فاروق (جہاں لوگ مرغ کے تکے کھانے جاتے ہیں) نارتھ ویسٹرن، دی تاج، ڈی لکس، برسٹل اور ٹوانہ ہاؤس ہیں۔ ٹوانہ ہاؤس، ٹورسٹ ان (سیاحوں کی سرائے) کے نام سے مشہور ہے۔ کولمبس کے سوا، جس کے کمروں کا کرایہ پچیس روپے یومیہ سے شروع

ہوتا ہے، باقی تمام ہوٹلوں میں پندرہ سے بیس رُوپے یومیہ معہ خوراک کے بدلے تسلّی بخش رہائش مل جاتی ہے۔

علاوہ ازیں دس فضائی کمپنیوں کے بڑے بڑے دفاتر کا مرکز بھی کراچی میں ہے، ان کمپنیوں کے نام ہیں، ایئر سیلون، ایسٹ افریقہ ایئر لائنز، ایران ایئر، عراقی ایئرویز لمیٹڈ، جاپان ایئر لائنز (جال) کویت ایئرویز اور متحدہ عرب ایئر لائنز۔ یہ وہ کمپنیاں ہیں جو لوگوں کو دنیا کے چاروں کونوں سے علی بابا کے اس ملک میں لاتی ہیں، کراچی ایئرویز کلب سیاحوں کے لیے مشہور تاریخی مقام موہنجوڈارو کے فضائی سفر کا باضابطہ انتظام کرتی ہے جس سے انسان ناہموار سڑک پر موٹر کے تھکا دینے والے سفر کی زحمت سے بچ جاتا ہے۔

امریکی سفارت خانے سے ایک بلاک پرے، حکومتِ پاکستان کا ٹورسٹ بیورو ہے۔ ایک وجیہہ افسر، جو سیاحوں کا خیر مقدم کرتا اور اُنھیں مفید مشورے دیتا ہے، اس دفتر کا انچارج ہے، اس کا ٹیلیفون نمبر ۵۰۱۱۹ ہے۔ اس بیورو کے دو دفتر اور بھی ہیں۔ ایک فضائی اڈّے میں ہے، جو ان سیّاحوں کی مدد کرتا ہے جو ہوائی جہازوں کے ذریعے آتے ہیں، اس کا ٹیلیفون نمبر ۴۹۲۴۱ ہے، دوسرا دفتر ویسٹ وہارف میں واقع ہے جو ان مُسافروں کی رہنمائی کرتا ہے جو بحری جہازوں کے ذریعے آتے ہیں، جس بلاک میں یہ بیورو ہے، اسی میں غلام رسُول ٹیلر ماسٹر کی دُکان ہے، جس کے بورڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نذیر محمد کا والد ہے، جو سارا دِن آلتی پالتی مارے خواتین کے دلفریب ملبوسات سیتا رہتا ہے۔ اس ملک میں "فلاں ابن فلاں" کہنے کا بہت رواج ہے، اس لحاظ سے نذیر محمد غلام رسُول کا بیٹا ہے، یہ دُکان ایک کھلی ہوئی کھڑکی لگتی ہے۔ اور مقامی گائیڈوں اور ٹھگنے قد کے اخبار فروش لڑکوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے، یہ لڑکے تازہ رسالے فروخت

کرتے ہیں، اور غیر سرکاری اطلاعات مفت مہیا کرتے ہیں، ابھی حال ہی میں نذیر محمد کے ہاں دسواں بچہ پیدا ہوا ہے، بیگم نذیر محمد کی حالت اچھی نہیں تھی، وہ قلت خون کے باعث کمزور ہو رہی تھی، میں نے نذیر محمد سے پوچھا: "تم اسے کھانے کو کیا دیتے ہو؟"

"صرف سیال چیزیں پینے کو دیتا ہوں" اس نے جواب دیا

"لیکن یہ ناکافی ہیں" میں نے کہا "اسے دلیہ کھلایا کرو، پرانے فیشن کا دلیہ، جس میں ایک کچا انڈا ملا ہوا ہو، اس کے کھانے سے اس کی صحت بحال ہو جائے گی"۔

اسے دلیے کا قائل کرنے میں کچھ دن لگ گئے، علاوہ ازیں میں نے اس کی بیوی کو اور بھی نفیس اور عمدہ چیزیں دیں، جن سے اس کی حالت سدھر گئی اور ایک مرتبہ پھر نذیر محمد میرا خوش باش و بے فکر ٹیلر ماسٹر بن گیا، وہ روایتی بحری قزاق کی طرح خوبصورت اور ایک مدبر کی طرح شائستہ تھا۔

جب اس نے اور اس کے بھائی نے ایک نیا فراک مجھے تحفے میں دیا تو میں اُن کے احسان کے بوجھ تلے دب گئی، میں نے پوچھا "تم نے ایسا کیوں کیا ہے؟ میرے پاس درجنوں ملبوسات ہیں، مجھے اس کی قطعاً ضرورت نہیں ہے، تمہارے بچوں کو اس کی ضرورت ہے تم اس کپڑے سے اپنی ننھی مُنّی بچیوں کے لیے کم از کم دو جوڑے تیار کر سکتے ہو"۔

اس نے سختی سے جواب دیا "میم صاحب! آپ میری غیر ملکی دوست ہیں، مجھے ایسے دوست بہت پسند ہیں۔ اس فراک کا کپڑا میرے بھائی نے اپنی چھوٹی سی دُکان سے لا کر دیا تھا، ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ آپ کے لیے تحفہ خریدتے، میں نے اسے سی دیا ہے۔ آپ کو کہیں سے خرید کر نہیں دیا بلکہ ہم نے خود تیار کیا ہے، اور کسی کو کچھ ادا نہیں کیا"۔

میں اس کی باتوں سے ازحد متاثر ہوئی، میرا غریب ٹیلر ماسٹر اور اس کا مفلس بھائی یہ سب کچھ میرے لیے کر رہے تھے، آخر میں نے انھیں خوش کرنے کے لیے یہ فراک لے لیا، ان کی دُکان کے ساتھ والے مکان میں ہیئر ڈریسر ڈینس کی دکان ہے، اس دُکان کی کھڑکی میں پھول کھلے ہیں۔ عشق پیچاں کی بیل جتنی اس دن سبز و شاداب تھی، پہلے کبھی نہ تھی، اسی طرح سُورج کی روشنی بھی ازحد چمکیلی تھی، میں اپنے نئے فراک کی خوشی میں اس دُکان میں شیمپو کے لیے داخل ہوگئی۔

ڈینس کی چھوٹی سی دُکان بڑی عجیب و غریب لیکن بڑی آرام دہ ہے، اس کی نشستوں کے عین سامنے ایک باغ ہے اور فضا میں کوئی اجنبیت نہیں، اس کا مالک جارج بڑا زندہ دل انسان ہے۔ اور لڑکیوں کے بالوں کی اصلاح اور آرائش میں بڑی چابکدستی اور مہارت کا مظاہرہ کرتا ہے۔ آپ شکستہ دل اور مغموم کیوں نہ ہوں، جارج کے مشّاق ہاتھ لگتے ہی آپ خوش و خرم ہو جائیں گے اور اس کے سیلون سے تازہ دم ہو کر نکلیں گے، آپ کے بال چمکنے لگیں گے اور بالوں کے خم اپنے صحیح مقامات پر بیٹھ جائیں گے، اور جب آپ اس کی باتیں سنیں گے کہ کس طرح اس نے لندن کی بہترین دُکانوں میں کام کیا تو آپ کا دل باغ باغ ہو جائے گا۔

کراچی میں آپ کو ہر قسم کے ہیئر ڈریسر مل سکتے ہیں، مسلمان اور عیسائی، یہ ہر ہوٹل کے قرب و جوار میں موجود ہوتے ہیں۔ ایکسیلیئر ہوٹل کے قریب ایک حسین چینی خاتون ہے، جس کا نام میریانی ہے، وہ بال تراشنے اور ان کی آرائش کرنے میں ماہر ہے۔ اس کی چھوٹی سی دُکان میں جو ایک حجام کی دُکان کے عقب میں واقع ہے، ہمیشہ جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ میٹروپول ہوٹل کے عقب میں ایک اور سیلون ہے، جس کا مالک ایک نیک دل مسلمان یو۔ این۔ چارلی ہے، ایک اور ہیئر ڈریسر کا نام اچیر ہے، جس کی دُکان کا رخ گیری کی دُکان کی طرف ہے، جو

ایک ڈالر سے کم اُجرت پر بال کاٹتا ہے۔

آرائش حسن کی بات چل نکلی ہے تو کراچی میں اس کے لیئے سب کچھ موجود ہے۔ ایک سیلون بھی ہے جسے ایک جرمنی اور پیرس کے تربیت اور تعلیم یافتہ ماہر آرائش حسن اور فزیا تھراپیسٹ چلاتے ہیں۔ وہ اپنی آرائشی تدابیر میں انسانی دلچسپی بھی شامل کر لیتے ہیں۔ اس جذباتی تاثر کے باعث آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ نے نیا جنم لیا ہے۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کو حسین دکھائی دینے کیلئے اس کے ہاں جائیے، یہاں آپ کے لیے آرام کا پیغام ہے۔ سحر انگیز تراش خراش ظاہری طور پر حسن میں اضافہ کرتی ہے اور تھراپی کے ذریعے آپ کو آرام سکون بھی میسّر آجاتا ہے۔

یہ سب کچھ کیسے ہوتا ہے؟ ہاں یہ بہت اہم ہے۔ اس کی مالک مادام قیصر سلطانہ جو نہایت ہنس مکھ لیکن کم سخن نوجوان اور دلکش خاتون ہیں وہ آپ پر ذاتی توجہ دیتی ہیں۔ اور آپ کو اپنے تئیں خوشدل محسوس کرنے پر اس وقت مجبور کرتی ہیں۔ جب آپ ایسا نہ کرنے پر تلے ہوتے ہیں۔ جب آپ سارے آرام وہ، اور انبساط بخش سلوک کا لطف اٹھا چکتے ہیں تو آپ کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ ایک راز آپ ایک عمر جس کی تلاش میں رہے ہیں، وہ سچا ثابت ہوا۔ بیگم قیصر کو ایک محبوب بیوی اور تین خوبصورت بچوں کی ماں ہونے کی حیثیت سے زندگی کی جو خوشی حاصل ہے۔ اسے بھی وہ اپنے گاہکوں کے لیے وقف کر دیتی ہیں۔ اس سے انہیں اور خوشی ہوتی ہے۔

میں ایک پاکستانی خاتون، اور شادی شدہ یا غیر شادی شدہ سیاح خاتون سے عرض کروں گی کہ کوئی ایسا دن جس روز بہت زیادہ تھکن ہو اور آپ دل ہی دل میں کہہ رہی ہوں " بس اب لیٹنا چاہیئے۔ کاش کوئی مجھے لٹا دے۔ میرے کندھے دبائے جو خریدا ہوا سامان اٹھا کر تھک گئے ہیں۔ کوئی میرے پاؤں ایسے دبائے کہ وہ پھر درد نہ کریں۔ کوئی مجھے خوبصورت بنا دے۔ غرض وہ سب





گڑیاں

باتیں جو آپ کی تھکن بھی دور کر دیں - آپ تر و تازہ نظر آئیں - ہم میں سے تو اکثر کو رکشوں، ٹیکسیوں اور پیدل چل چل کر ایسے لمحات سے سابقہ پڑتا ہے ہم بالکل تھک ہار جاتے ہیں - یوں لگتا ہے کہ کبھی ہماری طبیعت بحال نہیں ہو گی - فوراً ہم اپنے آپ کو بستر کے سپرد بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ابھی بڑا کام پڑا ہوتا ہے - گھر کی مالکہ ہو تو اگلے کھانے کا فکر ہوتا ہے ۔ مہمان ہو تو آئندہ سیر کی تمنا ہوتی ہے ۔ اس وقت بال بچے چھوڑ کر پانی میں تیرنے یا ٹینس کھیلنے بھی نہیں جایا جا سکتا ۔ ایسے لمحوں میں آپ وہی کریں، جو میں کرتی ہوں ۔ آپ چپکے سے ڈائل ۷۶۳۹ ۴ نمبر پر گھمایئے یہ بیگم قیصر کا مختصر سا ادارہ ہے اس کا نام قیصرین ہے - فون پر بتایئے کہ آپ ان

کے 'مرکزِ حسن' میں آنا چاہتے ہیں۔ یہ خوش اخلاق بیگم آپ کو فون پر ہی خوش آمدید کہیں گی اور آپ کی سہولت کے مطابق وقت دیں گی۔ اس وقت صرف آپ ہی ہوتے ہیں جس پر غور کیا جاتا ہے۔ آپ کے احساسات اور صبر بھی قابلِ غور ٹھہرتے ہیں میں نے اس کا باقاعدہ تجربہ کیا اور یہ واقعہ پیشِ خدمت ہے۔

میں سٹ پٹا گئی تھی۔ آج دھوپ بہت تیز تھی۔ میں نے کئی ایک خاص ملاقاتیں بھی کیں میں نے خریداری کی۔ ایک ایسے شخص سے بھی تلخ کلامی کی جس سے نہیں کرنا چاہیئے تھی (کیا ہم سب اس بات کے مریض نہیں ہیں؟) مجھے یاد ہے کہ ۳ بجے نیکدن بیگم صاحبہ نے مجھے بلا لیا۔ مجھے تمام کام چھوڑ دینے کے لیے کہا ان کی کار میں بیٹھتے ہی طبیعت پہلے کی نسبت زیادہ ہشاش بشاش ہو گئی ایک مرتبہ بہترین کی رنگین اور پھولدار چار دیواری میں کپڑے اتار کر گرم حمام میں داخل ہو گئی۔ مجھ پر سکون بخش حرارت گرتی رہی اور مجھے غنودگی محسوس ہونے لگی۔ بیس منٹ بعد ایک خوش شکل سفید بالوں والی جرمن معاون مجھے تھراپی کے میز تک لے گئی۔ ایک ماں کی طرح میرے بالوں کو اس نے صاف ستھرے تولیوں سے صاف کیا پھر بیگم کی ایک پاکستانی معاون نے اس میز کے تھراپی کے آلات، یعنی الف لیلوی گدے مجھ پر تہ کیے۔ اوپر نیچے وہ جا رہے تھے۔ اوپر نیچے۔ اور آہستہ آہستہ سب درد اور تکلیف یوں دور ہو رہی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ اُف کتنا مزا آ رہا تھا میں تو وہیں ٹھہری رہتی وہیں سو جاتی اور وہیں رات بسر کرتی۔ لیکن صد حیف کہ یہ خوش منظر صرف آدھ گھنٹے میں بیت گیا۔

اس سے اگلا مرحلہ چہرے کی آرائش کا ہوتا ہے یہ بھی خوب ہے۔ پھر اسی طرح ان صوفوں میں سے کسی پر لیٹے ہوئے، آنکھوں پر پیڈ بندھے ہوئے چہرے پر مسلسل خوشبو کی بارش ہوتی رہتی ہے لیکن یوں لگتا ہے کہ محبت برس رہی ہے آپ ذرا سوچیں تو آپ کسی دور دراز دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ بیگم کی معاونین میں سے

کوئی آتی ہے اور آپ کے چہرے کو گرم تولیوں کا لمس پہنچاتی ہے۔ یہ حرارت یہ سکون۔ آپ اپنے آپ کو بہشت میں محسوس کرتے ہیں۔ اور گرم گرم تولیے یکے بعد دیگرے ــ کس کافر کا یہاں سے اٹھنے کو دل چاہتا ہے بار بار یہی حظ اٹھانے کو

جی چاہتا ہے۔ بیگم صاحبہ اپنے ماہر اور تربیّت یافتہ ہاتھوں سے آپ کے لب و رخسار کو گرمیٔ حسن بخشتی ہے۔ ابروؤں کے نشتر اور تیز کر دیتی ہیں۔ جب یہ سحر انگیز عمل ختم ہوتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ سارے جسم کو ایک حرارت بخش غلاف پہنا دیا گیا ہے اس لمحے بھول جاتا ہے کہ کبھی کسی سے تلخ کلامی ہوئی تھی، کوئی درد، تکلیف یا پریشانی لاحق ہوئی تھی۔ آپ چند لمحے خاموشی سے بیٹھ جاتی ہیں اور دیکھتی ہیں۔ اس اثنا میں ایک اور معاون کسی دوسری خاتون گاہک کو درزش کے کمرے میں لے جا رہی ہوتی ہے۔ پھر آپ سب چائے پیتی ہیں۔ دنیا کی ہر شے پیاری لگتی ہے ــ اور آپ سب سے پیاری ـــــ ذرا تصور کیجیے کہ یہ سب کچھ چند سکّوں کے عوض مل جاتا ہے۔

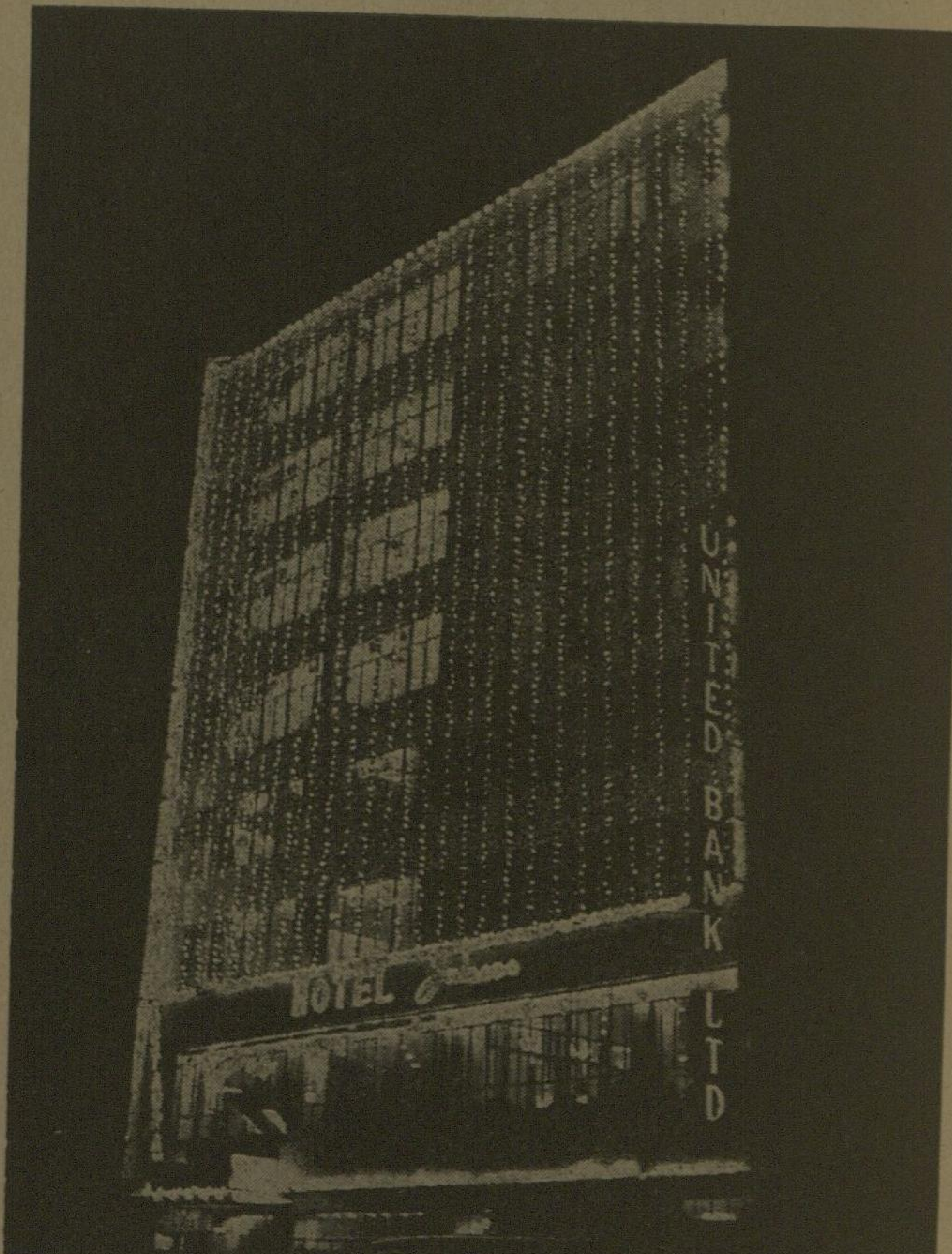
جاتے وقت آپ یوں محسوس کرتی ہیں کہ کوئی خواب دیکھا تھا۔ آپ کی دلی مسرت اور انبساط کا یہ عالم ہوتا ہے جیسے آپ کا کوئی انعامی بانڈ نکل آیا ہے۔ یقیناً اس سیلون سے یہی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔

کراچی شہر کی مٹرگشتی بھی ایک مہم ہے۔ الفنسٹن سٹریٹ، جو پاکستان کی پکاڈیلی سٹریٹ ہے، کی فضا پر میلے کا گماں ہوتا ہے۔ جہاں چھ سے ساٹھ سال کی عمر کے خوانچہ فروش ہر کونے پر کھڑے ہو کر موتیوں کے بنے ہوئے بٹن فروخت کرتے ہیں، اس بازار کے خوش خلق تجار آپ کو اشارہ کر کے بلاتے ہیں اور پوچھتے ہیں "کیا آپ نفیس قالین خریدیں گے؛ خالص مشرقی مال ہے اندر تشریف لے آئیں" ان دکانوں میں سے ایک کا نام بخارا پیلس ہے، اس دکان کے اصلی

مالک وہ لوگ تھے، جو مغل شہنشاہوں کے عہد میں قالین تیار کیا کرتے تھے۔ ان کے موجودہ قالین ہر کمرے اور گوشے کے لیے موزوں ہیں، کراچی میں آنے والے اکثر سیاح قالین خریدتے ہیں، دکاندار اتنے ہوشیار ہیں کہ وہ ان قالینوں کو بڑی احتیاط سے باندھ کر آپ کے وطن جانے والے جہاز میں لادنے کا انتظام بھی خود کرتے ہیں، خرید و فروخت کے لیے، سب سے پہلے آپ کو دو دروازوں والی گرینچ ایجنسیز کی دُکان پر رکنا ہوگا۔ یہاں آپ کو دنیا بھر کی کتابیں اور رسالے، اسٹیشنری، قلم، پاکستان کی یادگاریں اور تحائف دستیاب ہوں گے، ہر قسم کی گھڑیاں بھی ملیں گی، اور ان کی مرمت بھی کرائی جا سکے گی، وہ کم از کم نیویارک ہیرلڈ ٹریبون کا یورپی ایڈیشن ہر روز فروخت کرتے ہیں تاکہ آپ سٹاک مارکیٹ کے بھاؤ معلوم کر سکیں، جو بمشکل ۲۴ گھنٹے پرانے ہوتے ہیں۔ اس دُکان کے عین سامنے کشمیر آرٹس شاپ ہے، اس کی یہ خصوصیت ہے کہ یہاں اونٹ کی کھال کے لیمپوں سے لے کر ننھی منی گڑیاں تک مل سکتی ہیں۔

اسی راہ پر لندن واچ شاپ کی طرح جیولرز کی دُکانیں ہیں، جو مرمت کا کام بڑا عُمدہ کرتی ہیں، ان کے ہاں ایسے ٹائم پیس ہیں جو اُنھوں نے دُور دراز مقامات سے فراہم کیے ہیں، جو قدیم اور جدید پُرزوں سے مکمل کیے گئے ہیں اور جو بڑی دلکش ہیں، ان کے ہاں سونے چاندی کے نایاب تحائف ہیں جنھیں مشاق کاریگروں نے تیار کیا ہے۔ ان کے مقابلے میں سوس واچ کمپنی ہے جو قریب ہی ہے۔ یہ بھی مرمت کا کام بہت عمدہ کرتی ہے، ان کے پاس مختلف برِاعظموں کی بنی ہوئی اشیا ہیں، ایسے کلاک ہیں جن میں رقص کا نظارہ پیش کیا گیا ہے اور موسیقی بجانے والے ڈبے لگے ہیں اور جنھیں بڑی ترتیب سے سجایا گیا ہے۔ یہ آغا خاں کے مخصوص گھڑی ساز ہیں۔

بازار کی دوسری جانب "آپٹیکو" کی دکان ہے، اس علاقے میں چشمہ سازی کی یہ



ہوٹل جبیس ، وکٹوریہ روڈ کا وقار

مقبول دُکان ہے، ان کی قیمتیں درمیانہ ہیں جن کے عوض وہ مصنوعی شیشے تیار کرکے آپ کی مرضی کا چشمہ تیار کر دیتے ہیں، اور اگر آپ کا چشمہ گم ہوجائے تو ان کے ہاں ایک سند یافتہ چشمہ ساز ہے جو بلا معاوضہ آپ کی آنکھوں کا معائنہ کرتا ہے، اور اگر آپ بدحواسی کی وجہ سے اپنا قلم کھو دیں تو ان کے شوکیس پارکر اور دیگر مشہور قلموں سے بھرے پڑے ہیں۔

عالمگیر ٹیکسٹائل ملز کا تیار کردہ لیڈی ہملٹن سلک اُن مقبول کپڑوں میں سے ایک ہے جسے پاکستانی خواتین زیب تن کرتی ہیں، علاوہ ازیں نفیس اور باریک دوپٹے اور برقعے جن سے عورت کے حسن میں اضافہ ہوتا ہے، یہ شہر کی سینکڑوں دُکانوں سے دستیاب ہو سکتے ہیں۔ یہ ایسی اشیاء ہیں جنہیں سیاح اپنے وطن لے جا سکتے ہیں۔

وکٹوریہ روڈ پر سیاح الپا کی دُکان کا مال دیکھ کر خوشی سے جھومنے لگتے ہیں۔ چھوٹے اونٹوں سے لے کر سونے، چاندی، پیتل اور ہاتھی دانت کی قیمتی اشیاء دیکھ کر وجد آجاتا ہے۔ اور جب وہ ریکس سینما کے قریب ایٹاٹل ایمپوریل میں پہنچتے ہیں تو ایک مرتبہ پھر خوشی سے باغ باغ ہوجاتے ہیں، یہاں انھیں خواتین کے ہینڈ بیگوں اور دوسرے نوادرات کے نمونے ملتے ہوں۔

ان دنوں وکٹوریہ روڈ پر صرف دلکشی ہی نہیں کھل رہی ہے۔ بلکہ اس میں بالکل ہی نئی چمک دمک ہے۔ اور حقیقی معنوں میں ایک اوّل درجے کا خوبصورت ہوٹل اس کے دامن میں آگیا ہے۔ یہ ان سیاحوں کے لیے مژدۂ جانفزا ہے جو لاکھ پتی نہیں ہیں۔ صرف پچیس روپے روزانہ پر آپ کو بالکل نیا کمرہ —— غسلخانے اور ناشتے کے ساتھ مل جاتا ہے۔ آپ کو اس کے علاوہ کچھ نہیں دینا پڑا۔ آپ کو یہاں ٹھہرنے کے لیے گراں خرچ کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس کی آرائش ایئر کنڈیشنگ اور خدمت انتہائی طور پر گراں قدر ہے۔ سینک بار اور

عمدہ عشائیہ گاہیں اور ایک بنک سب ایک ہی چھت تلے واقع ہیں اس کے علاوہ ۱۰۲ کمرے ہیں۔ جس میں چاہیئے، رہیئے۔ اسے ہوٹل جیس کہتے ہیں۔ آپ اسے قطعاً نہیں بھولیں گے۔ شہر کے سب سے بہتر کاروباری مرکز کے عین درمیان میں۔ اس کے ساتھ ہی سارے بازار ہیں۔

یہیں بوہری بازار کی بغلی گلیوں میں، جو میٹروپول سے دس منٹ کے راستے پر واقع ہیں، امیر لوگوں اور غریبوں کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ کنگن اور چمکدار پتھروں سے مرصع سینڈل خریدنے میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔

ایوا گارڈنر پاکستانی جوتے دیکھ کر ان کی اتنی گرویدہ ہو گئی تھی کہ اس کے متعلق مشہور ہے کہ اس نے اپنے تمام دوستوں کو دینے کے لیے خمیدہ پنجے والی اور مرصع اور کشیدہ کاری والی جوتیوں کے ۰۰۰،۲ جوڑے خریدے تھے، بوہری بازار میں ہر قسم کا مال مل سکتا ہے، ایمپرس مارکیٹ بھی بڑی دلکش ہے، یہاں سے اشیائے خوردنی کھانا، پھل اور گھریلو استعمال کی ہر چیز دستیاب ہو سکتی ہے۔ اسی علاقے میں کراچی کے تین چینی ریستوران واقع ہیں، جو اعلیٰ قسم کے ہیں، ان کے نام ہیں کینٹن، ساؤتھ چائنا کیفے اور اے۔بی۔سی، ہوٹلوں سے باہر علاقائی اور یورپی کھانے کے لیے شیزان اور زین کے کافی ہاؤس مشہور ہیں۔

کراچی کے مناظر اور آوازیں بے شمار ہیں، حسین وجمیل فریئر ہال ہے جس میں قومی عجائب خانہ ہے، جہاں بدھ مت کی یادگاریں اور آرٹ کے ایسے نمونے رکھے ہیں جو ۰۰۰،۵ سال پرانے ہیں۔ انھیں دیکھ کر اس تہذیب و تمدن کا خیال آتا ہے، جس سے یہ خطہ مالا مال تھا جو اب پاکستان کے نام سے موسوم ہے، بدھ کے ماننے والوں کے قیمتی جواہرات کو جو تین ہزار سال پرانے ہیں، دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے، اور انھیں اس عجائب خانے میں بڑی اچھی طرح محفوظ

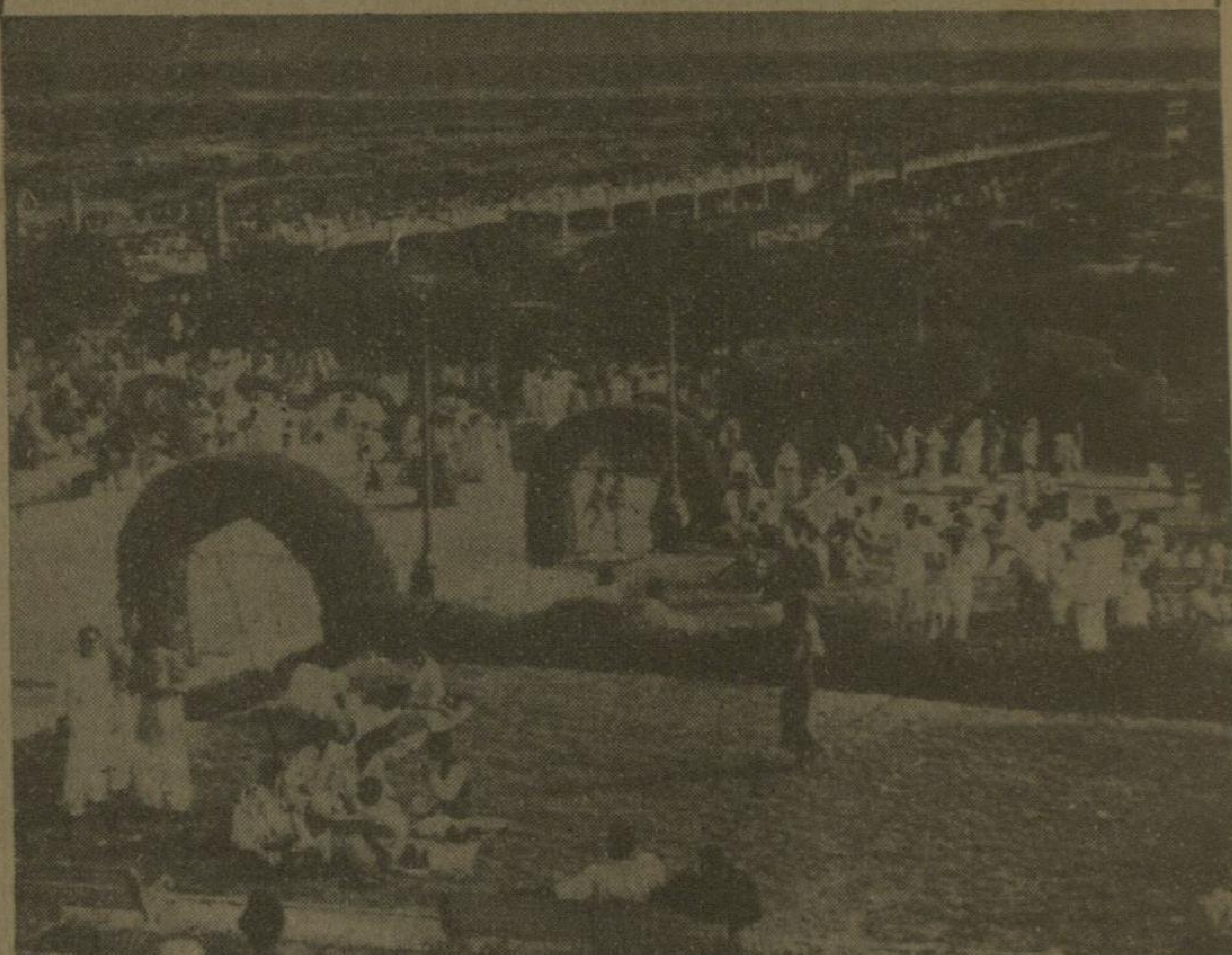
کیا گیا ہے، قومی اسمبلی کی عمارت، جو برتر باغ کے قریب ہے، بڑی خوبصورت اور قابل دید ہے، چیف کورٹ کی شاندار عمارت سرخ پتھر سے تعمیر کی گئی ہے، بندر روڈ پر ڈنشا ہال ہے، جس میں ایک گھنٹہ گھر اور ایک اعلیٰ درجے کی لائبریری ہے۔ اس ہال میں پانچسو افراد کی نشستوں کا انتظام کیا گیا ہے۔

وہ عمارت جس میں بیسویں صدی کی شاندار جھلک موجود ہے اور جس کا طرزِ عمارت غیرمعمولی ہے، کراچی آرٹ کونسل ہے، جہاں ملکی اور غیرملکی آرٹسٹ اپنی تصاویر کی نمائش کرتے ہیں، کراچی یونیورسٹی بھی دیکھنے کے لائق ہے۔ یہ زمین کے ایک مرتفع قطعے پر ۱۲۷۹ ایکڑوں میں پھیلی ہوئی ہے، اس کے ساتھ پچیس کالجوں کا الحاق ہو چکا ہے، جن میں تمام تعلیمی مضامین پڑھائے جاتے ہیں۔ امریکی سفارت خانہ، جس کا ڈیزائن ایک امریکی ماہرِ تعمیرات نے تیار کیا تھا، ایک اور قابلِ دید مقام ہے، اسے کراچی کے دارالخلافہ کی حیثیت کھونے سے پہلے نئی چانسری کے طور پر تعمیر کیا گیا تھا، یہ اس وقت تک چانسری رہے گا جب تک نیا دارالخلافہ پوری طرح آباد نہیں ہو جاتا، اس کے سفید اور سنہری رنگ گرم خطوں کی عکاسی کرتے ہیں اور یہ ایشیائی چمکیلی فضا سے بالکل ہم آہنگ ہیں، کراچی کا سینٹ پیٹرک کیتھڈرل جو ۱۸۸۱ء میں تعمیر ہوا تھا، صحیح گوتھک آرٹ کا نادر نمونہ ہے، ویشکن لیگیشن کا گرجا جدید طرزِ تعمیر کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ کلفٹن میں واقع ہے اور اس کا رخ سمندر کی جانب ہے۔ پاکستان ان معدودے چند مسلمان ممالک میں سے ایک ہے جس میں ایک ویشکن لیگیشن موجود ہے اور کراچی کو اس پر بڑا فخر ہے۔

اپنے پیارے قدیم اور درخشندہ کراچی کے پاس اور کیا ہے؟ یہاں گڑیاں بنانے والے بھی ہیں۔ جو یہ کھلونے محبت کے لیے بناتے ہیں۔ پاکستان کی خواتین اور لڑکیاں لباس کے جو نمونے بھی پہنتی ہیں وہ سب کپڑے کی ان پیاری پیاری گڑیوں کو پہنائے

جاتے ہیں۔ دلہن گڑیا چمکتے زیورات، نقاب، ہلکی اور ریشمی کپڑوں میں ملبوس شلوار اور قمیض میں۔ سیاح انہیں بہت پسند کرتے ہیں انہیں خرید بھی لیتے ہیں۔ کیونکہ محض دو ڈالروں میں اس ایشیائی سرزمین کی یہ یادگار ہاتھ لگ جاتی ہے۔ کسی بھی مغربی گڑیا سے زیادہ دلکش ہوتی ہے یہ گڑیاں ملک بھر میں خواتین بلکہ مردوں کو بھی مسحور کرتی ہیں یہ بچاس سالہ احمد یار خاں جو کبھی ایک معزز اور رئیس باپ کے بیٹے تھے۔ زندگی کے نشیب و فراز نے انہیں ناداری کی حالت تک پہنچا دیا تو انہوں نے اپنے فنکارانہ ذوق کے سہارے گڑیاں بنانا شروع کر دیں اور اس میں کامیابی حاصل کی۔ اب یہ ماہر دستکار اپنی خوبصورت گڑیوں کے طفیل نہایت اچھی زندگی بسر کر رہا ہے ان گڑیوں کی ادھر ادھر نمائش بھی ہوتی رہتی ہے ملک کی بہترین دکانوں میں یہ گڑیاں فروخت کے لیے بھی موجود ہیں۔ لیجئے سب سے پہلے الفنسٹن سٹریٹ میں ہو آیئے۔

ہلکی پھلکی سیر کے لیے کسی سیاح کو کلفٹن کی سیر سے محروم نہ رہنا چاہیے۔ یہ شہر سے صرف تین میل دور ہے یہاں سرخ پتھر کی سیڑھیاں لائیڈز پایۂ تعمیر کی گئی ہیں جو کلفٹن سے شروع ہو کر ساحل سمندر تک چلی جاتی ہیں، درمیان میں کہیں کہیں ایسے مقامات بھی آجاتے ہیں، جو ہموار ہیں اور جہاں سیڑھیاں نہیں ہیں۔ جونہی آپ سمندر کے کنارے ریتلی زمین پر پہنچیں گے آپ کو خوانچے والوں کی ایک لمبی قطار نظر آئے گی۔ جن کے خوانچوں میں ایسی خوبصورت اشیاء رکھی ہیں جو چمکیلے رنگین سیپ اور گھونگے سے تیار کی گئی ہیں، آپ ایک روپیہ خرچ کر (ذرا تصور کیجیے! روپیہ صرف ۲۰ سینٹ کے برابر ہوتا ہے) آپ سیپ کی بنی ہوئی چوڑیاں، بالیاں، ہار، ایش ٹرے اور چھوٹی چھوٹی بطخیں خرید سکتے ہیں، کلفٹن کے خوانچے والے سے سودا خریدنا بڑا نفع بخش ہوتا ہے۔ ایک اور سودا بھی ہے اور وہ ہے اونٹ کی سواری۔ میں ایک اونٹ



لائیڈز پائیر

پر سوار ہوئی تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا کہ میں دنیا کی بلند ترین چوٹی پر پہنچ گئی ہوں اونٹ جھوم جھوم کر سمندر کی لہروں میں چلنے لگا اور میں بھی اس کے کوہان اور پیٹھ کے درمیان بیٹھی جھومتی رہی، میں نے سوچا کہ اس طرح میں کسی اور سمندر میں جا نکلوں گی، لیکن اونٹ کے مالک نے آرام سے اونٹ سے کچھ کہا، وہ بیٹھ گیا اور میں فوراً نیچے اتر آئی۔ اس کے مالک نے جلدی جلدی اس کے ریگ آلودہ پاؤں سمندر کے پانی سے دھو ڈالے، جس سے میں بڑی حیران ہوئی۔

لائیڈز پائیر کی بنیاد ایک خاتون نے رکھی تھی۔ نہایت پیاری خاتون جو آنریبل لیڈی لائیڈ تھیں۔ ہر سہ پہر کو جب سمندر سے خنک ہوا کلفٹن کی ریت سے گذرتی وہ وکٹوریہ میں سوار تیرگی پھیلنے سے پہلے پہلے ایک چکر لگاتی تھیں۔ سمندر کو جانیوالی راہ پتھریلی تھی اور

کہیں بھی ہموار نہیں تھی۔ پانی تک فاصلہ بھی بہت طویل تھا۔ اپنی اس سیر کے دوران لیڈی لائیڈ کو ایک معزز پارسی رئیس سے ملنے کا اتفاق ہوا جن کا نام سر جہانگیر ہرمزجی کوٹھاری تھا وہ دونوں جلد ہی گہرے دوست بن گئے۔ کوٹھاری صاحب سمندر کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر تعمیر شدہ شاندار بنگلہ میں رہتے تھے۔ لیڈی لائیڈ اور سر جہانگیر اس بنگلے کی بالکونیوں میں چائے پیتے۔ یہاں ہوا کا بہت زور ہوتا تھا۔ ایک دن دونوں یہیں بیٹھے تھے۔ لیڈی لائڈ پتھریلے راستہ پر سینکڑوں لوگوں کو دِقت چلتے دیکھ رہی تھیں کہ پتھروں کی نوک سے ان کے پاؤں ضرور زخمی ہوتے ہوں گے اس دلدوز نظارے کے بعد انہوں نے سر جہانگیر سے کہا کہ اگر یہاں باقاعدہ سڑک ہو تو ان بے چارے بے شمار لوگوں کو تکلیف نہ ہو جو یہاں تازہ ہوا کی تلاش میں آتے ہیں جنہیں اتنی توفیق نہیں کہ سمندر کے نزدیک گھر بنائیں۔

قابلِ احترام پارسی نے لیڈی لائڈ کی بات مان لی اور اب اس فکر میں تھے کہ یہ سب کچھ کیسے ہو۔ لیڈی لائیڈ نے جہانگیر کو یہ سمجھایا کہ صرف ایک Pier کی ضرورت ہے جو نیچے سمندر تک جائے۔ یہ بہت بڑی بات ہوگی اور ان کا نام ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ ہو جائے گا۔ سر جہانگیر کو یہ تجویز پسند آگئی اس نے یہ Pier تعمیر کروادی لیکن اپنے نام کی بجائے اپنی دوست کے نام پر۔ عوام کے لیے یہ راہ ۲۳ مارچ ۱۹۲۱ء کو کھول دی گئی۔ کلفٹن کے ساحل کو جاتے پیارے اور ابدی راستے پر ایک کتبے سے سیاح یہ الفاظ پڑھ سکتے ہیں ــــــ لیڈی لائڈ Pier

لیڈی لائڈ کی تجویز سے متاثر ہو کر یہ سی Pier اور پویلین ۳ لاکھ روپوں کی لاگت سے جے۔ ایچ۔ کوٹھاری۔ او۔ بی۔ ای نے تعمیر کروایا اور پھر کراچی کے عوام کی نذر کر دیا گیا۔ یہ تحفہ سر جہانگیر کی سخاوت اور عوامی جذبے سے عبارت ہے۔

آج ہر شخص اس سرخ جودھپوری پتھر سے تعمیر کردہ Pier کا لطف اٹھا سکتا ہے جو سیدھا نرم ریت کے ٹیلوں کی طرف لے جاتا ہے۔

اونٹ ایک ایسا حیوان ہے جو صدیوں سے تاریخ میں اپنا مقام پیدا کر چکا ہے، لیکن ۱۹۶۱ء میں بشیر شتربان کے اونٹ نے ایک مرتبہ پھر اپنا مقام حاصل کیا۔ امریکہ کے نائب صدر لنڈن جانسن جب پاکستان کے دورے پر آئے تو یہ شریف انسان، کھسیانی ہنسی والے شتربان بشیر سے چند باتیں کرنے کے لیے رک گیا۔ شتربان اسے اتنا پسند آیا کہ اس نے اُسے بطور مہمان امریکہ آنے کی دعوت دے دی، چند ماہ بعد بشیر شتربان بڑے شاندار طریقے سے اپنے ملک سے روانہ ہوا تاکہ میرے ملک کی الف لیلوی مہم سے مسرور ہو، وہاں اس کا شاندار استقبال کیا گیا۔ امریکی بشیر سے بڑے متاثر ہوئے، اس کی تعریف و توصیف اور عاقلانہ تقریر نے تمام دلوں کو موہ لیا۔ جب وہ کراچی واپس آیا تو اس کی بڑی شہرت ہوئی، جو اس کا جائز حق تھا، آجکل متبسم بشیر پھر گاڑی بانی کا دھندا کرتا ہے، لیکن وہ اونٹ جس کی بدولت وہ اتنا مشہور ہوا اب خاندان کے ایک رکن کی حیثیت سے آرام کر رہا ہے، جب مسز کینیڈی کراچی آئیں تو آپ نے بشیر سے ملنے کی خواہش کی، اور انہوں نے ایوانِ صدر کی ایک گراؤنڈ میں بشیر کے مشہور اونٹ کی پیٹھ پر سوار ہو کر سیر کی۔

ان چیزوں کے علاوہ کراچی میں اور کیا ہے؟ اس میں سٹیٹ بنک کی بلند اور پرشکوہ عمارت ہے، اس کی دیواریں مقامی سفید پتھر سے تعمیر کی گئی ہیں، اور اس کے کمروں کی منقش لکڑی مشرقی پاکستان سے آئی ہے۔ سیاح اس کی سیر اسی جوش و خروش سے کرتے ہیں۔ جس طرح وہ نیویارک کے ایمپائر سٹیٹ بنک کی عمارت کی سیر کرتے ہیں۔

ہیوک روڈ پر واقع ایوانِ صدر فنِ تعمیر کا شاندار نمونہ ہے۔ یہ عمارت پاکستان کو برطانیہ سے وراثت میں ملی ہے، پہلے پہل یہ سابق سندھ کے گورنر کی سرکاری رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی تھی، آزادی کے بعد یہ حسین و جمیل ایوان قوم کے باپ قائدِ اعظم کی رہائش گاہ بن گیا

اس کے گرد اگرد بڑے بڑے باغات ہیں، جن میں سرسبز و شاداب قطعے ہیں، جہاں صدر غیر ملکی مشاہیر کے اعزاز میں استقبالیہ دعوتیں منعقد کرتے ہیں۔

کراچی میں کئی پُرانی اور نئی مساجد ہیں۔ سیکرٹریٹ کی مسجد خضرا مشہور ہے۔ اس میں بیک وقت پانچ سو نمازی نماز ادا کر سکتے ہیں۔

ایک جگہ سینڈ سپٹ ہے، جہاں خشکی یا سمندر کے راستے جاتے ہیں، اس کے کنارے ڈھلوان ہیں، یہ مقام تیراکوں کی جنت ہے، ساحل سمندر پر آراستہ پیراستہ جھونپڑیاں تعمیر کی گئی ہیں جہاں وہ لوگ ٹھہرتے ہیں جو اس جگہ رات بسر کرنا چاہیں، اس سے آگے ہاکس بے میں لہریں اٹھ اٹھ کر آسمان سے باتیں کرنا چاہتی ہیں، یہاں کا ہلال نما ساحل تیرنے کے لیے سہولتیں فراہم کرتا ہے۔

جزیرہ منوڑہ، جس کا لائٹ ہاؤس بڑا جاذب نظر ہے، کراچی کی بندرگاہ سے تھوڑی دُور ہے، یہاں کشتی کے ذریعے پہنچا جاتا ہے، اس پر کھڑے ہو کر بحیرۂ عرب کا منظر بڑا دلکش دکھائی دیتا ہے، منگو پیر جائیں تو اس کی فضا میں گندھک کی بُو رچی بسی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ آپ جس وقت بھی چاہیں یہاں گندھک والے پانی سے غسل کر سکتے ہیں، منگو پیر میں ایک اور بھی دلکشی ہے۔ یہاں موٹے تازے مگرمچھ ہیں، جنہیں سیاح کھانے کو اتنا کچھ دیتے ہیں کہ ان سے ہلا نہیں جاتا۔ ان مقامات پر، جن کا ذکر کیا گیا ہے، سمندر کی سیر اور مچھلی کا شکار کھیلا جا سکتا ہے۔

بند مراد کے چھوٹے سے گاؤں میں، جس میں سیاحوں کے لیے نہایت عمدہ ڈاک بنگلہ موجود ہے، آپ مرغابی کا شکار کھیل سکتے ہیں اور شکار کیے ہوئے جانور واپس ہوٹل میں پکوانے کے لیے لا سکتے ہیں۔

کراچی میں دو ایسے ہوٹل ہیں جنھیں میٹروپول کے مالک چلاتے ہیں اور جن میں آپ شہر کے پرہجوم بازاروں سے دُور، ایک ہفتہ عشرہ ٹھہر سکتے ہیں، ان میں سے ایک ہوٹل فضائی اڈّے پر ہے جو کراچی کے بین الاقوامی فضائی اڈّے کے میدان کے اوپر واقع ہے۔ اس کی چھت پر بیٹھ کر آپ کھانا کھا سکتے ہیں، رقص و سرود سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں، ستاروں اور ہوائی جہازوں کے آنے کا نظارہ کر سکتے ہیں اور یہ سب کچھ آپ نیلے آسمان کے نیچے، شور و غوغا سے الگ اور دُور رہ کر حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسرا ہوٹل دو میل پرے گرینڈ ہوٹل ملیر ہے۔ یہ بھی ایسی جگہ ہے جہاں ضرور جانا چاہیے۔ یہاں تیرنے کے لیے ایک تالاب ہے، جس میں تازہ پانی ہوتا ہے، ایک تالاب بچّوں کے لیے بھی موجود ہے، یہاں سرسبز و شاداب قطعات زمین ہیں، یہاں آپ آرام کر سکتے ہیں۔

کراچی کے سفری ایجنٹ بڑے تیز طرار ہوتے ہیں، کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ آپ کے سامنے کوئی نہ کوئی نئی چیز پیش کریں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس گرمجوشی سے وہ یہ پیش کش کرتے ہیں، اسے دیکھ کر بہت سے سیّاح سیر و سیاحت کو وسیع کر لیتے ہیں۔ ان میں سے قدیم ترین کاکس اینڈ کنگ کی فرم ہے جو ۱۹۶۲ء سے کراچی میں سفر اور سیر و سیاحت کا انتظام کرتی ہے۔ وہ ہر مسافر کا خیال رکھتی ہے۔ اس کے رہنما آغازِ سفر سے ہی سیاح کے ہمرکاب رہتے ہیں، دوسری کمپنیاں جو مشہور ہیں ان میں سے ایک امریکن ایکسپریس کمپنی ورلڈ وائڈ سروس ہے، جس کے پرکشش افسر میکلوڈ روڈ پر ہمیشہ مستعد رہتے ہیں۔ ان کمپنیوں کا مقابلہ فضائی امدادی کمپنیوں سے ہوتا ہے جو قریب ہی واقع ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ امریکی اور برطانوی سیّاحوں کے علاوہ دُوسرے برِّاعظموں کے سیّاحوں کی جماعتوں کی سیر و تفریح کا بندوبست کرتی ہیں، یونیورسل ایکسپریس نے اس وقت کام شروع کیا

تھا جب پاکستان نے آزادی حاصل کی تھی، سیاحوں کو سیر و تفریح کرانے میں ان کی شہرت مسلّمہ ہے، اس کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے جو رہنما سیاحوں کے ساتھ رہتے ہیں" وہ بڑی اچھی طرح اپنے فرائض بجالاتے ہیں۔ دُوسرے ایجنٹوں کے نام ٹریولوگ، یونیورسل ایکسپریس گلوب ٹریول اور خیبر ٹریولز ہیں۔ نئی ایجنسی سکائی لائنڈ ٹریولز اپنے نام کی نسبت سے خوب کام کرتی ہے۔ ان کی حد آسمان تک ہے، اور اس ایجنسی کا نوجوان اور ترقی پسند ناظم ہر وقت نئے نئے پرجوش سفروں کے منصوبے سوچتا رہتا ہے۔

اگر آپ دنیا کے سات سمندروں میں سے کسی ایک کی سیر کرنا چاہتے ہیں، تو آپ اس سیر کا آغاز کراچی سے کر سکتے ہیں۔ یہ شہر جہازی ایجنٹوں سے بھرا پڑا ہے۔ زیادہ مشہور کمپنیاں یہ ہیں، امریکن پریذیڈنٹ لائنز، لائیڈ ٹرانسٹینو، پی اینڈ او اورینٹ لائنز، ان کے علاوہ بیشمار کمپنیاں اور ہیں، شہر میں مقامی نقل و حرکت بڑی کم خرچ ہے اور اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک آرام دہ اور سُست رفتار سواری قدیم وضع کی ایک گھوڑا گاڑی وکٹوریہ ہے جس کا کرایہ ایک روپیہ فی میل ہے، ٹیکسی کا کرایہ بھی ایک روپیہ فی میل (دس منٹ) ہے، اور دلچسپ سواری رکشا کا کرایہ چار آنے فی میل ہے جو ہمارے سکے نکل کے برابر ہے۔ بخشیش دینا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔ ایک روپیہ خرچ کر آپ کراچی کے عالیشان چڑیا گھر، ریس کورس (گھوڑ دوڑ ہر بدھ اور اتوار کو ہوتی ہے) یا گاندھی گارڈن جا سکتے ہیں، کراچی میں آپ ایک لکھ پتی کا بجرا بھی کرائے پر حاصل کر سکتے ہیں، اس کا نام سی ویو ہے، یہ لمبے یا چھوٹے سفر کے لیے حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ٹیلیفون نمبر ہے ۵۰۳۲۰، اس سے آپ کو مطلوبہ معلومات حاصل ہو جائیں گی۔

کراچی کے تجارتی مرکز میں خوبصورت فلک بوس عمارتیں ہیں جو نیک دل

لوگوں کی یاد میں تعمیر کی گئیں۔ ۱۹۵۳ء میں ایک بہت بڑی کاروباری شخصیت امیر علی فینسی سے ان کے روحانی پیشوا آغا خاں نے کہا کہ اگر میکلوڈ روڈ پر دفتر کے لیے ایک بہترین عمارت تعمیر کی جائے تو یہ شہر کے لیے نہایت اہم ہوگا اس کے لیے یہ بھی تجویز ہوا کہ یہ عمارت امیر علی فینسی صاحب کی زیر نگرانی کمپنیوں میں سے ایک نیو جوبلی انشورنس کمپنی کے نام پر ہوگی۔

۱۹۵۹ء کے دوران نیو جوبلی انشورنس ہاؤس نے اپنے دروازے وا کر دیئے اب پاکستان کی بعض اہم ترین فرموں کے دفاتر اس عمارت میں ہیں۔ خود امیر علی فینسی صاحب کی انڈسٹریل مینیجمنٹ کا دفتر بھی یہاں ہے جو ملک کی کاروباری مہمات کی ایک بڑی تعداد کو کنٹرول کرتی ہے۔ جس میں کراچی گیس کمپنی بھی ہے اور سٹیل کارپوریشن آف پاکستان لمیٹڈ بھی۔ آج کل کے معیار کے مطابق فینسی صاحب ابھی نوجوان ہی ہیں اور وہ ہر وقت ایک جواں سال شخص کی طرح کام میں مصروف رہتے ہیں۔ ایک ہفتے وہ یورپ میں پاکستان کے لیے بہتر تجارتی امکانات پیدا کر رہے ہوتے ہیں، دوسرے ہفتے وہ امریکہ میں ملتے ہیں یا جاپان میں ہوتے ہیں جہاں اپنے اور دفتری امور کی نگہداشت کرتے ہیں یا پھر اپنے وسیع دفتر میں ہوتے ہیں وہ کبھی ایک ساعت بھی ضائع نہیں کرتے کیونکہ وہ ہمیشہ مستقبل کے پروگرام بناتے رہتے ہیں جن سے ان کے اپنے ہزاروں ملازمین بالخصوص اور اپنے ہموطنوں کا بالعموم معیار زندگی بلند ہو سکے۔ اس کا اپنا قریبی عملہ اپنی اچھی پوزیشن کے لحاظ سے پوری آسائش حاصل کرتا ہے۔

ملک میں زیادہ خوشحالی اور مستحکم معیشت کے لیے فینسی صاحب کے نزدیک مضبوط متوسط طبقہ نہایت ضروری ہے اس مقصد کے حصول اور معیار زندگی بلند کرنے کے لیے وہ چھوٹے آدمیوں کی مدد کرنے کے قائل ہیں، چھوٹے آدمیوں کو قرضہ دینے کے لیئے بینکنگ کے نظام کو بڑھانے کے لیے بڑی مساعی کی ہیں۔ ان کا ایمان ہے کہ اگر

یہ قرضے ملنے لگ گئے تو پاکستان کے کم آمدنی والے لوگوں کو موقع ملے گا کہ وہ اپنی چھوٹی دکانوں، کیفوں اور تجارتی مہموں کو کامیابی سے چلا سکیں۔ دوسرے انسانی منصوبوں کے علاوہ یہ سنجیدہ اور خاموش طبع کاروباری شخصیت تگ و دو کرتے نوجوانوں کی ترقی کے لیے ذاتی توجہ صرف کرتی ہے۔

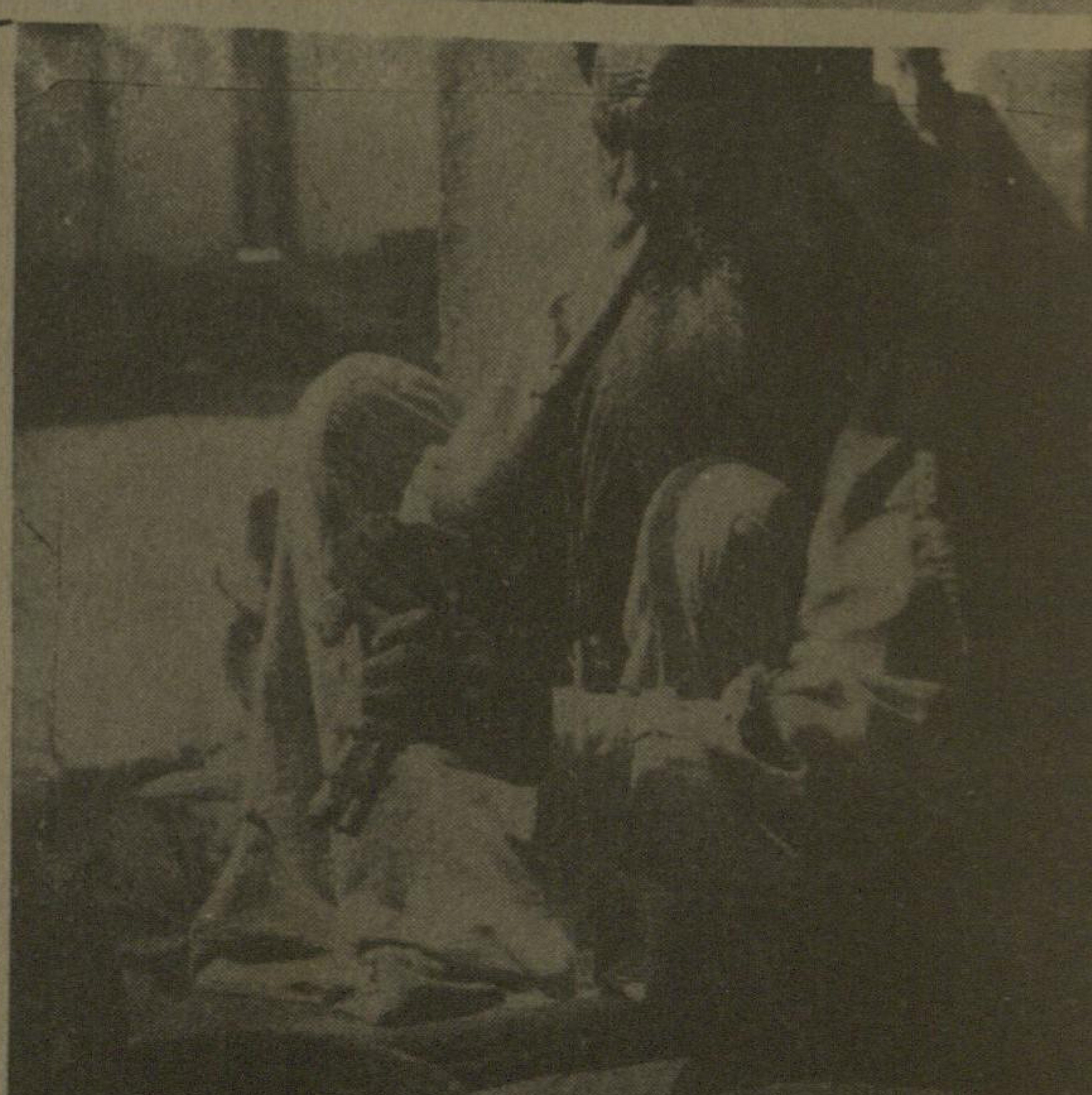
ان کے روحانی پیشوا آغا خاں تعلیم کو نہایت اہم ضرورت خیال کرتے ہیں اس لیے فینسی صاحب اسماعیلی بھائیوں کی تعلیم میں بڑی دلچسپی لیتے ہیں۔ اس دلچسپی کے علاوہ ایک ادارہ فینسی فاؤنڈیشن کے نام سے قائم ہے — جو پاکستان کے ہر طبقے کے مستحق طلبہ کو خواہ وہ اسماعیلی ہوں کہ نہ — مالی امداد اور وظائف دیتا ہے۔

ہز ہائی نس پرنس کریم آغا خان اس ملک میں کئی مرتبہ آچکے ہیں گذشتہ بار آتے تو وہ اسی خاندان کے مہمان تھے۔ امیر علی پاکستان میں اسماعیلی فیڈرل کونسل کے صدر اور آغا خاں کے وزیر ہیں۔ یہ اعزاز ان کی قیادت اور معاشرہ کے مسائل کی سوجھ بوجھ کے باعث خود آغا خاں نے عطا کیا تھا۔

مسٹر امیر علی فینسی پیدائشی قائد ہیں۔ وہ کئی نمایاں کمپنیوں میں ڈائریکٹر اور چیئرمین ہیں وہ ایک ادارے پاکستان سروسز لمیٹڈ کے ڈائریکٹر بھی ہیں یہ ادارہ پاکستان کے جدید ترین ہوٹلوں کا انتظام سنبھالے ہوتے ہے۔ تجارت اور صنعت کے مختلف شعبوں میں ان کا اثر نمایاں ہے اور تیل صاف کرنے کی صنعت اور گیس سے لے کر بینکنگ اور انشورنس تک ان کی بات ہر جگہ مانی جاتی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے — کہ اپنے خاندان کو نظر انداز کیے بغیر ایک مصروف آدمی اپنے فرائض سے کیسے عہدہ برآ ہو سکتا ہے ان کے بڑے فرزند شوکت اپنے والد کے نقش قدم پر چل رہے ہیں ان کے خیالات بڑے روشن ہیں اور انہیں اپنے گھرانے پر فخر ہے کہ انہوں نے اسمیں آنکھ کھولی۔

فینسی خاندان کی طرح کئی دوسرے خاندانوں نے اپنی مساعی سے اپنے وطن کے نام پر جو کامیابیاں حاصل کی ہیں انہوں نے پاکستان کا نام بلند کر دیا ہے۔





کراچی کا ایک سپیرا

کراچی کے صنعتی قلب میں، جو ایس - آئی - ٹی - ای کے وسیع وعریض علاقے میں واقع ہے، سیر و تفریح کا جو انتظام بڑے بڑے کارخانوں کی انتظامیہ نے کر رکھا ہے وُہ بہت خوشگوار ہے - اس علاقے کی سیر کرنے والا یہ معلوم کر سکتا ہے کہ پیداوار کتنی ہے۔ شہر میں کیا کچھ تیار کیا جاتا ہے، اسے کس قدر درآمد کرنا پڑتا ہے اور اس صنعتی علاقے سے کس قدر برآمد کیا جاتا ہے، آپ میری طرح نیوزی لینڈ جاکر بالوں کا ایک برش اٹھائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ پاکستان کا تیار کردہ ہے، اس شہر میں دواسازی کی فیکٹریاں ہیں ٹیکسٹائل ملز ہیں، اور ایسے کارخانے ہیں جو ضرورت کی ہر شے تیار کرتے ہیں، پُرتشکوہ ولیکا ملز میں مشینوں سے ایک ملین سے زیادہ جرابوں کے جوڑے ہر سال تیار کیے جاتے ہیں۔ حالانکہ یہ فرم اپنے اونی کمبلوں، سوتی کپڑے، کمخواب اور ریشمی کپڑے کے لیے مشہور ہے۔

پاکستان میں کسی جگہ بھی گھومنے نکل جایئے، ہر جگہ بکسلے پینٹس کا سائن بورڈ سب سے یہ کہتا دکھائی دے گا کہ اسے استعمال کریں۔

یہ ایک اچھی بات ہے کیونکہ ہم رنگ و روغن کے بغیر رہ بھی تو نہیں سکتے۔ یہ بے جان چیزوں کی زندگی اور چمک ہے۔ ہم دلکش رنگ والی چیزوں کیلئے بیتابی سے ہاتھ پھیلا دیتے ہیں۔ یہیں پاکستان کی اس سب سے پہلی پینٹس کمپنی کی ضرورت پڑتی ہے۔

تقسیم کے بالکل ایک سال بعد جب ابھی ملک بے شمار قلتوں سے دوچار تھا۔ خان کے خاندان کو بھی اس قلت کا احساس تھا۔ پاپا رحیم بخش خان نے اپنا پہلا پلانٹ نصب کیا۔ درحقیقت یہ پاکستان کی پہلی پینٹ فیکٹری تھی جو سندھ انڈسٹریل ٹریڈنگ اسٹیٹس کے علاقے میں بکسلے پینٹس ورکس کے نام سے قائم کی گئی۔ کچھ عرصہ کام اس قدر تسلی بخش نہیں تھا۔ لیکن سخت محنت،

ایک پیاری بیوی اور بچوں کے پاس ہر رات کو گھر آنے کے معمول کے ساتھ رحیم بخش نے اس منصوبے میں کامیابی حاصل کر ہی لی۔ اور ۱۹۵۴ء میں دوسرے پلانٹ کی بنیاد رکھ دی۔ اور پھر ۱۹۵۶ء میں مشرقی پاکستان میں چٹاگانگ میں ایک اور پلانٹ نصب کیا گیا۔

بہت سی بیرونی فرمیں بھی میدان میں تھیں لیکن بخش خان ان کے مقابلے میں نہ صرف سبقت لے گئے بلکہ پاکستان کے لئے کثیر مقدار میں زرمبادلہ بھی کمایا۔ اب اس فرم میں انڈونیشیا سوڈان، گھانا، نائیجیریا، میزالیون سے طلبہ فرم کے وظائف پر رنگ و روغن کی تکنیک کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

خان کے پانچوں لڑکے بھی بڑے ہو کر اسی کاروبار میں شامل ہو گئے۔ چوتھے لڑکے نے جو بیرسٹر ایٹ لا ہے اپنے قانونی علم کو خاندان کے لئے وقف کیا ہوا ہے۔ اس طرح کاروبار کے قانونی پہلو کے خلا کو پُر کر کے اس نے اپنے والد کو موقع بہم پہنچایا ہے کہ وہ پینٹ کی برآمد پر پوری توجہ دے سکیں۔

بکسلے فرم کے ہاں رنگ و روغن کی تحقیقات کے بارے میں بہترین ماہرین کا گروہ کام کر رہا ہے۔ ان کی لیبارٹری بے حد شاندار اور سب سے وسیع اور تکنیکی اعتبار سے ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس کے آلات و تنصیبات بلا شبہ اس علاقے میں بے مثال ہیں یہی بات انکی مشینری پر بھی صادق آتی ہے۔ قدرتی بات ہے کہ اس ساری کامیابی کے لئے باخبر ماہرین فن کی ضرورت تھی۔ چنانچہ فرم نے ایک قدم اور اٹھایا اور کیمیا دانوں کو اس فن میں مزید تربیت دی۔ ان کا دوسرا بیٹا بکسلے پینٹ کے ان تکنیکی نکات اور فن کو لے کر بیروت گیا جہاں وہ اپنے ماہرین کی مدد سے رنگ و روغن کا ایک کارخانہ قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی مرتبہ جب میں وہاں جاؤں گی تو پھر بکسلے پینٹ کا وہی مانوس نشان میرا اسی طرح خیر مقدم کرے گا۔

بہرکیف جس بات پر ان لوگوں کو بہت زیادہ ناز ہے وہ یہ کہ ان کے تیار کردہ روغن دنیا میں کسی بھی جگہ کے تیار کردہ روغنوں سے کسی طرح کم نہیں اور یہ ساری کامیابی بیرونی فنی امداد سے قطعاً بے نیاز رہ کر حاصل ہوئی ہے۔ ایک ترقی پذیر ملک کے لئے یہ ایک شاندار کامیابی ہے۔

داؤد پلانٹس میں تین ہزار سے زیادہ آدمی کام کرتے ہیں، جو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنے کام میں لگے رہتے ہیں اور ایسا سوتی کپڑا تیار کرتے ہیں۔ جو مصر اور مانچسٹر کے کپڑے کا مقابلہ کرتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں کرنافلی پیپر ملز کے علاوہ اس کمپنی کی کئی اور ٹیکسٹائل ملز بھی ہیں۔ ایچ اینڈ ایم سلک ملز میں نایاب نمونوں کی بھڑکیلی ساڑھیاں تیار ہوتی ہیں، ان کے تیار کردہ کپڑے جن کے نام ٹونکل ٹشو اور مون لائٹ ہیں، بہت مشہور و مقبول ہیں۔ کریم سلک ملز نفیس دوپٹے تیار کرتی ہے جو دیکھنے میں اتنے باریک ہیں کہ اوڑھنے والی پر جادو کر دیتے ہیں۔ دوسری مشہور فیکٹریاں باوانی وائلن ٹیکسٹائل ملز، حسین ملز، حبیب ملز وغیرہ ہیں۔ ان سب کے مالکان کراچی کے باشندے ہیں۔ جب آپ ان ملوں کی سیر کر کے باہر آئیں گے تو آپ کے ہاتھوں میں کپڑے کے نمونے ہوں گے، جو آپ کو مفت نذر کیے جائیں گے، مالکان بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں۔

ان فیکٹریوں کا تیار کردہ کپڑا زیادہ تر الفنسٹن سٹریٹ میں فروخت ہوتا ہے، جہاں خواتین کے ملبوسات تیار کرانے والے رشید نام درزی کی ایک چھوٹی سی دکان ہے جس میں کئی کاریگر بیٹھے ہیں جو کراچی کے امراء اور فلمی ستاروں کے لیے ملبوسات تیار کرتے ہیں۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ رشید کی یہ شہرت محض اس لیے ہے کہ وہ شہر کے ازحد مشہور پارچہ فروش جلال الدین کی دکان میں بیٹھا ہے، جلال الدین کی دکان میں طلائی، سیمیں اور دوسرے غیر معمولی رنگوں

کی کئی قسم کی بروکیڈ موجود ہے۔ ایسی بروکیڈ جو آپ کو صرف کسی ملکہ کے محل میں نظر آسکتی ہے۔ کراچی کے باشندے اور سیاح اپنی پسند کی بروکیڈ خریدتے ہیں، رشید درزی اس بروکیڈ کو دیدہ زیب لباس میں تبدیل کر دیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ خواتین اس کے تیار کردہ ملبوسات کو دیکھ کر مسحور ہو جاتی ہیں۔ ذرا تصور کیجیے، اگر آپ رشید سے اپنا گاؤن تیار کروائیں، تو آپ لاف زنی کر سکتے ہیں کہ یہ "ساختہ کراچی" ہے۔ باقی رہی اس کی قیمت تو یہ لندن یا نیویارک کے مقابلے میں صفر کے برابر ہے۔

ہر روز صبح سویرے دو مشہور انگریزی اخبارات کراچی سے شائع ہوتے ہیں، ایک کا نام مارننگ نیوز اور دوسرے کا ڈان ہے۔ ان کے علاوہ اور بہت سے اخبارات ہیں جو پاکستان کی ہر زبان میں شائع ہوتے ہیں، اور ہر قسم کے رسائل بھی۔ سیاح اگر چاہیں تو وطن واپس جانے سے پہلے کراچی میں اپنے نام کے ملاقاتی کارڈ بھی چھپوا سکتے ہیں۔ ساؤتھ نیپئر روڈ پر واقع چنارا پرنٹنگ پریس سے آپ ایک سو کارڈ حاصل کر سکتے ہیں، جن کا ڈیزائن اور طباعت چوبیس گھنٹوں کے اندر مکمل ہو جاتی ہے، اور جب انھیں آپ کے لیے کاغذ میں باندھا جاتا ہے تو آپ کو گنے کے رس کا ایک گلاس بھی پیش کیا جاتا ہے۔ کراچی کے لوگوں کی مہمان نوازی کی کوئی حد نہیں۔

دنیا کے سب سے بڑے اسلامی ملک کے شہری ہونے کی وجہ سے یہاں کے باشندے قدرتی مفاہمت کے جذبے سے مالا مال ہیں۔ آپ ان کے درمیان ایک غیر ملکی اور اجنبی ہونے کی وجہ سے ایک خاص شخصیت کے مالک بن جاتے ہیں۔ جن کے ساتھ ایسا سلوک کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو وطن ہی میں سمجھتا ہے۔ یقین کیجیے آپ جھنجلا کر اپنے تئیں پچھاڑ کھائیں گے جب آپ دیکھیں گے کہ آپ کے منہ سے بار بار یہی نکل رہا ہے "جب



کراچی کا ایک پھیرا

"میں کراچی میں تھا تو ——"

جب آپ علی بابا کے اس ملک سے خریدے ہوئے تحائف کے بنڈل کھول کر اپنے کمرے کے آتشدان یا دیگر مقامات پر رکھیں گے تو کراچی کے قیام کی یاد عود کر آئے گی اور آپ کی زندگی کے روزمرہ چکر میں ایک گم گشتہ روشنی کا اضافہ کر دے گی۔

تاریخی ٹھٹھہ

مغربی پاکستان میں کراچی سے چل کر سیاح کے راستے میں دوسرا مقام ٹھٹھہ آتا ہے جو اس سے کہیں زیادہ پیش کرتا ہے جتنی اس کے خاموش مقامات سے توقع ہے۔ اس کے گاؤں میں بے شمار صحت مند اور خوش لوگ رہتے ہیں، اس کی جھیلیں مچھلیوں سے بھری ہوئی ہیں اور کنول دھوپ میں جھومتے رہتے ہیں۔ شہر کی زندگی پرسکون اور سادہ ہے۔ اس کی شہرت ان لوگوں کی وجہ سے ہے جو عرصہ ہوا مر چکے ہیں اور جن کے مقبرے اور انکے گردو نواح انتہائی خوبصورتی اور لازوال شان کی یادگاریں ہیں۔ ٹھٹھہ پاکستان کے ان مقامات میں سے ہے جو ہر سیاح کے شوق کو ابھارتا ہے ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو سمجھتے ہیں کہ انھوں نے ہر عمدہ چیز دیکھ رکھی ہے۔

ٹھٹھہ کے قبرستان، مکلی پہاڑی پر عظیم الشان قدیم یادگاریں ہیں جن سے چودھویں اور اٹھارھویں صدی کے درمیان کے سندھ کی عظمت عیاں ہے۔ سنہ ۱۳۷۱ء سے سنہ ۱۷۳۹ء تک ٹھٹھہ بہت بڑا علم و تدریس کا مقام تھا۔ اس عرصہ میں چار مسلمان بادشاہوں کی پشتوں کا عروج و زوال ہوا اور سندھ کی تاریخ وقت پر منقش ہو گئی۔ سما راجپوتوں نے سنہ ۱۳۴۱ء سے سنہ ۱۵۲۰ء تک حکومت کی۔ ان کے بعد ارغون آئے اور سنہ ۱۵۲۰ء سے سنہ ۱۵۵۵ء تک برسر اقتدار رہے۔ سنہ ۱۵۵۵ء سے سنہ ۱۵۶۲ء تک عنانِ حکومت ترخانوں کے ہاتھ میں رہی۔

ان سب کے بعد دہلی کے مغل بادشاہ تھے جن کی تہذیب اور فنون ۱۷۳۹ء تک فروغ پاتے رہے۔

سارے یورپ اور ایشیا سے مشہور دانا، ماہرینِ فن، سائنس دان اور عالم فاضل یہاں جمع ہوئے اور سیاحوں اور تاجروں کے مطابق اس شہر کی روزمرّہ کی زندگی میں اسلامی تعلیمات اور علمی مباحث کو سب سے اونچا مقام حاصل تھا۔ کھڈی کی صنعت میں ایک وقت میں کم از کم چالیس ہزار لوگ ملازم تھے جو بہترین قسم کا کپڑا تیار کرتے تھے۔ اس کی بندرگاہ پوری لندن کی بندرگاہ کے برابر بڑی تھی اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے جہاز بیش قیمت سامان لے کر یہاں آئے تھے۔ جہازوں کے کپتان ٹھٹھہ کو ہندوستان کی سب سے مشہور منڈیوں میں شمار کرتے تھے۔ مغلوں کی حکومت میں اسے سونے کا شہر سمجھا جاتا تھا۔ صنعتی دولت نے اس شہر کو سماجی طور پر مکمل بنا دیا تھا اور یہاں کے صناع کار وقت کے مشہور لوگوں میں گنے جاتے تھے۔

ٹھٹھہ کا زوال ۱۷۲۹ء میں شروع ہوا (جس کی وجہ سے اس کی عظیم معیشت بھی تباہ ہو گئی) جب سندھ کا صوبہ ایران کے نادر شاہ کے حوالے کر دیا گیا۔ نادر شاہ نے اس کی حکومت میاں نور محمد کو سونپ دی جو خدا آباد منتقل ہو گیا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں ٹھٹھہ کی شان اور عظمت ماند پڑ گئی۔ یہ مقبروں کا شہر بن گیا اور اسے ترک کر دیا گیا۔

اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے ماہر فن کاروں نے یادگاروں کو محفوظ رکھنے کا کام شروع کیا ہے اور سیاح گزرے ہوئے مغل گورنروں کے مقبروں پر صناع کاری کے نازک اور انوکھے نمونے تفصیل سے دیکھ سکتا ہے وہ سنگ مرمر اور چونے کی لازوال مضبوطی کو دیکھ کر دنگ رہ جاتا ہے جو ہزارہا شتیں گزرنے کے بعد



ٹھٹھ کا دروازہ

بھی ویسا ہی کھڑا ہے۔

مقبروں کی حفاظت، ظاہری چمک دمک اور شان و شوکت اس بناوٹی جلوس سے ملتی ہے جس کے بارے میں آدمی سوچ سکتا ہے کہ رنگ برنگے جھنڈوں اور باجے کے

ساتھ نکالا گیا تھا۔ انتہائی تلاش کے باوجود مجھے اس سارے علاقہ میں گھروں اور اسکولوں کے نشانات کہیں نہ مل سکے لیکن مقبرے اس بات کی گواہی دیتے تھے کہ مغلوں کے دور میں مقبروں کو نایاب خوبصورتی کی مثال بنانے میں خرچ اور محنت کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی گئی۔ ماکلی پہاڑی کے جنوب میں، ٹھٹھہ کے چھوٹے شہر سے تقریباً میل بھر کے فاصلہ پر، مرعوب کن یادگاروں کا سلسلہ وقت کے اوراق پلٹتا ہے۔ مساجد، مقبرے، عمارات اور دروازے توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ پہاڑی پر مقبروں کا شہر ہے جہاں کنول سے لبریز تالاب ہیں جنکے کناروں پر سوسن پھیلی رہتی ہے۔

یہ ایک دہشت ناک نظارہ ہے جس سے آنے والا دنگ رہ جاتا ہے۔ یہاں کی خاموشی میں ڈرامہ ہے۔ دور تک پھیلی ہوئی جنگلی بیلوں سے ڈھکی ہوئی دیواریں آج بھی اپنے مالکوں کی قبریں چھپائے ہوئے ہیں اور ان کی پہرہ داری کر رہی ہیں۔ اپنی مناسب جگہ پر نصب ہر اینٹ رنگ اور ترتیب کا بہترین نمونہ ہے اور صدیاں گزرنے پر بھی اس مضبوطی سے قائم ہے۔ بہت سی اینٹوں کے جدا جدا ڈیزائن ہیں، بعض پر قرآنی آیات کندہ ہیں۔ اندرونی دیواریں خوبصورت پتھروں کے پتلے پتلے ٹکڑوں کی ہیں جنہیں چونے سے جوڑ کر مختلف انداز میں لگایا گیا ہے۔ ہلکے نارنجی رنگ نے اپنی گرم چمک دے دی ہے گویا سورج نے اپنی قوت سے ان میں زندگی بھر دی ہو۔

قبرستان میں اگر الٹی طرف سے چلیں تو یادگاروں کے تین خاص فریق آتے ہیں جو تاریخی سلسلہ کے مطابق ہیں۔ مغلیہ دور کی یادگاریں سب سے پہلے پڑتی ہیں۔ ان میں ازبک، تغرل بیگ، عیسیٰ خاں ترخان نعمانی، جان بابا، دیوان شرفا خاں اور نواب

امیر خاں کے خاندان کا قبرستان شامل ہے۔ دوسرے فریق میں، جو ترخان اور ارغون دور سے تعلق رکھتا ہے، عیسیٰ خاں اوّل، باقی بیگ ترخان، انسا بائی، سلطان ابراہیم، میر سلیمان اور ان کے رشتہ داروں کے مقبرے ہیں۔ تیسرا فریق، جو بالکل شمال میں ہے، سما دور سے متعلق ہے اور اس میں جان نظام الدین، مبارک خاں، ملک راجپال اور ان کے خاندانوں کے مقبرے ہیں۔

سب سے بڑی اور پرشکوہ عمارت عیسےٰ خاں ترخان ثانی کے مقبرے کی ہے جس نے ۱۶۴۴ء میں وفات پائی۔ ایک چوکور صحن کے وسط میں ایستادہ، اونچی دیوار سے گھری ہوئی یہ عمارت اندر سے گنبد دار ہے جس میں دو الگ، بڑی بڑی بالکونیاں ہیں۔ اندرونی دیواریں خوش رنگ ٹائیلوں سے بنی ہیں جن پر پھول اور رہریٹے کا کام ہے عیسےٰ نے یہ عظیم الشان مقبرہ اپنی زندگی میں ہی تعمیر کرا دیا تھا تاکہ وہ اپنی پسند کے مطابق اپنی آخری آرامگاہ بنوا سکے۔ اس کے کچھ حصّوں کے ڈیزائن بننے کے بعد بہترین معماروں کے ہاتھ کاٹ دیئے گئے، تاکہ کوئی دوسرا بادشاہ ان کی خدمات حاصل کرکے اُس کی نقل نہ بنوا سکے۔ اس دور کے بادشاہوں میں یہ رواج عام تھا۔ میرے خیال میں کھڑکیوں کی ترتیب بہترین ہے۔ اُن سے آسمان کی روشنی منعکس ہوتی ہے۔ مقبرہ اونچی چھت کی پر بنا ہوا ہے اور اس کے گرد کا ہر حصّہ امتیازی خصوصیت کا حامل ہے۔ گو یہاں سارا کام پتھروں پر کیا گیا ہے لیکن صنع کاری اس قدر لطیف اور نازک ہے گویا مہین ریشم پر کشیدہ کاری کی گئی ہو۔ یہاں خاندان کے ان گنت افراد دفن ہیں لیکن عیسےٰ کی چہیتی بیوی اپنے ایک خاص تعمیر کردہ کونے میں دفن ہے۔ ایک تنگ اور اونچا زینہ چھت کی طرف جاتا ہے۔

دو میل پرے ٹھٹھہ شہر میں سے قابلِ ذکر عمارت شاہجہان مسجد ہے جو جامعہ مسجد بھی کہلاتی ہے۔ یہ ایک صحن کے گرد بنی ہوئی ہے اور عبادت کے کمروں کا رُخ مشرق اور مغرب کی طرف ہے۔ باغ میں محرابوں پر بنی ہوئی دو بڑی بڑی گیلریاں ہیں۔ اگر محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھی جائے تو ساری مسجد میں آواز سنائی دیتی ہے۔ برصغیر ہندو پاک میں ٹائیل پر سب سے محنت کا کام اس عمارت میں ہے۔ یہاں کے نقش و نگار اس قدر خوبصورت اور نایاب ہیں کہ محکمہ تعمیرات نے ان کی خوبصورتی کو محفوظ رکھنے کے لئے ان کی نقلیں بنوالی ہیں۔ شاہجہان نے اس مسجد کا کام اپنے ابتدائی سالوں میں شروع کرایا۔ ۱۶۴۷ء میں اس کی وفات کے بعد اس کے لڑکے اورنگ زیب نے اسے تکمیل تک پہنچایا جس نے مستقبل کا خیال کرتے ہوئے مسجد کے اندر ترانوے آرام دہ حجرے تعمیر کرائے تاکہ اس کے ہزاروں رشتہ دار یہاں آرام سے ابدی نیند سو سکیں۔ مسجد کا اندرونی حصّہ سادہ اور سفید ہے۔ اور اینٹوں میں جواہرات کی طرح جڑے ہوئے چمکدار ٹائیلوں کے لئے بہترین پس منظر مہیّا کرتا ہے۔

ماکلی پہاڑی پر ہی جانی بیگ ترخان (جس نے ۱۶۰۱ء میں وفات پائی) کا مقبرہ دل میں احترام پیدا کرتا ہے۔ ترخان سندھ کا آخری خودمختار حکمران تھا جس نے اپنی آخری آرام گاہ کی تعمیر میں دلچسپی لی۔ چمکدار اور کھردری گہری نیلی اور چمکدار سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی اس عمارت پر رنگے برنگے نقش ہیں۔ خاص عمارت ہشت پہلو ہے جس کے دونوں طرف نصف گنبد نما طاقچے بنے ہوتے ہیں۔ محراب دار دروازوں پر قرآنی آیات خوبصورت سفید خط میں لکھی ہوتی ہیں۔ مقبرے کا ایک حصّہ گر چکا ہے

لیکن فصیل اب بھی قائم ہے جس سے ماکلی پہاڑی کا چھ میل کا علاقہ صاف نظر آتا ہے یہاں سمندری ہواؤں کی طرح تیز ہوا چلتی ہے۔ اوپر اڑتے ہوئے تیتر اپنے ہمجولیوں کے ساتھ میناروں پر آکر بیٹھ جاتے ہیں اور اس سنسان جگہ پر زندگی کے سہانے راگ گاتے ہیں۔ ایک اور شاندار مقبرہ عظیم جرنل مرزا بیگ کا ہے جو اورنگ زیب کی طرف سے لڑا تھا۔ یہ مقبرہ ایک بڑے پویلین کے انداز میں بنا ہوا ہے۔ اس کے سولہ پہلو محرابوں سے منقسم ہیں اور گنبد آٹھ ستونوں پر بنے ہوئے ہیں۔ مقبرے کے تمام حصوں پر بڑے بڑے کنول اور سورج مکھی کے پھول کھڑے ہیں۔ آڑھے ترچھے ٹائیل چھت کی زینت ہیں جو خمیدہ پتھروں کے ستونوں کے سہارے کھڑی ہے۔

انفرادی حیثیت رکھنے والا ایک اور مقبرہ جام نظام الدین کا ہے جسنے ۱۴۶۱ء سے ۱۵۰۹ء تک حکومت کی۔ اس کی عمارت پندرھویں صدی کے گجرات عہد سے ملتی ہے۔ تمام دیواریں، جن پر کنول کی کلیاں اور کھلے ہوتے پھول بنے ہیں، بل کھاتے ہوتے پتھروں کے حلقوں سے گھری ہوئی ہیں۔ ایک حلقہ پر خوبصورت خط میں قرآنی آیات کندہ ہیں۔ دروازے قطار میں لگائے گئے ہیں اور تمام کونوں پر چھوٹے چھوٹے مینار ہیں جو عجب نظارہ پیش کرتے ہیں۔

عمارتوں کے دوسرے فریق ہیں، جو صحنوں میں بنائی گئی ہیں، باقی بیگ ترخان اور انسا باقی کے مقبرے ہیں جن کے کئی احاطے ہیں۔ اندرونی دیواروں پر گلاب اور سورج مکھی کے پھول نقش کئے گئے ہیں۔ پتھروں پر فارسی اور عربی کے اشعار لکھے ہوئے ہیں۔

مبارک خاں، جس نے ۱۴۹۰ء میں وفات پائی، کا شاندار مقبرہ چوکور ہے اور

اونچی پیڑھی پر تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ اونچی دیواروں سے گھرا ہوا ہے جن پر ہلکے عربی نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔

جہان بابا (جسنے ۱۶۰۸ء میں انتقال کیا) کا مقبرہ عیسےٰ خاں کے مقبرہ کے نزدیک ہے۔ ابتدا میں اس کے تین گنبد تھے۔ اب صرف ایک باقی ہے جس پر مکڑی کے جالے کی طرح نازک نقش و نگار بنے ہوئے ہیں۔ ہر دیوار پر مختلف نقش ہیں جو اپنی بے عیب تفصیل کی وجہ سے توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ اس کے جنوب میں ماکلی پہاڑی کے دامن میں جھیل کے سامنے بارہ ستونوں والا برآمدہ بنا ہوا ہے۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں سما شہزادہ جام تماچی ایک غریب مچھیرن نوری کی محبت میں گرفتار رہا تھا۔ الاؤ کے گرد بیٹھ کر سندھی آج بھی یہ کہانی سناتے ہیں۔

دیوان شرفا خاں (جسنے ۱۶۳۸ء میں وفات پائی) کا مقبرہ ماکلی کا سب سے زیادہ محفوظ شدہ مقبرہ ہے۔ یہ ایک بڑی چوکور عمارت ہے جس پر ایرانی طرز کا گنبد بنا ہوا ہے۔ اس کے چاروں کونوں پر مینار ہیں جن کے اوپر جانے کے لئے زینہ بنا ہوا ہے۔ نمایاں رنگ دیواروں کے ہیں جو سرخ اور نیلی اینٹوں سے بنی ہیں۔

قبروں اور روحوں پر، جو مقبروں کے اندر یا باہر کھلے آسمان کے نیچے پڑی ہیں، اقلیدسی نقش و نگار، قرآنِ پاک کی آیات اور ادبی حیثیت کی تاریخیں لکھی ہوئی ہیں۔ سیاح ان کتبوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور طالب علموں کو پرانے سندھ کی تاریخ اور زندگی کے بارے میں بہت سا مواد ملتا ہے۔

سیّاح اور طالب علم ٹھٹھہ کو کئی وجہ سے پسند کرتے ہیں۔ اس کے گاؤں تصویروں کی طرح ہیں جن کے کردار اپنے ملک کی زندگی میں حصّہ لینے کے لئے ہنستے ہوئے فریم

سے باہر نکل آئے ہیں۔ کشادہ، ہوادار ریستوران اور چھوٹے چھوٹے ہوٹل تاجروں، کسانوں، دکانداروں اور سندھی نجومیوں کے آپس میں مل بیٹھنے کی جگہیں ہیں۔ وہ روزانہ یہاں بلاناغہ چائے پینے اور ریڈیو اور مقامی موسیقاروں کو سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ خواہ چائے خانہ کتنا کھچا کھچ بھرا ہوا کیوں نہ ہو اجنبی کے لئے میز فوراً خالی کردی جاتی ہے کیونکہ وہ معزز مہمان ہے۔ وہ یہاں گپ لگاتے ہیں، چائے پیتے ہیں اور اپنے اردگرد کی دنیا کو دیکھتے ہیں گو یہ چیزیں انہوں نے ہزاروں بار دیکھی ہوئی ہیں۔ بچے سیٹیاں بجاتے ہوئے گزرتے ہیں، بیل گاڑیاں رینگتی ہوئی چلتی ہیں، جنگلی خاردار جھاڑیاں ملبی ہوتی جاتی ہیں اور ابلتی ہوئی چائے کی تیز بو سندھ کی خوشبو بن جاتی ہے۔ ان شاندار تاریخی مقبروں سے چلنے کے بعد نیچے گاؤں میں کار روک کر چائے خانوں میں بیٹھ کر بہت لطف آتا ہے۔ آپ کو پرانی کہانیاں سننے کو ملیں گی۔ یہی وہ دیہاتی ہو سکتا ہے جس کے آباؤ اجداد نے مغل بادشاہوں کے مقبروں پر روغن کیا تھا۔ دوسرا آدمی زراعت (جو ٹھٹھ کی معیشت کا خاص ذریعہ ہے) سے متعلق ہو سکتا ہے جس کے باپ دادا نے شاہی ضیافتوں کی زینت کے لئے بہترین پھل اور سبزیاں پیدا کیں۔ یہاں آپ بڑھیوں اور معماروں سے ملیں گے جو آپ کو کہانیاں سنائیں گے کہ کس طرح خاندانی مقبروں پر نقش و نگار بنانے کے بعد اس مشقت طلب کام کرنے والوں کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے۔ یہ اس لئے کیا جاتا تھا کہ کوئی دوسرا بادشاہ ان کی خدمات حاصل کرکے اس طرح کا ڈیزائن نہ بنوا سکے۔ ان بیتے دنوں میں زندگی خوشی، دکھ، جبر اور ذات پرستی کا مجموعہ تھی۔

ٹھٹھ کے باہر مشہور کانجھر اور سنہری جھیلوں میں تیراکی اور مچھلی پکڑنے کا لطف

اٹھایا جا سکتا ہے۔ سیاح محکمہ تعمیرات کے بنگلوں میں ٹھہر سکتے ہیں۔ پانچ میل دور پٹھان کے مقام پر گھاٹ ہے۔ مسافروں اور سامان سے لدی ہوئی کشتیاں دن میں دوبارہ اس کے پار سجاول جاتی ہیں۔ گاؤں کے ساتھ گذرتا ہوا یہ سفر بہت خوبصورت ہے۔ واپسی پر پہاڑیوں پر بنے ہوئے مقبرے بآسانی نظر آتے ہیں۔ تھوڑے ہی فاصلہ پر ایک ہسپتال تعمیر کیا گیا ہے۔ زیادہ سیاحوں کی رہائش کے لئے نئے ڈاک بنگلے بنائے جا رہے ہیں

ٹھٹھہ کراچی کے مشرق میں اکسٹھ میل دور قومی شاہراہ پر واقع ہے جو حیدر آباد کو جاتی ہے۔ ڈیڑھ گھنٹہ کا راستہ ہے جو کار کے ذریعے طے ہو سکتا ہے یا ریل سے جو تیرہ میل دور جنگ شاہی کے اسٹیشن پر ٹھٹھہ جانے والی سیدھی بس سے ملتی ہے۔ ٹھٹھہ کے گرد و نواح میں محکمہ آثارِ قدیمہ کے ریسٹ ہاؤس (جس کی اجازت کراچی میں آثارِ قدیمہ کے دفتر سے لینی پڑتی ہے) یا محکمہ تعمیرات کے بنگلوں میں ٹھہرا جا سکتا ہے۔ دونوں جگہوں پر جدید سہولتیں مہیا ہیں اور اچھے ملازم خدمت کے لئے مقرر ہیں۔ کرایہ بے حد سستا ہے۔

شہری زندگی سے خوشگوار تبدیلی اور رومان پرور تاریخی پسِ منظر کے لئے ٹھٹھہ بہترین جواب ہے۔

ترقی کی طرف گامزن حیدر آباد

یہ قدیم مقام آج کا شاندار مستقبل رکھنے والا شہر ہے جہاں لوگوں کو بے شمار شعبوں میں ملازمت کے مواقع حاصل ہیں۔ نو وارد نئے حیدر آباد کی چمک دمک دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں اور مقامی لوگوں کے خلوص کی گرمی ہمیشہ ان کے دل میں تازہ رہتی ہے۔ ترقی کے باوجود اس خلوص میں آج بھی فرق نہیں آیا۔ حیدر آباد جو سرکاری طور پر سابقہ سندھ کا علاقہ ہے، بڑی آرام دہ جگہ ہے کیونکہ یہاں کا طرز زندگی بڑا سادہ ہے۔

یہاں کے لوگ صدہا سال سے لاابالی رہے ہیں جنہیں اپنی روزمرہ زندگی سے پورا پورا لطف اٹھانے کا شوق ہے۔ خود کفیل اور امیر وادیٔ سندھ میں فصلوں کے درمیان انہیں میلے اور تہوار منانے کے لیے کافی وقت مل جاتا ہے یہ لوگ آداب مجلس کو بہت اہمیت دیتے ہیں اس علاقے کے بہت سے نغمے عید اور دوسرے مذہبی تہواروں کے موقعوں کے لیے مرتب کیے گئے ہیں۔

حیدر آباد کے سندھی بڑے سیدھے سادھے لوگ ہیں جن میں مہمان نوازی، بلند خیالی اور روشن خیالی کوٹ کوٹ کر بھری ہے ان کے پیشے بھی عام سے ہیں اور سندھی دیہاتی صرف وطن کا فرزند ہی نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں اس سے والہانہ عشق کرتا ہے، اسے اپنے گھر سے اس قدر محبت ہے کہ وہ شاذ و نادر ہی دوسرے گاؤں جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی گاؤں میں ہی بسر کرنی پسند کرتا ہے اور گاؤں سے اسے

بے پناہ عقیدت ہے اپنے مخصوص انداز میں وہ لوگوں کو اچنبھے میں ڈال دے گا اور انہیں یہ باور کرانے کی کوشش کریگا کہ گو زندگی ایک ٹھوس حقیقت ہے لیکن آرام اور تفریح بھی اس کے اہم حصّے ہیں۔

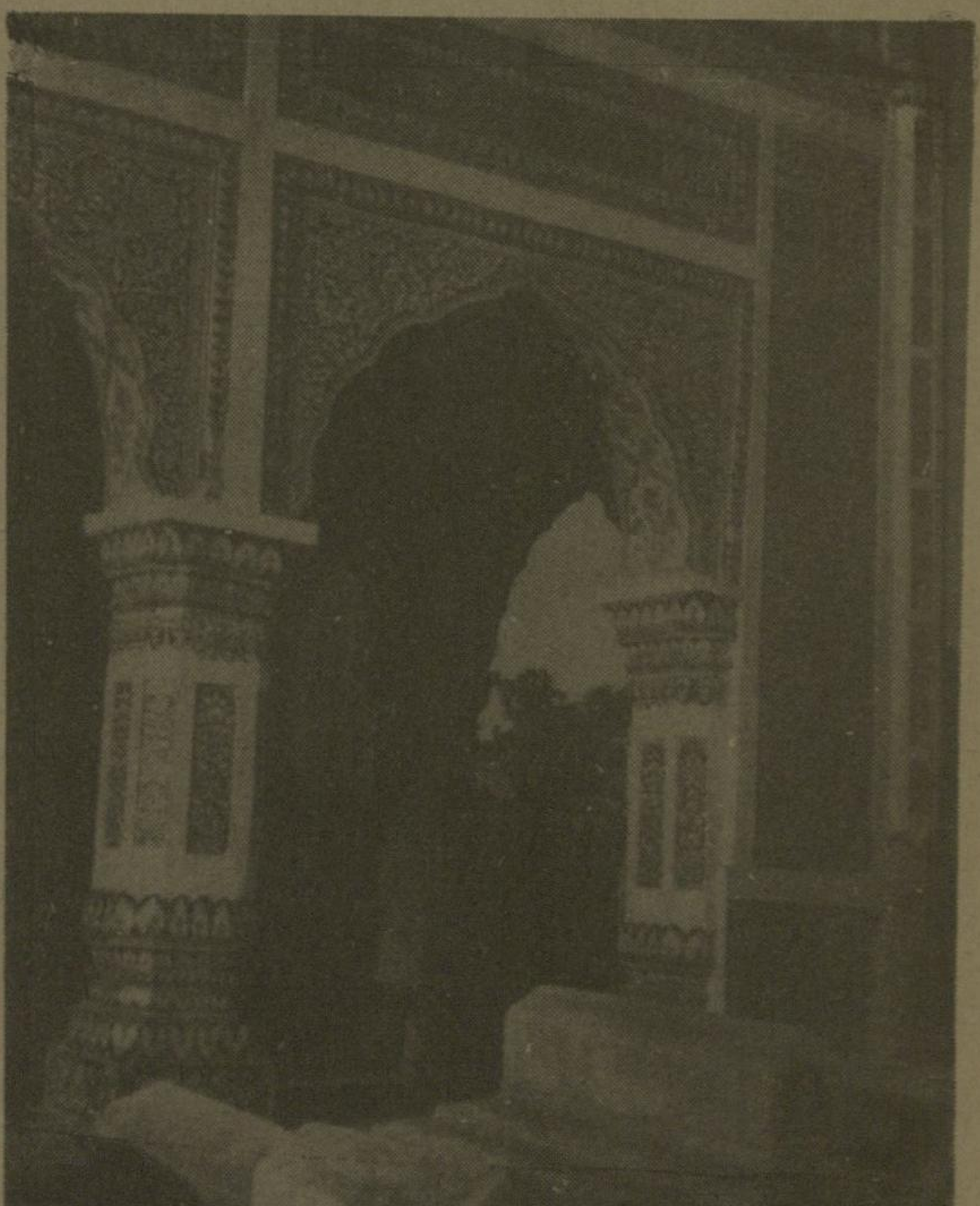
سیاح کے لیے حیدر آباد میں بہت سی تعجب خیز چیزیں ہیں۔ بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ کراچی اور لاہور کے بعد حیدر آباد تیسرا بڑا شہر ہے، جہاں بے شمار دیکھنے والے مقامات ہیں۔ یہ شاعروں اور موسیقاروں کے ملنے کا مقام ہے۔ یہاں تاریخی مقبرے اور ایک مشہور قلعہ ہے۔ قلعہ کے سنگ بنیاد پر یہ الفاظ لکھے ہوئے ہیں ؎

"اے خدا! اس شہر میں امن قائم رکھ"

سیاح قلعہ سے بہت متاثر ہوتے ہیں، انہیں یہاں کی بیشمار صنعتیں، قیمتی ریشم، چمڑے کا خوب صورت سامان، پتھّر کا کام اور متبرک ٹائیل (جو گھر لے جاکر خاص کونے میں رکھا جا سکتا ہے) بھی انہیں متاثر کرتی ہیں۔ ان چیزوں کے بالکل برعکس یہاں کے کارخانوں سے سیمنٹ کی مضبوط چادریں ایسے نکلتی ہیں، جیسے نلکے سے پانی۔ فوٹو گرافی سے شوق رکھنے والوں کے لیے چمکدار اینٹوں والی عمارات اور منقش دیواروں والا یہ شہر بہت خوبصورت تقابل پیش کرتا ہے۔ اس اہم شہر کی آبادی پانچ لاکھ ہے۔

خواہ وہ کسان، دکاندار اور تاجر ہوں یا کلرک، طالب علم ہوں یا ملازم، ہر شخص اپنے طرزِ زندگی سے پوری طرح لطف اٹھاتا ہے یہ خوش باش لوگ ہیں اور وہ اپنے گرد و پیش سے پوری طرح مطمئن بھی۔

حیدر آباد کی صنعت نفیس پارچات، نایاب ڈیزائن کے کپڑے اونٹ اور گھوڑوں کی کاٹھیوں کے لیے دیدہ زیب کشیدہ کاری کا کام اور گھریلو اور صنعتی استعمال کے لیے



شاہ عبد اللطیف بھٹائی

تعمیراتی سامان پر مشتمل ہے دور دراز کے علاقوں میں گانڈن، پالہ، جرکی، کھنگو اور گوجر مچھلیاں پائی جاتی ہیں جنہیں نہروں سے پکڑا جاتا ہے ان میں سے پالہ مچھلی زیریں وادیٔ سندھ کی معیشت کے لیے کافی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعے تقریباً دس ہزار مچھیروں کو روزگار ملتا ہے حیدرآباد اور بخیر پور ڈویژن میں موسم کے دوران روزانہ ایک لاکھ سے اوپر مچھلیاں پکڑی جاتی ہیں۔ مچھلیاں سمندر سے دریائے سندھ میں آجاتی ہیں اور مون سون کے دوران تیرتی ہوئی نیچے سکھر بیراج تک چلی جاتی ہیں۔ جنگلوں میں لومڑیاں، بھیڑیے، ہرن اور جنگلی سور عام ملتے ہیں۔ شکار کھیلے جانے والے پرندوں میں مرغابی، بطخ، بٹیر اور تیتر کی بہتات ہے۔ حیدرآباد کے خاص درخت بابل، بہر، نیم، بہان، جنڈی اور ٹالی ہیں۔ یہاں کونے کونے میں پھول کھلے ہوتے ہیں۔ حیدرآباد سچ مچ پھولوں کا شہر ہے۔

دیہاتی زندگی سندھی معاشرہ میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اقتصادی فلاح محنت سے پیدا کی جاتی ہے۔ زراعت، گھریلو صنعتیں اور مویشی پالنا ان کی زندگی کا اہم حصہ اور ذریعہ معاش ہیں۔ یہی ان کے سوچنے، اقدار اور رویہ کا ذریعہ ہے، جسے وہ دیانت داری، سادگی اور عزت سے پورا کرتے ہیں، سندھ کا دیہاتی دھرتی کا بیٹا ہے، وہ اس سے عشق کرتا ہے، اور اپنے گاؤں کی اس کے دل میں اس قدر محبت ہے کہ وہ اپنے پیدائشی مقام سے شاذونادر ہی نکلتا ہے۔ اس کا دیہاتی معاشرہ ماحول سے بالکل منطبق ہے۔ اسی سے اس کی زبان ظہور میں آئی ہے۔ جس میں نغموں اور گانوں کا عظیم ذخیرہ ہے۔ برصغیر میں اس سے زیادہ سماجی مشاہدہ کی مثال نہیں ملتی۔ سندھیوں کی بات چیت الفاظ کا ناقابلِ یقین ذخیرہ اور جن لوگوں نے اس کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ کھیتی باڑی اونٹ اور بھیڑ بکریوں کے پالنے سے معاشرہ اور لوگوں پر کس حد تک اثر ڈالا ہے۔

حیدر آباد پہ صدیوں اتنے میروں نے حکومت کی ہے کہ اسے آج بھی "میروں کی جنت" کہا جاتا ہے۔ ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ اس کے گرد و نواح میں لاتعداد صوفی رہتے ہیں۔ صوفی بڑے زاہد و عابد مذہبی لوگ ہیں جن کے پاس گاؤں والے اپنی مشکلات لے کر جاتے ہیں۔ سیاحوں کو صوفیوں اور سندھیوں میں بہت سی دلچسپ تقابل نظر آتے ہیں۔ صوفیوں کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ مستقبل کا حال بتاتے ہیں اور ان کی ہر جگہ بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ جب وہ کراچی جاتے ہیں تو چند روپیہ لے کر پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ وہ حیرت انگیز طور پر درست ثابت ہوئی ہیں۔ جو لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں وہ بھی آخر اپنے بارے میں خوشخبری سن کر دنگ رہ جاتے ہیں۔

دس صدی قبل سندھ کے لوگوں میں یہی کلچر پھیلا ہوا تھا، زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ پرورش پاتا رہا ہے۔ عربوں کی فتح سے پہلے حیدر آباد نران کوٹ کے نام سے آباد تھا۔ نران اُس پہاڑی کا قدیم نام ہے، جس پر قلعہ تعمیر کیا گیا۔ ابتدا میں یہ مقام نران ٹکیر جو کوٹ کہلاتا تھا اور نرون پہاڑی کے قلعہ کے نام سے مشہور تھا، اس کے ارد گرد خوبصورت باغات اور چراگاہیں تھیں، اس زمانہ میں پرانا مہران دریا (دریائے سندھ) اس کے مشرق میں بہتا تھا۔ ۷۱۲ھ میں نوجوان عرب جنرل محمد بن قاسم کے سندھ پر حملے کے وقت قلعہ بدھوں کے قبضہ میں تھا، جن کے میسوپوٹیمیا کے گورنر سے دوستانہ تعلقات تھے، محمد بن قاسم کے عدل کی تعریف سُن کر بدھوں نے اس کے آنے پر خود ہتھیار ڈال دیے۔ تالپور، سید، پیر اور میر ضلع کے ممتاز خاندان تھے۔ میر عموماً تالپور کہلاتے تھے۔ یہ بلوچوں کی اولاد میں سے ہیں۔ کلہوڑوں کی پوری فوج بلوچیوں پر مشتمل تھی فوج کی کامیاب بغاوت کے بعد سندھ کی عنانِ حکومت میر تالپوروں کے ہاتھ میں آگئی اور کلہوڑے بالکل ختم کر دیے گئے۔ بعد میں آنے والی پشتوں میں بھی مسلمان حیدر آباد پر قابض رہے ۱۷۵۸ء میں سندھ نے اپنا رُخ بدلا جس سے کلہوڑوں کے پرانے دارالحکومت اور ردادو ضلع کی جھونپڑیوں

میں، جو دریا کے دائیں کنارے آباد تھیں، سیلاب آگیا۔

غلام شاہ کلہورا، جو اس وقت علاقہ کا حکمران تھا، نے دریا کو رُخ بدلتے دیکھ کر قلعہ والی پہاڑی کو اپنے دارالحکومت کے لیے مناسب ترین مقام سمجھا۔ اس انتخاب کے بعد اس نے چھتیس ایکڑ زمین پر اینٹوں کا شاندار قلعہ تعمیر کرایا۔ اس کے بعد اس نے شہر کا نام نِران کوٹ سے بدل کر حیدر آباد رکھ دیا۔ یہ نام حضرت امام علی رضؓ کے اعزاز میں رکھا گیا، جو "حیدر" کے نام سے مشہور تھے، غلام شاہ کلہورا ۱۷۷۲ء میں فوت ہُوا۔ اور حیدر آباد میں دفن ہُوا۔ ۱۷۸۳ء میں تالپوروں نے اس کے خاندان کا تختہ اُلٹ دیا۔

حیدر آباد کے چائے خانوں میں سیاح خوش اور تفریح پسند سندھیوں سے بآسانی مِل سکتے ہیں۔ انھیں فوراً ہی مختلف مشاغل میں شرکت کی دعوت دی جائے گی۔ سندھی شکار کے شوقین ہیں یہاں مور، کبوتر، فاختائیں، مرغابیاں، جنگلی ہنس، چھوٹی بطخیں، بٹیرے اور پلور بکثرت ہیں، جن کے شکار کی عام اجازت ہے۔ دریا کے کنارے رہنے والے موہن قبائل اور دوسرے سندھی آبی جانوروں کے شکار کے لیے بندوق استعمال نہیں کرتے اور انھوں نے لکڑی پھینکنے، بھالے، دام ڈالنے اور پانی سے بطخ پکڑنے کے اپنے طریقے ایجاد کر رکھے ہیں، شور مچانے سے بھی کام لیا جاتا ہے، اور یہ کام بڑی مہارت سے کیا جاتا ہے۔ سندھی زبان میں اس مشکل کھیل کے لیے بہت سے مخصوص الفاظ ہیں، اور ذرا ہی دیر میں سیاح بھی انھیں جوش و خروش سے دہرانے لگتا ہے۔ گھوڑے کی سواری بھی بہت پُرلطف ہے، سندھی شہ سوار گھوڑے ایک مخصوص انداز میں چلاتے ہیں، جو ناہموار زمین کے لیے نہایت موزوں ہے۔

براڈوے کے گانے کی طرح، سیاح سندھی گھوڑے کی دوگامہ چال دیکھ کر مسکرا اٹھتے ہیں، وہ کہتے ہیں" ہم دوگامہ چال دیکھنا چاہتے ہیں "۔ وہ ماہر سندھیوں کی حیران کن شہ سواری



ٹوپیاں ـــــ حیدرآباد کی خاص دست کاری

دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں، جو بغیر کاٹھیوں کے گھوڑوں پر کرتب دکھا سکتے ہیں۔ یہ فن آج بھی حیدرآباد کا خاصہ ہیں، اونٹوں اور گھوڑوں کی دوڑ اس قدر مقبول ہے کہ اس پر شرطیں لگتی ہیں۔ میدان میں مرغوں اور کبوتروں کی لڑائی پر بہت بھاری شرطیں لگتی ہیں، دوسری طرف پتنگ بازی جوان اور بوڑھوں میں یکساں مقبول ہے۔ آج بھی چند گھنٹوں کے اندر اندر کشتی دیکھنے کے لیے بہت بڑا مجمع اکٹھا کیا جا سکتا ہے، اور تماشبین ہر لمحے زور شور سے تالیاں بجاتے ہیں، دوسری تفریحات میں شطرنج، ڈانس، تاش اور مختلف جوئے کے کھیل شامل ہیں، جن میں عورتیں نہایت مشاق ہیں۔

سندھ کے عوامی ناچوں میں زبردست تنوع ہے۔ بعض ناچ اس قدر مشکل ہیں کہ انھیں کافی مشق کے بعد سیکھا جا سکتا ہے، لوگ عوامی ناچوں کے رسیا ہیں۔ دیہاتی لوگ میلوں تہواروں اور دعوتوں پر جمع ہوتے ہیں، جو خالص سندھی انداز میں ہوتے ہیں۔ یہ ناچ مقامی موسیقی کی دھن پر ہوتے ہیں، جو بین، ڈھول اور رجیرے پر بجائی جاتی ہے۔ یہ لوگ ڈھول کے طور پر بڑے بڑے مٹکوں کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ دل بہلانے کے یہ سیدھے سادے طریقے تمام کسانوں کو خوش کرتے ہیں۔ سندھ میں موسیقی کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ برصغیر میں اسلامی کلچر کا یہی وہ پہلا مقام تھا، جہاں خوشی کے موقعوں کے لیے مسرت وانبساط کے نغمے پھیلے۔ کیونکہ جغرافیائی طور سے یہ لوگ باقی حصّے سے الگ تھلگ تھے، لہٰذا انھوں نے مقامی موسیقی کو ترقی دی، جو اسلامی عہد کے ساتھ ساتھ شروع ہوئی۔ صدیوں قبل محمد بن قاسم کا پورے ساز ینے سے استقبال کیا گیا تھا۔ تاریخ کے اوراق پلٹنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی سندھ کے سامن لوگوں نے محمد بن قاسم کا بہت زور شور سے رقاصوں اور ڈھول کی موسیقی سے استقبال کیا، جو شادیوں اور دوسرے خوشی کے موقعوں پر بجائی جاتی ہے۔ قاسم اس شاندار استقبال سے اس قدر متاثر ہوا کہ عرصہ تک اس کا چرچا رہا۔ یہی موسیقی آج بھی چلی آتی ہے، اور ایسی ہی تقریبات اور رسومات پر بجائی جاتی ہے۔ گو حیدرآباد کے ہوٹلوں میں کیبرے ڈانس نہیں ہوتا۔ لیکن سیاحوں کی درخواست پر رقص وسرود کی محفلیں اکثر گرم ہوتی ہیں۔

حیدرآباد کے مکانات بحید دلچسپ ہیں، بیشتر مکانات پتھر کے ہیں، اور جنوب کی جانب بنے ہیں، جس طرف سے گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ کمروں میں ٹھنڈی ہوا حاصل کرنے کا یہ ان کا انفرادی طریقہ ہے۔ کمرے کی چھت پر لکڑی اور پلاسٹر کے بادگش بنائے جاتے ہیں، اوپر جنوب اور مغرب کی جانب کا حصہ کھلا رکھا جاتا ہے، جو ہوا کو کھینچتا

ہے۔ اور اس طرح ہوا خود بخود نیچے کھلے ہوئے راستے کے ذریعے کمرے میں داخل ہوتی رہتی ہے۔ گرمیوں کے جھلسانے والے دنوں میں بادکش لوگوں کے لیے ایک نعمت ہیں۔ سردیوں میں لکڑی کے تختے سے چھت کا راستہ بند کر دیا جاتا ہے۔ ۱۹۴۷ء سے لے کر اب تک بہت سی نئی آبادیاں پھیل گئی ہیں، جن کو سیاح دیکھنا پسند کریں گے۔ مثلاً جنوب میں شاہ لطیف آباد کالونی، مشرق میں صنعتی علاقہ اور حیدر آباد شہر کے شمال مغرب میں جام شورو۔ یہاں تمام مکانات بادکش بنے ہوئے ہیں، پرانے زمانے کی جھلک لیے ہوئے ان نئی آبادیوں کی تعمیر سے حیدر آباد کا رقبہ پھیل گیا ہے، اور خوب صورتی میں بھی اضافہ ہو گیا ہے شاہ لطیف آباد کی طرف سے بائیں سڑک سے جب سیاح حیدر آباد پہنچتا ہے تو ایک الگ پہاڑی پر پرانا قلعہ اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ یہ قلعہ کلہوڑوں نے بنوایا تھا۔ اس کے اندر ایک مقبرہ ہے۔ جس پر نیلے ٹائیلوں کا کام ہے، جسے سیاح بے حد پسند کرتے ہیں۔

علاقہ کے دوسرے شہر دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ نیا ہالہ ۱۸۰۰ء کے لگ بھگ مخدوم میر محمدؒ نے تعمیر کرایا تھا۔ کیونکہ پرانے ہالہ کو، جو اس سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔ اس وقت دریائے سندھ سے خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ ہالہ میں دیکھنے والی چیزیں دو مقبرے اور ایک مسجد ہے۔ یہ خانقاہیں مشہور صوفی پیر مخدوم نوح کی یاد میں ہیں، جو ۱۵۰۵ء میں پیدا ہوئے اور ستاسی ۸۷ سال کی عمر میں وفات پائی۔ یہاں سال میں دو بار مارچ اور اکتوبر میں میلہ منعقد ہوتا ہے جس میں سندھ کے کونے کونے سے ہزاروں لوگ آکر پیر کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہیں۔ اس مقبرہ کا سنگِ بنیاد ۱۷۹۵ء میں مخدوم محمد زماں نے رکھا اور اسی سال میر فتح علی تالپور نے اس پر گنبد تعمیر کرایا۔ مقبرے کے



حیدرآباد کی بادگیروں والی عمارات

شمال میں ایک خوب صورت مسجد ہے جو ۱۸۰۱ء میں تعمیر ہوئی۔ لوگ یہاں آج بھی نماز ادا کرتے ہیں۔ ہالہ سفالی کے برتنوں کے لیے مشہور ہے۔ ہالہ کے مشرق میں چار میل دور بھٹ شاہ ہے۔ تمام سندھی اس چھوٹے سے گاؤں کو بہت متبرک سمجھتے ہیں۔ کیونکہ یہاں پر مشہور شاعر اور صوفی شاہ عبدل لطیف کا مزار ہے، جو یہاں رہے، اسلامی اصولوں کی تعلیم دی اور یہیں وفات پائی۔ مقبرہ پر ۱۱۶۷ء کی تاریخ کندہ ہے جو قریب قریب ان کی وفات کی تاریخ ہے۔ یہ مقبرہ اینٹوں سے بنا ہے اور بنیاد پتھر کی ہے۔ فرش پر چمکدار ٹائیلوں کا کام ہے۔ اس کے نزدیک دو اور پیروں کے مقبرے ہیں جو ۱۲۳۱ء اور

۱۳۱۸ء میں تعمیر ہوئے۔ یہاں ہر سال صفر کے مہینے میں میلہ ہوتا ہے جو تین روز چلتا ہے۔ اس میں ہزار ہا سندھی اور سیاح شرکت کرتے ہیں۔ میلہ کے زمانہ میں ہر سال ادبی محفل بھی منعقد ہوتی ہے۔ سیاحوں کی آسانی کے لیے یہاں ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس اور ثقافتی مرکز بھی تعمیر کیا گیا ہے۔

بدین ایک اور دیکھنے والا گاؤں ہے۔ جس میں سکول، ہسپتال اور ٹاؤن کمیٹی ہے اس کی بُنیاد ایک ہندو نے ڈالی تھی۔ افغان جنرل مدد خاں نے اسے بالکل برباد کر دیا۔ اور تقریباً ڈھائی سو سال قبل شاہ بدین قادری نے اس کی دوبارہ تعمیر کی جس کے نام سے یہ چھوٹا سا شہر منسوب ہے۔ اس کے اعزاز میں ہر سال اکتوبر میں یہاں بہت بڑا میلہ ہوتا ہے۔ جس میں تقریباً پندرہ ہزار لوگ شرکت کرتے ہیں۔ اس کی حیثیت موسمی تہوار کی سی ہے۔ ایک اور میلہ بلاری میں منعقد ہوتا ہے جہاں تقریباً ایک لاکھ روپیہ کی مالیت کا ریشمی کپڑا اور روپہلی اور سُنہری کام کیا ہُوا سامان فروخت ہوتا ہے۔ یہاں دیکھنے کی خاص چیز مشہور شاعر شاہ کریم کا مقبرہ ہے۔ اس نے ۱۶۲۲ء میں وفات پائی۔ حیدر آباد میں میروں کے مقبرے اہم تاریخی عمارتیں ہیں، شہر کے شمال میں یہ خوبصورت مقبرے اس وقت کے حکمران کلہوروں نے بنوائے تھے جنہیں بعد میں تالپوروں نے شکست دی۔ تالپور عہد میں مقبروں کی طرف کسی نے توجہ نہ دی اور وہ خراب ہو گئے۔ پہلا مقبرہ، جو غلام شاہ کلہورا کا ہے، بالکل کھنڈر ہو کر رہ گیا۔ بعد میں اس کی مُرمت ہوئی اور تقریباً پرانی شکل دے دی گئی۔ برطانوی دَور کے بعد تالپوروں نے اپنی زندگی میں ہی (جس کا رواج اس زمانے میں عام تھا) اپنے مقبرے تعمیر کرائے لیکن یہ کلہوروں کے مقبروں کے مقابلے میں نچلے درجے پر آتے ہیں۔ سب سے پرانا دیکھنے والا مقبرہ چار یار کا ہے جسے نے ۱۸۱۲ء میں خود

اس کی تعمیر کروائی اور ایک ایک پتھر اپنے سامنے لگوایا۔

بعد کے میر یہاں کے معزز خاندان بن گئے۔ بوچیوں کی نسل سے تعلق رکھنے والے یہ میر بہت طاقتور تھے اور اپنی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہونے دیتے تھے۔ ان کی قوت بہت زیادہ تھی اور اس دور میں سارے کلہوڑوں کو ختم کر دیا گیا۔ بہر حال، ان کے زمانہ میں کلچر کو فروغ ہُوا جو فرعونوں کے دور کی تہذیب سے لگا کھاتا تھا اور یونانی، ترکی اور ایرانی کلچر سے مشابہہ تھا۔ اس خطوط سے ترقّی ہوئی اور علاقائی طاقت پیدا ہوئی جو تمام سندھیوں کا نشانِ امتیاز ہے۔

آج کا حیدر آباد طمانیت کی تصویر پیش کرتا ہے۔ ترقّی کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔ عظیم الشان غلام محمّد بیراج، جس کا افتتاح مارچ ۱۹۵۵ء میں ہُوا، شہر کے مشرق میں ہے۔ یہ تین سو فٹ لمبا ہے اور اس میں آٹھ لاکھ چھہتّر ہزار کیوسک پانی کا نکاس ہو سکتا ہے۔ اس میں چوالیس پشتے ہیں جن میں ہر ایک کا فاصلہ ساٹھ فٹ ہے اور اس کے دروازے اکیس فٹ گہرے ہیں۔ دریا کی ٹریفک میں آسانی کے لیے بیراج میں مقفل راستہ بنایا گیا ہے اور کشتیوں کو گزارنے کے لیے سڑک کے پل کا تھوڑا سا حصّہ اوپر اٹھ جاتا ہے چار بڑی نہریں دادو، حیدر آباد اور ٹھٹھہ کی زمینوں کو سیراب کرتی ہیں۔ ان علاقوں میں زمین کی زرخیزی اسی بیراج کا عظیم کارنامہ ہے۔ بیراج کی تعمیر سے پہلے یہاں پیداوار بہت کم تھی۔ اس پروجیکٹ میں پانی کے اخراج کا انتظام سیم اور تھور کو روکنے کا طریقہ اور دریائے سندھ پر سجاول کے مقام پر نیا پل شامل ہے۔ اس پروجیکٹ نے حیدر آباد کی صنعتی زندگی کو بہت مدد دی ہے۔ اس کی وجہ سے مویشی اور تحقیقاتی فارم، مچھلیوں کے فارم اور پانی کے تالاب بنے۔ یہاں سکول گھریلو صنعتیں اور گھارو، جھمپور، ہالیجی، ڈھانڈ، ٹھٹھہ،

کالری جھیل اور کوٹڑی کے مقام پر نہایت آرام دہ سیاحوں کے مرکز ہیں۔ یہ مرکز ریلوے لائن کے ساتھ ہیں اور آمدورفت کی آسانیاں مُیسّر ہیں۔ درحقیقت غلام محمد بیراج محض دیکھنے کی چیز ہی نہیں ہے بلکہ اس کے بیشمار فوائد ہیں۔ یہ ایک وسیع علاقہ ہے۔ جہاں بیسویں صدی کی تمام آسائشیں انسان کی خدمت کے لیے مہیّا کردی گئی ہیں۔ انجنیئری سے دلچسپی نہ رکھنے والے لوگ بھی اسے دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے ہیں۔

حیدر آباد کی سڑکوں پر دو رویہ اُونچے اُونچے درخت ہیں جو گرمی کے دنوں میں سایہ مہیّا کرتے ہیں' قومی شاہراہ کراچی سے سیدھی آتی ہے اور ٹھنڈی سڑک (مال روڈ) نہایت کشادہ اور خوبصورت ہے۔ کراچی کی نسبت یہاں رطوبت کم ہے اور سمندر کی تازہ اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے۔ سردی زیادہ شدّت کی نہیں ہوتی۔ سیّاح لوگ تجارتی مرکز شاہی بازار کو بہت پسند کرتے ہیں جہاں کرامت گھنٹہ گھر ہے۔ یہاں بیشمار بازار اور خوب صُورت عمارتیں ہیں۔ تجارت کا خاص سامان روئی، گندم اور بنولے ہیں۔ بازاروں میں چالیئے، نمک اور دوسری اشیائے خوردنی ملتی ہیں۔ حیدر آباد اپنی گلاس کی صنعت اور ایسبٹاس فیکٹری کے لیے مشہور ہے۔ داوا ایسبٹاس سیمنٹ پلانٹ بہت بڑا، بالکل جدید اور دیکھنے کی چیز ہے۔ چھتیں بنتی ہوئی دیکھ کر آپ کو بمشکل یقین آئے گا۔ ان کے بننے کا طریقہ دیکھنے والا ہے۔ سفالی کے برتن، عمدہ دریاں، ہالہ کے برتن، ٹرنک، ظروف' پھول دان اور رنگ برنگا کئی قسم کا فرنیچر کا سامان ان چند گھریلو صنعتوں میں سے ہیں' جو حال ہی میں شروع ہوئی ہیں' اور مُلک کے کونے کونے سے آنے والوں کو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو جاتی ہیں سیّاحوں کو روزمرّہ کے استعمال کی یہ چیزیں اس قدر دل کش لگتی ہیں کہ وہ ارادہ سے زیادہ خرید لیتے ہیں۔ یہاں کپڑے کے چھ کارخانے ہیں جن کا خوبصورت مال سارے مُلک میں فروخت

ہوتا ہے ۔ یہ کارخانے مہر ٹیکسٹائلز، فتح ٹیکسٹائلز، سلور کوٹن ٹیکسٹائلز، محمدی ٹیکسٹائلز اور فضل گلزار ٹیکسٹائلز ہیں یہ پرُخلوص لوگ اپنی مصروفیت میں سے وقت نکال کر سیاحوں کو کارخانے دکھائیں گے تاکہ وہ ان کی کارکردگی دیکھ سکیں ۔ ٹنڈو محمد خاں کے فوجی شوگر مل میں اب اعلیٰ درجے کی چینی کثیر مقدار میں تیار ہوتی ہے ۔ سندھ صنعتی علاقے میں بیشتر صنعتی ادارے قائم ہیں ۔

حیدرآباد میں بے شمار ہوٹل ہیں جہاں سیاحوں کو اچھا کھانا، صاف ستھرے کمرے اور عمدہ سروس ملتی ہے ۔ رٹز اور ہوٹل انڈس بہت نفیس ہیں ۔ یہ شہر کے وسط میں مال روڈ پر واقع ہیں اور کرایہ بالترتیب بیس اور تیس روپیہ یومیہ ہے ۔ فردوس سیدھا سادھا لیکن عمدہ ہوٹل ہے ۔ یہاں ایک دن کا کرایہ تمام اخراجات ملا کر بیس روپیہ ہے ۔ سب سے اچھا ہوٹل اور ریسٹ ہے جو حال ہی میں کھلا ہے ۔ یہ جدید ترین آسائشوں سے مزین، نہایت آراستہ پیراستہ اور ایر کنڈیشنڈ ہے سامان آرائش کی دکانیں اور سہولتیں حیدرآباد کی روز افزوں ترقی کے مطابق ہیں ۔ حیدرآباد فلٹریشن پلانٹ (FILTRATION PLANT) پر بجا طور پر فخر کرتا ہے جو دو سال ہوئے تعمیر ہوا ہے دیہات میں کنوؤں کا پانی صاف شفاف اور میٹھا ہے جب یہ دستیاب نہ ہو تو پانی کے تالاب بنا لیے جاتے ہیں ۔ جن میں صاف پانی ہمیشہ جھلمل جھلمل کرتا رہتا ہے ۔

یہاں کافی سینما ہیں، جن میں مقامی اور غیر ملکی فلمیں چلتی ہیں ۔ فردوس اور میجسٹک بہت شاندار ہیں، یہاں کلب بھی ہیں، جہاں سیاح، اگر وہ زیادہ عرصہ قیام کریں اعزازی ممبر بن سکتے ہیں ۔ حیدرآباد میونسپل باغ میں بیس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے ۔ یہ اسٹیڈیم کے ساتھ ہے ۔ جہاں تمام تقریبات ہوتی ہیں ۔ شہر کے دوسرے پارکوں اور باغوں

میں پھولوں کے تختے ہیں، جہاں سیر اور خرید و فروخت کے درمیان آرام کیا جا سکتا ہے۔

سیّاح نوجوانوں کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ پٹارو (حیدر آباد کے نزدیک) کے کیڈٹ کالج میں تقریباً ایک ہزار لڑکے روز کلاسوں میں جمع ہوتے ہیں، جن میں استطاعت ہے وہ فیس ادا کرتے ہیں، نادار طلباء کے لیے بے شمار وظائف اور دوسری رعایات ہیں لازمی چیز حصولِ علم کا شوق اور پڑھائی میں دلچسپی ہے۔ بہرحال، چونکہ تمام طلباء کو یکساں رہائش اور دوسری آسانیاں حاصل ہیں۔ اس لیے کسی کو معلوم نہیں ہوتا کہ فیس کون ادا کرتا ہے یہاں خاندانی امتیاز بالکل نہیں ہے۔ امتیاز ان طلباء کو ملتا ہے، جو محنت سے اسے حاصل کرتے ہیں''

آج کا حیدر آباد ایک عظیم ترقی پذیر شہر ہے، چمنیوں سے آسمان کی طرف دھواں بلند ہو رہا ہے۔ کاریں اور تانگے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں اور غلام شاہ کلہوڑا کی روح پگڑیاں باندھے شہریوں کو، جن کے دل سادگی اور محبت سے معمور ہیں، دیکھ کر شفقت سے مسکرا رہی ہے۔

پُر اسرار موہنجوڈارو

وادیٔ سندھ ـــــ سپاٹ، ریتیلے میدان، اونچے نیچے ٹیلے، بنجر اور زرخیز دونوں کی زمینیں ـــــ جن کے ساتھ ساتھ کچی سڑکیں میلوں چلی جاتی ہیں۔ ان پر جابجا بیل گاڑیوں نے اپنے گہرے نشانات بنا لئے ہیں۔ یہ وہ شاہراہ ہے جو موہنجوڈارو کے شہرِ خاموش کی طرف جاتی ہے۔ عجیب، پراسرار، گھمبیر موت کا شہر۔ یہاں مہمانوں کے لئے تعمیر کردہ ڈاک بنگلہ میں کم از کم ایک رات ضرور بسر کیجئے۔ تاکہ آپ اس دور افتادہ شہر کے تعمیراتی عجائبات سے لطف اندوز ہو سکیں۔ موہنجوڈارو کراچی سے ۳۶۶ میل دُور سندھ کے مغربی کناروں پر واقع ہے۔ یہاں سکھر کے راستے ایر کنڈیشنڈ گاڑی اور جیپ کے ذریعے جاتے ہیں، اور جن سیاحوں کے پاس وقت کم ہو ان کے لئے ہوائی ٹیکسیاں، اور ہیلی کوپٹر بھی ہیں جو آپ کو بڑے آرام سے ان کھنڈرات کے قریب ایک خاص مستقر پر لے جاتے ہیں۔ اور پھر اسی دن واپس لے آتے ہیں۔ آخری چھ میل آپ کی جیپ یا تانگہ جنگلی پھولوں اور چہچہاتے پرندوں سے بھری جھاڑیوں کے درمیان سے گزرتی ہے۔ ادھر اُدھر کپاس کے کھیت اور پھلوں کے پودے بھی ہیں۔ یہ خوش گوار منظر دھوپ کھائی زمین پر بکھرے موہنجوڈارو کے قبل از تاریخ کھنڈرات کے ساتھ سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔

آج سے چار ہزار برس پہلے یہ تہذیب اپنے پورے عروج پر تھی لیکن صرف نصف



موہنجو ڈارو کے کھنڈرات

صدی کی بات ہے کہ اس خطے کی پہلی دفعہ کھدائی کی گئی جس سے اس سرزمین کے آغاز۔ تہذیب طرز زندگی اور دیوتاؤں کی حقیقت اور بربادی کے متعلق کافی معلومات حاصل ہوئیں۔ آثارِ قدیمہ کے ماہرین نے ۱۹۵۰ء میں ایسے ٹھوس حقائق بتائے جن کی روشنی میں اس تہذیب کے خدوخال پوری طرح اُجاگر ہو گئے۔

پتھروں پر کندہ کتبوں کے مطالعہ سے بھی بہت سی معلومات حاصل ہوئی ہیں جو اس زمانے کی داستان پر روشنی ڈالتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس دور کی ترقی کے متعلق پڑھ کر

آپ حیران ہو جائیں گے۔ موہنجوڈارو کے عجائب گھر میں یہ سب اسرار محفوظ ہیں۔ اور وہاں آپ کو خوبصورت مجسّمے دیکھنے کا بھی پورا موقع ملے گا۔ چمکدار دلکش مجسمے، برتن، زیورات پتّھر کی مہریں ——— یہاں سیّاح نیا علم اور نئی روشنی حاصل کرتا ہے۔

ان بھولے بسرے دنوں میں ایک عظیم فنِّ تعمیر نے جنم لیا تھا۔ جس نے موہنجوڈارو کے عظیم شہر کی مفید اور عملی خطوط پر منصوبہ بندی کی اور معاشرے کے ہر فرد کی سہولت کو پیشِ نظر رکھا۔ ہر آنے والا اس بات کو خاص طور پر محسوس کرتا ہے کہ اتنے قدیم زمانے میں بھی لوگ اس معیار کی تہذیب کے حامل تھے۔ تاریخ سے بھی قدیم تر وادیٔ سندھ میں کئی ایسے آثار دریافت ہوئے ہیں جو آج کل کے ماہرینِ تعمیرات کے لئے بھی روشنی کا سرچشمہ ہیں۔ دو سو چالیس ایکڑ پر کھدی ہوئی اور الف لیلوی عمارات کی حامل یہ قدیم سرزمین تفصیل سے اس وقت کی انتظامیہ، مذہب اور طرزِ زندگی کو اُجاگر کرتی ہے ——— یہ تہذیب ۳۰۰۰ سال قبل مسیح میں روم، کریٹی، TIGRIS اور وادیٔ نیل کی تہذیبوں سے مشابہہ ہے۔

ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت بنا ہُوا شہر، سُرخ رنگ کی اینٹوں کی عمارتیں، نالیوں کا بہتر انتظام، گندے پانی کے لئے کنوئیں، غلّے کے سرکاری ذخیرے، عوام کے لئے حمام، ایک مذہبی درسگاہ واضح طور پر بتاتے ہیں کہ یہ ایک صدر مقام تھا یا ایک خاص اہمیّت کا حامل بین الاقوامی شہر جہاں ایک بہت بڑی آبادی، خوش تنظیم شہری اور اقتصادی زندگی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ وہ ایسے قیمتی پتّھر اور دھات کی چیزیں، جو اس علاقے میں نہیں پائی جاتی ہیں، ان کی دریافت اس امر پر روشنی ڈالتی ہے کہ دوسرے ملکوں سے بھی خوب تجارت ہوتی تھی۔ بعض چیزوں پر ہاتھیوں، شیروں اور گینڈوں کی شکلیں

بنی ہوئی ہیں۔ یہ اور شہر میں نالیوں کا انتظام اس بات کا شاہد ہے کہ یہ خطہ ان دِنوں مون سون کی زد میں تھا۔ بارشیں بکثرت ہوتی تھیں۔ اور زرعی پیداوار بھی بہت ہوتی تھی۔ گندم، جَو، اور کپاس یہاں کی خاص فصلیں تھیں۔ بعد میں مون سون نے اپنا رُخ بدل لیا اور یہ علاقہ سوکھ گیا۔

موہنجوڈارو کے لوگ درمیانی قدوقامت کے، سُرخی مائل رنگ، لمبے سر اور چہرے، اور سیاہ بالوں والے تھے۔ دوسرے بہت سے نوادرات میں ایک معزز آدمی کا سنہری خلعت میں ملبوس مجسمہ ملا ہے۔ جس سے اس زمانے کے لباس پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ ترشی ہوئی ڈاڑھی اور صاف کی ہوئی لبیں اس بات کی مظہر ہیں کہ ان دِنوں استرے مستعمل تھے۔ عورتیں سکرٹ نما قمیص پہنتی تھیں۔ زیورات کا بھی عام رواج تھا جن میں موتیوں کے ہار، گجرے، سونے کے بازوبند، لونگ اور بالیاں شامل تھیں۔ بالوں کو پنکھے کی شکل میں گوندھا جاتا تھا۔ بچے مٹّی کے بنے ہوئے کھلونوں اور گاڑیوں سے کھیلتے تھے۔ چینی کے جانور اور بندر بھی ان کے پسندیدہ کھلونے تھے۔ ان کے سر اور دُمیں رسیوں سے بندھے ہوتے تھے جو علیحدہ بھی کئے جاسکتے تھے۔ ایسے کھلونے کافی تعداد میں ملے ہیں۔ ڈائس (دانہ) درونِ خانہ کھیلوں میں سے ہردلعزیز کھیل تھا۔

مختلف سائز اور وزن کے باٹ بھی خاصی تعداد میں ملے ہیں۔ یہ سب ایک شکل اور ایک ہی ساخت کے ہیں۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ ایک مضبوط حکومت کے زیرِ اثر تھے۔ وزن اور پیمائش باقاعدہ معیار سختی سے نافذ العمل تھا۔ جو برتن دستیاب ہوئے ہیں وہ تانبے یا کانسی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں کے لوگ لوہے سے ناآشنا تھے۔ دھات کی جو دوسری چیزیں ملی ہیں، ان میں تین چاندی کے برتن اور سیسے کی چھوٹی پلیٹ کے

علاوہ کلہاڑی، تلواریں، نیزے، چھرے، چاقو اور اُسترے بھی ہیں۔ کچھ عجیب الفاظ میں کندہ مہریں بھی ایک خاصی تعداد میں ملی ہیں۔ موہنجوڈارو سے ملنے والے مٹی کے برتنوں میں مختلف شکلوں اور سائزوں کی صراحیوں کی ایک بڑی تعداد ہے۔ جن میں سادہ بھی ہیں اور بعض کے دستوں پر باقاعدہ روغن کیا ہُوا ہے۔

یہاں کے باشندوں کے متعلق ابھی تک یہ واضح طور پر علم نہیں ہو سکا کہ وہ کون تھے؟ کس نسل سے تعلق رکھتے تھے! ماہرِ عمرانیاتِ ارض کا یہ دعویٰ ہے کہ اس آبادی کی اکثریت اس نسل میں سے ہے جن کے متعلق یہ تحقیق کی گئی ہے کہ وہ وسطی ایشیا میں ملنے والی ابتدائی زرعی آبادیوں سے وابستہ تھیں۔ ان کا رسم الخط جو چینی کے برتنوں پر یا نقشیں کتبوں پر محفوظ ہے وہ بھی اس بات کا شاہد ہے۔ غیر ملکی تاجر اور ملاح جن کے جہاز بندرگاہ پر لنگر انداز ہوتے تھے، وہ بڑی تعداد میں ادھر آتے۔ ان کے ساتھ سامانِ تجارت اور دوسرے ملکوں کی پیداوار بھی کثیر تعداد میں ہوتی۔ جس سے نئے ڈیزائنوں اور ترقی کے نئے منصوبوں کی طرح پڑتی۔

اتنی بڑی بین الاقوامی تہذیب' انجام ایک المیے پر کیسے ہُوا —— یہ ایک دوسرا معمّہ ہے۔ انسانی ڈھانچوں سے تو ہم یہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ ایک روز کسی حملہ آور بلا نے انہیں بے رحمی سے موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ہندوؤں کی ایک تحریر ورگ وید ... کی شہادت یہ ہے کہ آریوں کے جنگ کے دیوتا نے یہ تباہی مچائی تھی۔ یہاں یہ درج ہے کہ آریوں نے شہر پر شمال سے حملہ کیا تھا۔ شہری اپنے گھروں میں بے خبر ہی اس حملے کی زد میں آ گئے۔ اور گلیوں میں نہایت بہیمانہ طور پر مار ڈالا گیا —— اس طرح یہ ایک صدیوں پرانی تہذیب ایک دم مٹ گئی۔

ڈوکری ریلوے سٹیشن سے نو میل کے فاصلے پر اس قبل از تاریخ زمانے کے شہر کے آثار ٹیلوں کے ایک بے قاعدہ سلسلے میں موجود ہیں۔ یہ شہر دو حصوں میں ہے۔ ایک زیریں جو مشرق کی سمت ہے اس میں مکانات اور دکانیں ہیں۔ دوسرا بالائی جو مغرب میں ہے۔ اور اس میں نہایت اہم عمارتیں موجود ہیں۔ مثلاً بڑا حمام، دینی درسگاہ، ایک ستونوں والا ہال، بدھ مندر جو بدھ بھکشوؤں نے تباہی کے بعد بنایا تھا۔ ایک پرشکوہ معبد کے آثار بھی ملتے ہیں۔ جو ایک بلند چبوترے پر تعمیر کیا گیا تھا۔

شہر ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت تعمیر کیا گیا تھا۔ کھلی سڑکیں ہیں، جنہیں کہیں کہیں دائیں طرف کو کاٹتی گلیاں گزرتی ہیں۔ امراء کی رہائش گاہوں میں پکّے فرش ہیں۔ کوڑے کرکٹ کے لیے باقاعدہ ڈربے بنے ہیں۔ یہ سارے عمدہ انتظامات دیکھ کر ایک ماہرِ تعمیرات بے ساختہ بول اٹھے۔ "یہ واضح امر ہے کہ یہ شہر یونہی معرضِ وجود میں نہیں آگیا تھا۔ یہ ایک ایسے بااختیار ماہرِ شہریت کی دماغی اور عملی کاوش ہے جس کا ارادہ ہی قانون تھا۔

قابلِ دید مقامات میں ایک بدھ مندر اور کشن دور کے بھکشوؤں کی رہائش گاہ کے کھنڈرات بھی ہیں۔ یہ آس پاس کے علاقے سے ۲۰ فٹ اونچی تعمیر کی گئی تھی۔ بدھ مندر کے اس ملبے کے اُوپر سے شہر اور دریائے سندھ کا ایک فضائی مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ بُدھ مندر کے اس کھنڈر کا مغربی حصّہ مرکزی راستے "بھگوان کی گلی" سے ایک طرف ایک پُرشکوہ ڈھانچہ کھڑا ہے، جس میں ایک کھلا ہال ہے۔ اور اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں۔ ظاہری شکل و صورت اور بڑے حمام کی قربت کے پیشِ نظر یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ بھکشوؤں کی درسگاہ تھی۔ جہاں بھکشوؤں کا سربراہ بھی رہتا تھا۔ ساتھ ہی بڑا حمام اور نہانے کا تالاب تھا جو ۸ فٹ گہرا تھا۔ چھوٹی چھوٹی دیواروں کے ساتھ ۱۰ انٹ

اونچے ڈاٹ ٹاور، بڑی تعداد میں موجود تھے، جو عمارت میں مضبوطی کا باعث بھی تھے۔ ایک اور فراخ عمارت شہنشاہ کا محل یا اس صوبے کے حکمران کی رہائش گاہ تھی، جو اس شہر کے جنوبی حصّے میں ہے۔ یہاں آنے والے موہنجوڈارو کے نئے عجائب گھر سے ضرور محفوظ ہوں گے۔ یہ شہر کے بالکل نزدیک ہی ہے۔ یہاں ان کھنڈرات سے برآمد ہونے والے بڑے دلچسپ نوادرات محفوظ ہیں۔ ان میں مشہور کندہ مہریں، ذاتی زیورات، اور جواہر، موسیقی کے آلات، اوزار، محنت مزدوری کے اوزار، گھریلو استعمال کے برتن، مٹی کے برتن، پتھر اور لکڑی کی بنی ہوئی مورتیاں بھی شامل ہیں۔ غیر معمولی قسم کے مٹی کے برتن، تصویروں والے کھلونے بھی بڑی تعداد میں موجود ہیں۔

کراچی ایرو کلب نے اپنے چھ نشستوں والے "کسینا" ہوائی جہاز سے کراچی سے موہنجوڈارو تک چارٹرڈ پروازوں کا انتظام کیا ہے۔ یہ طیارہ پانچ مسافروں کے لئے واپسی سمیت ۷۵۰ روپے لیتا ہے۔ چارٹرڈ پروازوں سے فائدہ اٹھانے کے خواہشمند سیاح محکمہ سیاحت کلب روڈ کراچی سے رابطہ قائم کریں یا ایرو کلب کنٹری کلب روڈ کراچی سے براہِ راست رجوع کریں۔ سیاحت کے ڈائریکٹر مسٹر ایم۔ زیڈ کیانی، جو اِن انتظامات کے نگران ہیں، ۱۹۶۳ء کے آغاز میں "کسینا" کے ذریعے پرواز کر کے اس علاقے میں گئے تھے جہاں محکمۂ آثارِ قدیمہ نیا ریسٹ ہاؤس تعمیر کر رہا ہے۔ کیانی صاحب نے یہاں بیس غیر ملکی سیاحوں کو دیکھا جو یہ طویل فاصلہ ریل اور سڑک کے ذریعے طے کر کے یہاں تک پہنچے تھے۔ پاکستانی طلبا اور سیاحوں کی بھی ایک کثیر تعداد موجود تھی۔

یہ کوئٹہ ہے

کوئٹہ کے لوگ بیک وقت سنجیدہ اور خوش باش ہیں۔ انہیں مشکلات سے عشق ہے۔ یہ لوگ پٹھان بروہی اور بلوچی نسل سے ہیں اور ان قبیلوں کی تمام خصوصیات ان لوگوں میں موجود ہیں۔ کوئٹہ میں اِن کی اپنی دنیا بستی ہے اور جب وہ اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہیں تو اُن سے محبت، نفرت اور فخر کا جذبہ جھلکتا ہے۔

عہدِ رفتہ میں اِن کی زندگی بڑی کٹھن تھی۔ ان لوگوں کے اصول نہایت سادہ ہیں.... آنکھ کے بدلے آنکھ..... دانت کے بدلے دانت خواہ حالات کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ وہ اسی طرح رہنا پسند کرتے ہیں۔ انہیں اس مخصوص تنہائی سے محبت ہے اور مطمئن ہیں کہ وہ شہروں سے دور رہتے ہیں۔ انہیں ہر دشوار کام سے دلچسپی ہے اور زندگی کی عام آسائشیں پسند نہیں۔ یہاں آپس کی رقابت نہیں اور لوگ اپنے کام سے مطلب رکھتے ہیں۔ اِن کا اپنا ضابطۂ اخلاق ہے جو ہر چیز سے برتر ہے اور آپس کے معاملات میں دیانتداری برتی جاتی ہے۔ آجکل خاندان میں سب سے بڑے لڑکے کو اپنی راہ اختیار کرنے کی اجازت دی جاتی ہے اور اُسے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر نہیں چلنا پڑتا۔ باپ خواہ کتنا ہی دقیانوسی کیوں نہ ہو وہ بیٹے کو اپنی پسند اختیار کرنے کی اجازت دیتا ہے۔

رفتہ رفتہ قدیم روایات جدید خیالات کو جگہ دے رہی ہیں۔ نئی نئی تبدیلیاں ظہور میں

آ رہی ہیں اور بلوچی قبائل کے سردار بھی رضامند نظر آتے ہیں۔ کالج میں پڑھا ہوا لڑکا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ وہ قبائلی جرگوں میں دستاویزات کو بہتر طریقے پر پیش کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ وہ گاؤں کو اردو، انگریزی اور بلوچی کی کتابیں لئے لوٹتا ہے اور والدین دل ہی دل میں خوش ہوتے ہیں۔ اُن کا مستقبل روشن ہو رہا ہے، لڑکے اور لڑکیاں بیرون علاقے کی خوبیوں سے مستفیض ہو کر لوگوں کو فائدہ پہنچانے کے لئے گھر لوٹ رہے ہیں۔ کوئٹہ سے نوّے (۹۰) میل دور جنوب میں قلات کے علاقہ میں قدیم دور کے ہندوؤں کے مندر ہیں۔ دائمی شعلوں سے گھری ہوئی شعرا کی مورتی آج بھی موجود ہے۔ ۔ ۔ ۔ جنگ و جدال اور قتل و غارت کے قصے اور زمیندار راجے سب غائب ہو گئے ہیں۔ ان کی جگہ بنیادی جمہوریت نے لے لی ہے!! بلوچیوں نے بھی اِسے قبول کر لیا ہے۔

یہاں کڑاکے کی سردی پڑتی ہے لیکن اس کے باوجود فصلیں ہوتی ہیں۔ یہ محنت کش لوگ کاشت کرتے ہیں۔ یہاں نہ زیادہ بارش ہوتی ہے نہ دھوپ نکلتی ہے۔ مغربی پاکستان میں قلات قلیل ترین آمدنی والے علاقوں میں سے ہے لیکن صدر ایوب کے دورِ حکومت میں ترقی ہو رہی ہے۔ بھیڑیں پالنا مقبول پیشہ ہے اور مکران کے ساحل پر مچھلی کثیر مقدار میں ملتی ہے۔

سڑک کے کنارے پھوس پھیلاتا ہوا کسان اور بلند پہاڑیوں کے دامن میں آپ کو پھول نظر آتے ہیں۔ یہ کوئٹہ ہے جو دوسرے شہروں سے مختلف ہے۔ پاکستان کے دونوں صوبوں میں کوئی شہر اس سے مشابہت نہیں رکھتا۔ کوئٹہ کی خوبصورتی پتھروں کے زمانے کے چھوٹے چھوٹے شہروں سے لیکر جھیلوں، وادیوں اور چنار کے درختوں سے سرسبز پہاڑیوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہاں کے لوگ بھی دوسروں سے مختلف ہیں۔

اگر خوش قسمتی سے آپ کی مُلاقات کوئٹہ والا سے ہو جائے تو آپ فرق دیکھ کر دنگ رہ جائیں گے۔ وہ نہ تو بلدیہ کا رکن ہے نہ کوئٹہ کا مالک۔ وہ تو محض بلوچیوں کی نسل سے ہے

جس کی رگوں میں بہادر بروہی خون دوڑ رہا ہے۔ اُس کے سات خوبصورت بچے ہیں جن کے مشاغل مختلف ہیں جن میں شتر مرغ پالنا اور ہاتھی دانت کے چھوٹے چھوٹے ہاتھی جمع کرنا شامل ہیں۔ باپ کو بھی چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے اور اُس کے پاس بے شمار کتابیں اور نایاب مغل تصاویر ہیں۔ لیکن ابھی تک گوہرِ مقصود اُس کے ہاتھ نہیں آیا۔ اُس کے ہاں کوئی لڑکی پیدا نہیں ہوئی۔

چھوٹے سے کھانے کے کمرے سے اُن کے رہن سہن کا اندازہ ہوتا ہے۔ مشرقی قالین پر پانچ فٹ لمبی بے داغ لوہے کی گول ٹرے میز کا کام دیتی ہے جس کے گرد سارا خاندان کھانے کے لیئے جمع ہوتا ہے۔ کھانے کے بعد خاندان کا ہر فرد سفید تکیوں کی ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائے آرام کرتا ہے۔ نو سفید تکیئے ایک لائن میں رکھے جاتے ہیں۔ کوئٹہ والوں نے صدیوں پہلے کی مسلم روایات کو اپنایا۔ وہ آج بھی اُسی طرح کھانا کھاتے ہیں جس طرح آئندہ کھائیں گے، اور اُس سکون اور آرام سے لطف اندوز ہوتے ہیں جس سے ہم مغربی لوگ گزر چکے ہیں۔

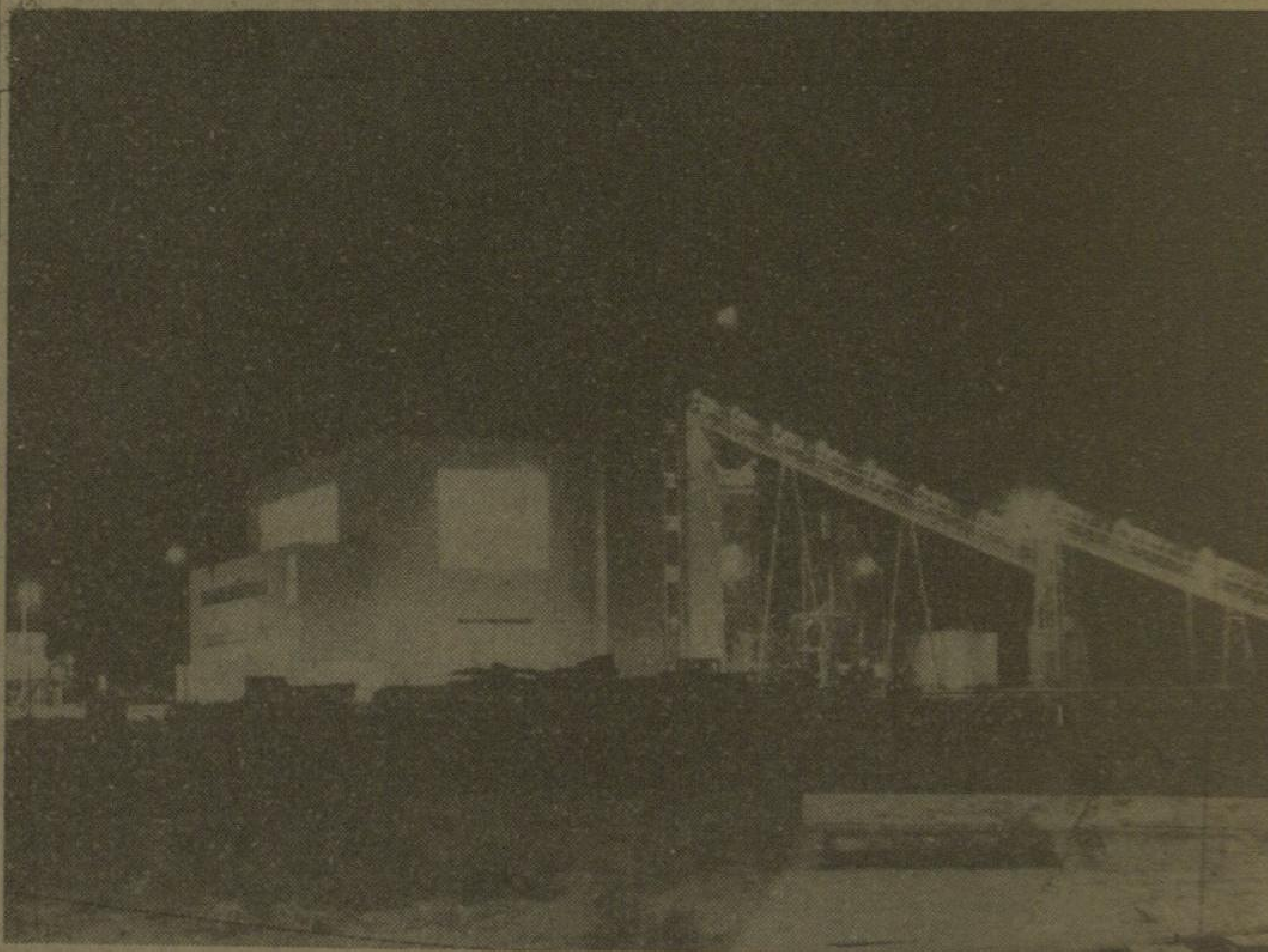
کوئٹہ کے گرد قدرتی تماشہ گھر چوٹیوں اور پہاڑوں پر مشتمل ہے۔ کوئٹہ شہر ہوائی اڈہ سے چند میل دور ایک خوبصورت شاہراہ کے ساتھ واقع ہے۔ تمام سیاح کشادہ صاف شفاف سڑکوں کو دیکھ کر بہت متاثر ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کو قطع کرتی ہیں۔ اگر یہاں کے باشندوں کا لباس روایتی نہ ہوتا تو یہ گمان ہوتا کہ پاکستان کا حصّہ ہی نہیں۔ کوئٹہ کے بازاروں میں ایشیا کا حسن ہے اور لمبے تڑنگے سُرخ گالوں والے پٹھان اور بلوچی چنگیز خاں کے زمانے سے یہاں پھر رہے ہیں۔

کوئٹہ، جسے پہلے کوٹا کہا جاتا تھا، کا مطلب قلعہ ہے جس کے اندر پرانا شہر بسا ہوُا ہے۔ یہ امیر سبکتگین اور محمود غزنوی کی حکومت کے حصّہ کی حیثیت سے وجود میں آیا اور بعد میں اُن کے وارثوں کو منتقل ہو گیا۔ بلوچی حکومت نے وسطی قلات کے علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ جس پر التمش رند

سرداد مَنڈ و حکومت کرتا تھا۔ یہ شان و شوکت کا دور تھا لیکن مستقل لڑائی جھگڑوں کی وجہ سے چگڑوں کی ڈالی ہوئی مضبوط بنیاد کمزور ہو رہی تھی۔ پھر بروہی خاندان سے ایک عزیب آدمی میر احمد اٹھا جس نے گیارہویں صدی میں قلات پر حکومت کی اور تمام سرحدوں کو یکجا کر کے امن قائم کر دیا۔

۱۷۳۰ء میں کوئٹہ میر مہابت خاں کے زیرِ نگیں آگیا اور اس نے ۱۷۵۱ء تک قلات پر قبضہ رکھا۔ اُس کے بعد برطانیہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور اس کی فوجیں اور قبائلی کونسل ۱۸۴۲ء تک حکومت کرتی رہیں۔ برطانیہ کی علیحدگی کے بعد افغانوں نے پشین اور شورارد پر قبضہ کر لیا اور کوئٹہ ایک بار پھر خان قلات کو واپس کر دیا گیا جو ۱۸۷۶ء تک حکومت کرتے رہے۔ اس سال کے معاہدہ کے تحت قلات کے علاقہ میں برطانوی فوجیں مقیم ہو گئیں اور سر رابرٹ سنڈیمن تین سو سپاہیوں کے ساتھ کوئٹہ کی حفاظت پر مامور ہو گیا۔ ۱۸۷۷ء میں یہ بلوچستان ایجنسی کا صدر مقام بن گیا۔ موجودہ کوئٹہ تحصیل کو ۱۸۸۳ء میں خان قلات سے پچیس ہزار روپیہ سالانہ پر مستقل پٹہ پر لے لیا گیا۔

بلوچستان کی تاریخ میں معزز ترین شخص خان قلات خداداد خان کا بیٹا شہزادہ اعظم خاں تھا۔ برطانیہ نے خاں کو گورنر جنرل کے ایجنٹ سے ملاقات کے لئے بلایا۔ شہزادہ کو شک ہوا کہ کہیں یہ اُس کے باپ کو برطرف کرنے کی چال نہ ہو۔ لہذا اُس نے باپ سے استدعا کی کہ وہ نہ جائے۔ بہادر خاں نے اس انتباہ کو نظر انداز کر دیا اور عام قیدیوں کی طرح پکڑا گیا۔ برطانیہ کے ساتھی قبائلی سردار اُس کا مضحکہ اڑاتے اور اُسے جگہ جگہ لئے پھرنے میں لطف اٹھاتے۔ وہ معزول شدہ خاں کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کے بہانے آتے اور اُس کا مذاق اُڑاتے۔ نوجوان شہزادہ حقیر باپ کی خدمت کے لئے ساتھ ساتھ چلتا۔ حتیٰ کہ موت نے خاں کو قید و بند سے نجات دلا دی۔ اعظم خاں نے اگلے تیس سال جلاوطنی میں گزار دیئے اور طرح طرح کی صعوبتیں برداشت کیں جب کہ اس کے دشمن عیش کر رہے تھے۔ اُسے آزادی اور دولت کی پیش کش بھی کی گئی لیکن اُس نے اُن اصولوں کا غلام بننے سے انکار کر دیا جن پر وہ یقین نہیں رکھتا تھا۔



تھرمل پاور سٹیشن ــــــ کوئٹہ

کوئٹہ کے علاقہ کے پُرخلوص لوگ اُن تمام قبائل کی پشت سے ہیں جنھوں نے جنگ و امن کی تاریخ اپنے ہاتھوں سے لکھی۔ یہ لوگ افغانستان، ایران اور ترکی سے آئے۔ آبادی اچکزئی، سیّد، بلوچی، بروہی اور پٹھانوں پر مشتمل ہے۔ چھاؤنی اور کوئٹہ اور پشین ضلع کے لوگ ملے جلے ہیں۔ بہت سے لوگ بلوچوں کو ایرانیوں اور ترکمانوں سے ملاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رند خاندان کے جانشین نڈر عربوں کی پشت سے ہیں۔ اُن کی زبان عربی سے ملتی جلتی ہے اور بلوچی سے مراد "کلغی یا ایال" ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ سنسکرت کے "بال اور اوچا" کا مجموعہ ہے جس کا مطلب طاقتور ہے

جب سیّاح بلوچیوں سے ملتے ہیں تو انہیں احساس ہوتا ہے کہ اُن کے خلوص میں بڑی کشش ہے کیونکہ وہ سیّاحوں کو سارا علاقہ دکھانے میں بڑی مدد دیتے ہیں اس علاقہ کی آب و ہوا نہایت لطیف ہے۔ مجھے یاد ہے جب کراچی میں شدّت کی گرمی پڑ رہی تھی تو کوئٹہ میں موسم خشک تھا اور ٹھنڈی ہوا چلتی تھی۔ یہ موسم پھلوں کی پیداوار کے لئے نہایت موزوں ہے۔

سیب، خوبانیاں، آڑو، انگور اور سردہ یہاں بکثرت ہوتا ہے۔ صرف انگور کی انیس منظور شدہ قسمیں ہیں جن کی یہاں کاشت ہوتی ہے۔ لوگوں کو پودے مفت تقسیم کئے جاتے ہیں اور کوئٹہ ایسا مقام ہے۔ جہاں درخت لگانے کی رسم پر خوشی منائی جاتی ہے۔ حال ہی میں کوئٹہ کے کمشنر نے ہفتہ شجر کاری، کا افتتاح کیا اور اپنی قیام گاہ پر سیب کا چھوٹا سا پودا لگایا۔ محکمہ زراعت نے کسانوں اور لوگوں کو گھر میں لگانے کے لئے پھلوں کے بیس ہزار پودے تقسیم کئے۔ ہر شخص خوش تھا کیونکہ ہفتہ شجر کاری کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ کمشنر نے اس موقعہ پر تقریر بھی کی۔ انہوں نے کہا۔" چونکہ ہماری زمین باغات اور دوسری فصلوں کے لئے نہایت موزوں ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ اِن پودوں کا پورا پورا فائدہ اُٹھائیں"۔ کوئٹہ کے لوگ بے حد خوش تھے اور حکومت کی فراخدلی سے بڑے متاثر تھے۔ وہ تعریف کرتے گھروں کو لوٹے کچھ ہی عرصہ میں چھوٹے چھوٹے درخت پھوٹ نکلیں گے اور ہر نیا پتہ اور کونپل ان لوگوں کے لئے ذریعہ انبساط ہوگا جو انہیں بڑھتا دیکھ رہے ہیں۔ یہاں ہر شخص تمام سہولتیں بہم پہنچانے پر انتظامیہ کا احسان مند ہے۔

شہر کی مرکزی شاہراہ جناح روڈ کسی چھوٹے سے امریکی شہر کی سڑک کی طرح ہے۔ یہاں خوبصورت ریستوران ہیں، جہاں سیاح مختلف کھانوں کا لطف اٹھاتے ہیں۔ کوئٹہ کے قلب میں چینی ریستوران عمدہ پیسٹریوں اور روٹی کی وجہ سے مشہور ہے۔ بازار میں کوئٹہ کا اپنا مخصوص کھانا 'لال کباب' پر ملتا ہے۔ یہاں گوشت آپ کے سامنے کوئلوں پر بھونا جاتا ہے اور بے حد خوش ذائقہ ہوتا ہے۔ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے لوگ یہاں جمع ہوتے ہیں۔ کسی شخص کو

جلدی نہیں ہوتی اور کسی قسم کی افراتفری نظر نہیں آتی۔

دکانوں میں وہ تمام اشیا موجود ہیں جو سیاح خریدنا چاہتے ہیں۔ اس میں مغرب سے برآمد شدہ چیزیں بھی شامل ہیں۔ کوئٹہ کی خاص چیزوں میں بلوچستان کا کشیدہ کاری کا کام بھی شامل ہے۔ یہ ایسی خوبصورت چیز ہے جو سارے ایشیا میں کہیں اور نہیں ملتی۔ کپڑے پر ڈیزائن بنا کر بے شمار چھوٹے چھوٹے شیشے لگاتے جاتے ہیں جو سائز میں نئے پیسہ کے برابر ہوتے ہیں۔ ہر شیشے کے گرد رنگدار دھاگے سے کپڑے کے مطابق کروشیہ کا کام کیا جاتا ہے۔ اس سے بیحد خوبصورت ڈیزائن بنتا ہے اور کپڑا ہر وقت جھلمل جھلمل کرتا رہتا ہے۔ پلنگ پوش اور میز پوش کے علاوہ کوٹ، لباس، اسکرٹ اور ہینڈ بیگ پر بھی کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ اس کے لئے صرف سحر انگیز کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

کشیدہ کاری کے کام کی خاص دکان جناح روڈ پر اسٹائلو (stalo) ہے، آپ اگر قسم بھی کھالیں کہ ایک پیسہ خرچ نہیں کریں گے، لیکن صرف قدم اندر جانے کی دیر ہے اور آپ بہک گئے۔ اگر چمکدار تھیلا آپ کو متوجہ نہیں کرتا تو کوٹی، جیکٹ یا خوبصورت لبادہ دیکھ کر آپ ضرور مجبور ہو جائیں گے۔ آپ کے لئے یہاں سے لوٹنا ناممکن ہوگا...... ہر طرف شیشے ہی شیشے ہیں اور یہ چھوٹی چھوٹی چیزیں آپ کو پہاڑیوں اور کوئٹہ کی خوبصورتی کی یاد دلائیں گی۔ اسٹائلو میں ایک حصّہ دار کوئٹہ والا بھی ہے جس سے میری مُلاقات کسی دکان پر ہوئی تھی۔ وہ مجھے اپنے خاندان سے ملانے اپنے گھر لے گیا۔

کوئٹہ کے لوگ ہر کام نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام دیتے ہیں۔ اسٹائلو سے چند قدم کے فاصلے پر پاکستان مرکز صنعت و حرفت کے خوش مزاج مالک نذر محمد اس بات کا انتظار نہیں کرتے کہ ان کے ملازمین گاہکوں کی طرف توجہ دیں۔ وہ نہایت فخر سے ایک ایک چیز انہیں دکھاتے ہیں۔ گو ان کے ہاں بلوچی کشیدہ کاری کی چیزیں بھی ملتی ہیں لیکن اُن کی دکان کی خصوصیت دھات

کے برتن ہیں جو کراچی اور پشاور میں ملنے والے برتنوں سے مختلف ہوتے ہیں۔" کیا آپ چمکدار برتن جمع کرنا پسند کرتے ہیں؟ مجھے تو بہت شوق ہے۔" دکان میں پیتل کے دمکتے ہوتے برتن ہیں جن پر رنگ برنگ پتھر جڑے ہیں۔ ایک کی قیمت تقریباً پچاس روپے ہے۔ یہ برتن اتنے بھلے لگتے ہیں کہ آپ کا دل چاہتا ہے، بہت سارے خرید ڈالیں۔ پیتل کے ٹرے اور میزیں بالکل اچھوتی ہیں۔ ان پر مغل دور کی تصویریں نقش کی گئی ہیں جو نذر نے خود بنائی ہیں۔ کچھ کانی کی میزیں ہیں اور کچھ میں گڑھے بنائے گئے ہیں۔ ان گڑھوں میں گلاس اور عجیب و غریب شکلوں کی صراحیاں اور بوتلیں رکھی ہیں جو پیتل کی بنی ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ ہاتھی دانت، ریشم اور چمڑے کی بنی ہوئی بے شمار چیزیں الماریوں میں رکھی ہیں۔ افغانی کاٹھیاں اور جوتے بالکل اچھوتے ہیں اور صرف اس دکان پر ملتے ہیں۔

اس وقت سارا کاروبار رک جاتا ہے جب نذر کا پہلوٹھی کا بچہ دکان میں لایا جاتا ہے اور باپ اسے دو چار ہلارے دیکر پیار کرتا ہے۔ کوئٹہ میں خرید و فروخت کرتے ہوئے سیّاح گھر کے لوگوں کو دکان میں آتے دیکھکر بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اس کے بعد تمام لوگ چائے پینے کے لیے رک جاتے ہیں اور باتیں ہونے لگتی ہیں کہ وارث کس طرح پرورش پا رہا ہے ...." شاید ہمیں اُس خوبصورت سانپ کی ٹانگوں والی گول میز پر کچھ رعایت مل جائے۔

گو کوئٹہ، پشین اور قلات کے اضلاع اس علاقہ میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں لیکن بہت سی پرانی رسمیں دگو یہ آہستہ آہستہ دم توڑ رہی ہیں، آج بھی قائم ہیں اور قبائلیوں کی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ عزت کے قوانین نے، جو پرانے زمانے میں مروّج تھے، ہر قبائلی کے لئے لازم کر دیا ہے کہ وہ

(۱) خون کا بدلہ لے

(۲) جس شخص کو اُس نے پناہ دی ہے اُس کے لئے جان تک دے دے۔ پناہ کو ہمسایہ کہا

جاتا ہے اور یہ اُس وقت تک لازم ہے: جب تک پناہ گزیں پناہ دینے والے کے گھر میں ہو (۳) میزبانی کرے اور مہمانوں کے جان و مال کی حفاظت کرے۔

کوئٹہ کے علاقہ کی جوان عورتوں کی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے لئے شادی کے رسم ورواج میں "دلہن کی قیمت" کا ذکر ضروری ہے۔ اگر لڑکی جوان اور خوبصورت ہو تو اس کی قیمت ایک ہزار سے دس ہزار روپے تک ہوتی ہے۔ بیوہ کی قیمت کم ہوتی ہے۔ اس کے پانچ سو روپے بھی لگ سکتے ہیں اور بلوچیوں میں اگر کوئی بیوہ اپنے مرحوم خاوند کے خاندان میں شادی کرنے پر راضی ہو تو بالکل مفت مل جاتی ہے۔ یہ بالکل دوستانہ انتظام ہوتا ہے۔ کوئٹہ میں شادی کا منظر بڑا خوبصورت ہوتا ہے۔ کیونکہ خاندان کے لوگ شادی طے کرتے ہیں۔ لہٰذا دولہا دلہن ایک دوسرے کو پہلی بار دیکھتے ہیں۔ رشتہ کا انتخاب بڑی احتیاط سے کیا جاتا اور دلہن کو تحائف سے لاد دیا جاتا ہے۔ شادی کے بعد اُس کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور وہ ہنسی خوشی اپنے گھر رہنے لگتی ہے۔

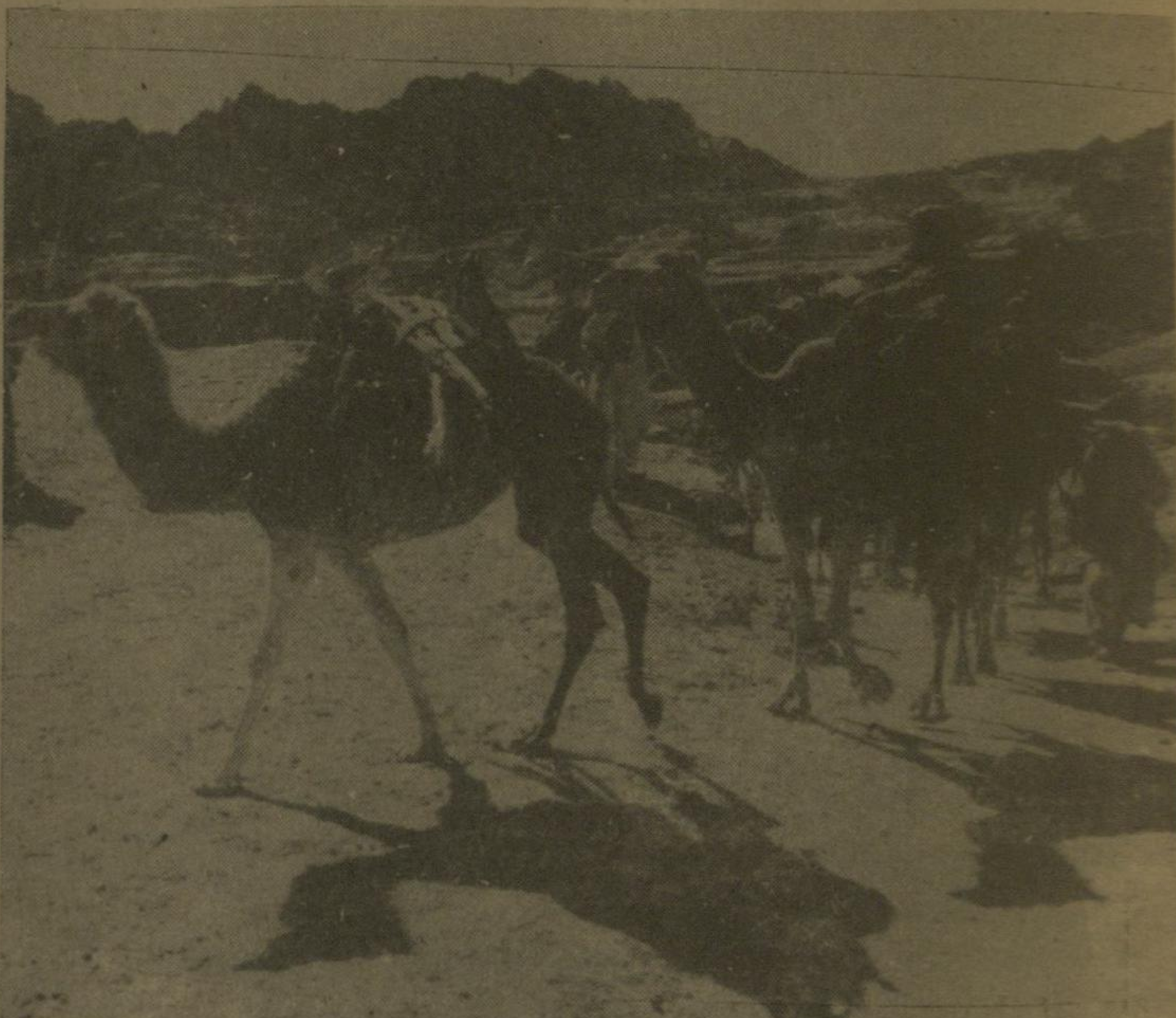
کوئٹہ کے لوگ جوانمردی کے کھیلوں کے شوقین ہیں۔ وہ کشتی لڑتے ہیں اور یانرا کھیلتے ہیں۔ جس میں دو لوگ تیسرے آدمی کے پیچھے بھاگتے ہیں۔ اگر وہ پکڑا جائے تو ہار جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے حریفوں کو پہلے چھولے تو جیت جاتا ہے۔ میلوں پر، جس میں سیاح بھی شرکت کر سکتے ہیں، خوب کھیل تماشے ہوتے ہیں۔ نیزہ بازی، نشانہ بازی اور انڈے پھینکنے کے مقابلے ہوتے ہیں، اور بانسریوں اور ڈھول کی گت پر خوشی کے نغمے گائے جاتے ہیں۔

دوسرے اہم میلے دونوں عیدیں ہیں۔ عید کے اگلے روز کوئٹہ سے چھ میل دور شیخ منڈا کے مزار پر میلہ لگتا ہے۔ یہاں پیروں کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ آسمانی آفات اور بھوت پریت دور کرنے کے لئے اُن کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔ پیر لوگوں کے ساتھ مل کر دعا مانگتا ہے جس کے عموماً بڑے اچھے نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

تفریح کے لئے کوئٹہ کے لوگ قہوہ خانوں میں جاتے ہیں اور گپ شپ کرتے ہیں یا پھر بڑے ہوٹلوں اور ریستورانوں میں جمع ہوتے ہیں۔ اور سبز چائے اور حقہ پیتے ہیں۔ یہاں گھریلو اور قبائلی معاملات سے لیکر قومی اور بین الاقوامی حالات تک پر بحث ہوتی ہے۔ اخباروں کا مطالعہ، — اور غیر ملکی خبروں پر تبصرہ ہوتا ہے۔ "خلائی دوڑ میں کون آگے ہے؟ - صدر ناصر آجکل کیا کر رہے ہیں؟ - ارے یہ دیکھو! شہزادی الیگزنڈرا کی شادی ہو گئی۔ صفر کے مقابلے میں سات گول۔ اصل میں برازیل کے لوگ فٹ بال کھیلنا جانتے ہیں" اور بات چیت کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ کچھ لوگ شطرنج کھیلنے کے لئے رات کو لورڈ میں ملنے کا وعدہ کرتے ہیں۔ کچھ مرغوں کی لڑائی دیکھنے کا پروگرام بناتے ہیں۔

جن ہوٹلوں میں لوگ جمع ہوتے ہیں۔ زیادہ بڑے نہیں لیکن اُن میں وسعت کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ سیّاحوں سمیت تمام لوگ سب سے پہلے لورڈ کا رخ کرتے ہیں کیونکہ وہ شہر کے وسط میں واقع ہے گو چھاؤنی میں چلتن میں جانے والے بھی بہت ہیں لیکن لورڈ لوگوں میں بے حد مقبول ہے۔ یہاں پچاس لوگوں کے لئے عمدہ کمرے ہیں اور کھانا بھی عمدہ ملتا ہے یہ ہوٹل چوبیس گھنٹے کھلا رہتا ہے۔ لورڈ خوبصورت باغات سے گھرا ہوا ہے ایک اسٹیج بنا ہوا ہے جہاں موسیقار جدید اور دیسی ساخت کے ساز بجاتے ہیں۔ مہمان زائد پیسے خرچ کئے بغیر یہاں رات کو رقص کر سکتے ہیں۔ اور کھانا کھا سکتے ہیں۔ اِس ہوٹل میں پی۔ آئی۔ اے کا دفتر بھی ہے۔ انتظامیہ ہر لحظہ خدمت کیلئے مستعد ہے اور ناشتہ کسی وقت بھی مل سکتا ہے۔ گرم حمام بھی تیار رہتا ہے۔ تمام خرچ ملا کر کرایہ بتیس (۳۲) روپیہ یومیہ ہے۔ لورڈ کوئٹہ کلب کا صدر مقام بھی ہے جہاں لوگوں کی تفریح کے لئے فلم شو، تمبولا اور خواتین کے لئے صبح اور شام رقص کی کلاسیں ہوتی ہیں۔

چلتن بھی بڑی خوبصورت جگہ ہے اور سکون پسند سیّاحوں کے لئے یہاں باغات ہیں۔ کرایہ پچیس (۲۵) روپیہ یومیہ ہے۔ بولان ہوٹل میں صرف کمرہ کرایہ پر ملتا ہے اور کھانا پکانے کی سہولتیں



ایک کاروان

مہیا ہیں۔ سنگل کمرہ کا کرایہ آٹھ روپیہ اور ڈبل کا چودہ (۱۴) روپیہ ہے، لیکن کھانا پکانا کون پسند کرے گا جبکہ اُن کا باورچی نہایت ارزاں قیمت پر بے حد لذیذ کھانا پکا لیتا ہے۔ کوئٹہ کے قلب میں ایک کشادہ اور جدید ترین سہولتوں سے مزین ہوٹل زیر تعمیر ہے۔ کوئٹہ میں بہت سے خوبصورت ڈاک بنگلے اور گورنمنٹ سرکٹ ہاؤس ہے۔ ان کا کرایہ ایک روپیہ سے پانچ روپیہ یومیہ تک ہے۔ محکمہ اطلاعات کے ذریعہ یہاں ٹھہرنے کا انتظام پہلے سے کرنا لازمی ہے۔ ڈاک بنگلوں کو عموماً حکومت کے ملازمین استعمال کرتے ہیں لیکن سیاحوں کو بھی اجازت مل جاتی ہے۔

کوئٹہ میں سیر کی ابتدا نئے ریڈیو اسٹیشن سے کی جاتی ہے۔ یہاں سیاحوں کی بے حد عزت کی جاتی ہے اور ان سے کوئٹہ کی سیر کے تاثرات بیان کرنے کو کہا جاتا ہے۔ درختوں سے گھری ہوئی لٹن ایونیو پر پیدل یا تانگہ کی سیر بڑی پُرلطف ہے۔ یہاں خوشنما مکانات اور عظیم الشان ریذیڈنسی ہے جہاں صدر اور دوسرے معزز لوگ ٹھہرتے ہیں۔ اگلا مقام اسٹاف کالج ہے جو خوبصورت گردونواح میں گاؤں کی طرح پھیلا ہُوا ہے۔ یہاں گذشتہ زمانے میں برطانوی افسروں کو فوجی تربیت دی جاتی تھی اور آجکل پاکستان، ایشیا اور مشرقِ وسطیٰ کے فوجی افسر تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ شام کا وقت سرکلر روڈ پر پھل منڈی اور مشہور جامعہ اور اثنا عشری مسجد دیکھنے میں صرف کیا جاسکتا ہے۔

ٹاؤن ہال خوبصورت جگہ ہے اور صنعتی عمارات میں کپڑے کے مل، دواؤں کے کارخانے اور پھل محفوظ کرنے کے پلانٹ ہیں، جہاں آپ کو لذیذ جام چکھنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ آپ کوئلہ کی کان بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کان کنی کوئٹہ کی معیشت کا سب سے بڑا سہارا ہے۔ اگر کوئی سیاح بیمار ہو جائے تو سارے علاقہ میں بے شمار عمدہ ہسپتال موجود ہیں۔

کوئٹہ میں ایوب اسٹیڈیم نیا بنا ہے۔ یہاں بیک وقت دس ہزار تماشائیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے۔ یہ ریس کورس کے نزدیک واقع ہے۔ قدیم شہر ہونے کے باوجود کوئٹہ میں بے شمار جگہیں ہیں جو بالکل جدید ہیں۔ ان میں خوبصورت پارک بھی شامل ہیں۔ واپڈا نے ایک بجلی گھر قائم کیا ہے جو صنعتی ترقی میں مدد دے گا۔ اس کے علاوہ کوئٹہ سے گیارہ میل دور گنا کر دیں ڈیم بنایا جائے گا، جو پانی کی موجودہ بہم رسانی میں اضافہ کرے گا۔ اس کی گنجائش ساٹھ لاکھ کیوبک فٹ سے زیادہ ہو گی، اور پچھتر فٹ بلند ہو گا۔ اس طرح یہ علاقہ ترقی کر رہا ہے اور یہ تمام کام پاکستان فوج کے انجینئر کر رہے ہیں جو کوئٹہ کے لوگوں کی بہبود کے لئے مقامی انتظامیہ سے تعاون کر رہے ہیں۔ تصویر کا دُوسرا رُخ دیکھئے۔ شہر کے نزدیک دریافت ہونے والی پہاڑیوں آثارِ قدیمہ کی دلچسپی کی حامل ہیں۔ یہ موہن جوڈارو کے دور کی بیان کی جاتی ہیں اور اُس تعلّق کا پتہ دیتی ہیں جو صدیوں پہلے اس علاقہ کے لوگوں کا اپنی ہمعصری

تہذیبوں سے تھا۔

کوئٹہ سے صرف تیس (۳۰) میل دور قدیم پشین ہے جہاں سیاحوں کی دلچسپی کی بہت سی چیزیں ہیں اس کی فرض شناس ٹاؤن کمیٹی ترقی کے منصوبے بناتی ہے۔ پشین کے خوبصورت ریسٹ ہاؤس کے دروازے تمام سیاحوں کے لئے کھلے ہیں۔ اجازت نامہ محکمہ زراعت سے لینا پڑتا ہے۔ ایک رات ٹھہرنے کا کرایہ صرف پانچ روپیہ ہے۔ چوکیدار خدمت کے لئے ہر وقت حاضر رہتا ہے۔ ڈاک بنگلہ اور پولیٹیکل ریسٹ ہاؤس میں رہائش کا انتظام کوئٹہ کے محکمہ اطلاعات کی معرفت سیاحی مشاورتی کمیٹی، (TOURIST ADVISORY COMMIT HEE) کے ذریعہ کیا جا سکتا ہے۔ یہاں کے افسران نہایت با اخلاق ہیں۔ پھولوں بھرے میدانوں سے گھرے ہوئے ریسٹ ہاؤس چھٹی اور ماہِ عسل منانے کے لئے بہترین مقام ہیں۔ ہرے بھرے میدانوں کو دیکھ کر گھاس پر لوٹ لگانے کو دل چاہتا ہے۔

آٹھ میل آگے خوشدل خاں میں زراعت کے لئے خوبصورت مصنوعی جھیل بنائی گئی ہے۔ جہاں مرغابی کا شکار کھیلا جاتا ہے۔ سردیوں میں جھیل جم جاتی ہے اور سکیٹنگ کے لئے بہترین ہے۔ پشین سے سات میل دور یارو کے ریلوے اسٹیشن سے پشین کے گرد بارہ ہزار ایکڑ میں پھیلے ہوئے باغات سے سیب، انگور، آلو بخارے، آڑو اور خوبانیاں باہر بھیجے جاتے ہیں۔

اس ضلع میں بے شمار مزار ہیں اور صوفیوں کی بڑی عزت و تکریم کی جاتی ہے۔ عرصہ دراز پہلے صوفیوں نے بہت سے کرشمے دکھائے ہیں۔ بابا شیخ فرید کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے چشمہ جاری کر دیا تھا جس پر آج بھی ان کے جانشینوں کا قبضہ ہے۔ وہ اُن کسانوں سے نذرانہ وصول کرتے ہیں جو شیخ صاحب کے چشمے کے نزدیک زرخیز زمینوں پر کاشت کرتے ہیں۔ ایک اور مشہور صوفی سید برت اور خواجہ چشتی کے مزار پر، جو ضلع پشین میں حانگزی میں واقع ہیں، ہزاروں

لوگ جاتے ہیں۔

کوئٹہ کی سیاحت کے دوران آپ ایک دن زیارت میں بھی گزار سکتے ہیں۔ یہ بچھتّر میل دور ہے اور تقریباً دو گھنٹے کا راستہ ہے۔ بنجر میدانوں سے بلندی پر یہ نخلستان کی طرح ہے اور سطح سمندر سے آٹھ ہزار چالیس فٹ کی بلندی پر ہے۔ زیارت میں سیّاحوں کی آمد کا زمانہ ۱۵ مئی سے شروع ہو جاتا ہے اور اکتوبر تک چلتا ہے۔ جمالیاتی ذوق رکھنے والے اِس کی بے مثال خوبصورتی دیکھ کر مبہوت رہ جاتے ہیں۔ پہاڑوں کے دامن میں شکار بکثرت ملتا ہے اور بلند چوٹیاں کوہ پیماؤں کو دعوت دیتی ہیں۔ آپ یہاں صنوبر کے درختوں کے نیچے بیٹھ کر آرام کر سکتے ہیں اور پتھروں پر بہنے والے پہاڑی چشموں کے ٹھنڈے پانی سے پیاس بجھا سکتے ہیں۔

راستہ بادام کے درختوں سے گھِرا ہُوا ہے اور کمشنر کی رہائش گاہ کے نزدیک تیرنے کا تالاب ہے۔ تیرتے ہوئے مغرب کی جانب ساری وادی پھیلی نظر آتی ہے۔ یہ نظارہ نتھیا گلی سے زیادہ خوبصورت ہے۔ لوگ پتھر کے بنے ہوئے مکانات میں رہتے ہیں۔ یہاں پتھر اتنا ملتا ہے کہ اگر اسے باہر لے جانے کا کوئی بندوبست کر لیا جائے تو بے شمار دولت پیدا کی جا سکتی ہے۔ ڈاک بنگلے اور ریسٹ ہاؤس بے شمار ہیں۔ ایک رات کا کرایہ دو سے پانچ روپیہ تک ہے۔ زیارت اتنی خوبصورت جگہ ہے کہ آپ مسحور ہو جائیں گے۔ میرے لئے وہاں سے آنا مشکل ہو گیا۔

سات میل آگے سنڈیمن اور ٹانگی کے دامن میں عجیب و غریب ریگستان پھیلا ہُوا ہے۔ بلند چوٹیاں آسمان سے باتیں کرتی نظر آتی ہیں۔ ان چوٹیوں میں پانی کا چشمہ پوشیدہ ہے جو آج تک کسی کی سمجھ میں نہیں آیا۔ نظر آنے والی چیز صرف ایک موکھلا ہے جو پہاڑیوں کو کاٹ کر بنایا گیا ہے اور جہاں سے دن رات پانی بہتا رہتا ہے۔ اسے سحر کہہ لیجئے۔ اِس کے علاوہ اِس کا اور کوئی نام نہیں۔ یہ حیران کن قدرتی کرشمہ سیّاحوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ دو تنگ پہاڑ عاشق اور محبوب کی طرح

ہیں جو زمین پر جدا ہوتے ہیں۔ اور بادلوں کے نیچے پھر مل جاتے ہیں......

حکومت نے پانی کو اکٹھا کرنے کے لئے چند قدم کے فاصلے پر تالاب بنا دیا ہے جو تمام وادی اور آس پاس کی پہاڑیوں کی زمین کو سیراب کرتا ہے۔ تالاب کے کنارے پتّھر کی میز اور رنگ برنگے پتھر سے جڑی ہوئی بینچیں اس کی خوبصورتی کو دوچند کرتی ہیں۔

نیچے اتر کر چھوٹے سے گاؤں فورٹ سنڈیمن میں (جو سر رابرٹ سنڈیمن کے نام پر رکھا گیا ہے) دیہاتی آج بھی اسی طرح کاشت کرتے ہیں۔ جس طرح ان کے آباؤ اجداد کرتے تھے۔ اُن کے چہروں پر ہمیشہ مسکراہٹ کھیلتی رہتی ہے اور وہ نگر نگر گھومنے والے سیّاحوں کو دیکھ کر کبھی حسد محسوس نہیں کرتے۔ اُن کی متانت اور استقامت پر آنے والے کو متاثر کرتی ہے۔

واپسی پر مغرب کی جانب کوئٹہ سے آدھے راستے پر چمن واقع ہے جو آپ کو ضرور دیکھنا چاہیئے، کیونکہ یہ پاکستان اور افغانستان کی سرحد سے صرف دو میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ ایک اہم تجارتی مرکز ہے اور یہاں سے بیرون ملک منڈیوں کو سامان بھیجا جاتا ہے۔ چمن میں ہمیشہ چہل پہل رہتی ہے، اور ریلوے اسٹیشن اور کسٹم ہاؤس پر افغانستان برآمد اور درآمد ہونے والا سامان آتا ہے۔ وہ سیّاح جو تفریح اور تجارت کی خاطر نکلے ہیں چمن میں نیا تجربہ حاصل کریں گے۔

قدرتی حنا جھیل کے کنارے دھوپ میں آرام کسقدر فرحت بخش ہے!۔ یہ کوئٹہ سے صرف ساڑھے چھ میل دور ہے اور حنا اور اُرک وادی میں پکنک کے لئے بہترین مقام ہے۔ گو یہ علاقہ زرعی مقصد کے لئے بنایا گیا تھا جہاں سے کوئٹہ اور چھاؤنی کو پانی مہیا کیا جاتا ہے لیکن اب اس کو سیّاحوں کے تفریحی مرکز کی حیثیت دے دی گئی ہے۔ جھیل کا پرسکون ماحول سیّاحوں اور مقامی لوگوں کو مسحور کر دیتا ہے۔ جھیل کو پہاڑ کے گرد بل کھاتی ہوئی پتلی سی خوبصورت سڑک جاتی ہے۔ جہاں کوئٹہ کی مشہور کوئلے کی کانوں کے دہانے نظر آتے ہیں۔ جھیل کے گرد تازہ لگائی ہوئی گھاس

اور پھول پھیلے ہوتے ہیں۔ جن کا عکس نیلگوں پانی میں پڑتا ہے۔ جھیل کے ایک طرف قلعہ کی طرح بند بنا ہُوا ہے جس کے سُرخ پتھر سنہری دھوپ میں نہاتے رہتے ہیں۔

اس بند کے پیچھے زراعت کے لئے سپن اور کریز کے پانی کے ذخیرے ہیں، جس کا مطلب 'نیلے پھولوں کا پانی' ہے۔ نزدیک ہی تیرنے کا تالاب ہے جس کو کنٹونمنٹ بورڈ نے خاص طور پر غیر ملکی مہمانوں کے لئے بنوایا ہے۔ جھیل کے وسط میں چھوٹا سا تیرتا ہُوا جزیرہ ہے جس پر ایک چائے خانہ بنا ہے۔ سیّاح کشتیوں میں بیٹھ کر تازہ ہوا میں مشروبات کا لطف اٹھانے کے لئے وہاں جاتے ہیں۔ ایک اور مقام جہاں سیّاح کھانے کے علاوہ جھیل کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ چھوٹا سا کیفے ہے جو پھولوں بھرے پارک کے درمیان بنایا گیا ہے۔ اتوار اور چھٹی کے دن یہ کوہ پیماؤں سے بھر جاتا ہے جو پہاڑوں پر چڑھنے کے لئے آتے ہیں۔ شہر اور جھیل کے درمیان بس بھی چلتی ہے۔

کراچی سے کوئٹہ آنے کے لئے ریل اور سڑک کے ذرائع بہت عمدہ ہیں۔ پاکستان ویسٹرن ریلوے کی لائن کوئٹہ سے سات میل دور سرا ئپ کے مقام پر ضلع میں داخل ہوتی ہے اور ۸۷ میل دور سرحد تک جاتی ہے۔ کوئٹہ سے ساٹھ میل دُور شیلا باغ کے مقام پر ریلوے لائن خوجک سرنگ سے گزرتی ہے جو سطح سمندر سے چھ ہزار تین سو اٹھانوے فٹ بلند ہے۔ یہ سرنگ برِصغیر پاک و ہند میں سب سے بڑی ہے اور تقریباً اڑھائی میل لمبی ہے۔

کراچی اور لاہور سے روزانہ صبح پی آئی اے کا جہاز کوئٹہ آتا ہے۔ نیا تھرمل اسٹیشن بننے کے بعد سے جہاز کی نشستیں عموماً پُر ہوتی ہیں لہٰذا اپنی نشست پہلے سے محفوظ کرا لیجئے۔

کوئٹہ کا تھرمل اسٹیشن، جس کا افتتاح صدر ایوب نے ۱۲ ستمبر ۱۹۶۴ء کو کیا، ایک خواب تھا جس نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔ یہ شیخ منڈہ میں واقع ہے اور بجلی کی وہ تمام ضروریات پوری کرتا ہے جن کی ماضی میں وادیٔ کوئٹہ کے کوئلے کے کانوں کے علاقہ میں شدید کمی محسوس کی جاتی تھی۔ اس

کے شروع ہونے سے پہلے بجلی گھر ایک نجی کمپنی کی ملکیت تھا جو بجلی کی ضروریات پوری کرنے کے لئے انتہائی ناکافی تھا۔ بڑی عجب سی بات ہے کہ کوئٹہ میں بجلی پیدا کرنے کے آلات ۱۸۹۱ء میں لگے تھے جبکہ لاہور جیسے بڑے شہر میں بھی لوگوں نے بجلی کی روشنی کا لطف نہ اٹھایا تھا۔ یہ اسٹاف کالج میں نصب کئے گئے تھے۔ اور باقی شہر میں گیس لیمپ اور لالٹینیں استعمال ہوتی تھیں پھر گھریلو استعمال کے لئے مقامی آلات سے تھوڑی مقدار میں بجلی پیدا کی گئی۔

نیا تھرمل اسٹیشن، جہاں قریبی کانوں کا کوئلہ بطور ایندھن استعمال ہوتا ہے، پندرہ ہزار کلوواٹ بجلی پیدا کر سکتا ہے جو مساوی قوت کے دو چرخالوں (TURBINES) سے پیدا ہوتی ہے۔ علاقہ میں پانی کی کمیابی کی وجہ سے تھرمل اسٹیشن میں ٹھنڈا کرنے کا نظام بھی ہے جو ایشیا میں اپنی قسم کا واحد ہے۔ یہ اسٹیشن کوئٹہ اور ارد گرد کے علاقوں کو بجلی مہیا کرتا ہے۔ جہاں زراعت اور کان کنی کے لئے بجلی کی شدید کمی ہو رہی ہے۔

یہ کتنی عظیم ترقی ہے! اس منصوبہ کی مشینری حیران کن ہے۔ یہ اسٹیشن کے نرلیسٹھ ایکڑ کے رقبہ میں نصب کی گئی ہے، جس میں انجینئروں کے لئے مکانات بھی شامل ہیں۔ یہ زلزلہ کا علاقہ ہے لیکن اب اسے مکمل طور پر زلزلہ سے محفوظ کر دیا گیا ہے۔ رہائشی علاقہ میں تمام جدید سہولتیں موجود ہیں۔ تھرمل اسٹیشن بیسویں صدی کی سائنس کا کرشمہ ہے۔ اس کا ڈھانچہ فولاد کے فریم سے گھرا ہوا ہے، بیرونی دیواریں کوئٹہ کی سردی کی شدت برداشت کر سکتی ہیں کیونکہ یہ سیمنٹ کے کھوکھلے بلاکوں سے بنی ہوئی ہیں اور لوہے سے جکڑی ہوئی ہیں۔

سیمنٹ اور بجری سے بنی ہوئی ایسی چھتیں اور کہاں ملیں گی۔ جنہیں پانی سے محفوظ کرنے کے لئے (BILUMEN) کی موٹی تہوں سے ڈھکا گیا ہے۔ اس بجلی گھر کو دیکھ کر آپ کہہ اٹھیں گے کہ اسے نہایت فراخدلی سے تعمیر کیا گیا ہے۔ پلانٹ کی بھٹی باہر ہے۔ اس کا دروازہ اندر کی طرف ہے، جو

پوری طرح ڈھکا ہُوا ہے۔ یہاں بھاپ پیدا کرنے کی مشینیں ہیں (جو شکاگو کی رلی سٹوکر اینڈ کمپنی کی بنی ہوئی ہیں) جو ایک گھنٹہ میں اسّی ہزار پاؤنڈ بھاپ پیدا کرتی ہیں۔ توبہ، توبہ، بھاپ کس قدر گرم ہے اس کا کامیابی کے ساتھ معائنہ کر لیا گیا ہے اور بجلی کا نرخ اس نرخ سے بہت کم ہے جو واپڈا کے انتظام سے پہلے لیا جاتا تھا۔

نیا تھرمل اسٹیشن قومی ترقّی کے لیے واپڈا کی عظیم ترین خدمات میں سے ہے۔ اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں کہ صدر ایوب نے نہایت فخر سے اس کا افتتاح کیا۔ سیّاح بھی اس عظیم عمارت کو دیکھ کر خوشی سے اچھل پڑتے ہیں۔

کوئٹہ میں زندگی ذاتی دلچسپیوں اور دوستی سے رقم ہے۔ اگر اتّفاق سے پاس پیسے نہ ہوں تو بھی دکان پر پانچ روپیہ قیمت کی چیز پکڑا دی جاتی ہے۔ ایسی مہمان نوازی آپکو ہر شہر میں نہیں مل سکتی۔ کوئٹہ زیادہ بھیڑ بھڑکے والا شہر نہیں۔ مرکزی سڑک کو چھوڑ کر فی مربّع میل بارہ لوگ بستے ہیں۔ خواہ آپ صاف ستھرے بازار اور چھوٹے چھوٹے قریوں میں سیر کر رہے ہوں یا چنار کے درختوں کے سایہ میں پہاڑیوں کے دامن میں تنہائی کا لطف اٹھا رہے ہوں، سیّاحوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے اور اُن کی طرف خاص توجہ دی جاتی ہے۔

مجھے دو کہاوتیں بے حد پسند ہیں جو کوئٹہ اور اس کے لوگوں پر پوری اترتی ہیں۔ میکسیکو میں کہا جاتا ہے "یہ آپ ہی کا گھر ہے"۔ دوسری کہاوت ان الفاظ کی خوبصورتی کو عظمت عطا کرتی ہے، یہ ان مقامات پر کہی جاتی ہے جہاں بہت سے لوگ جمع ہوں۔ یہ کوئٹہ میں بھی مشہور ہے "مہمان ہمیشہ درست کہتا ہے"۔

ملتان میں قیام

قدیم ملتان ایک حیرت انگیز شہر ہے، یہ خود رو پھولوں، تاریخ قدیم اور عہد نو کا ملجا و ماوٰی ہے، اس کے آس پاس مختلف الاصل پاکستانی آباد ہیں، جو علم و دولت کے ذریعے فولاد، توانیا اور برقی طاقت حاصل کرنے میں سرگرم عمل ہیں، تاکہ انھیں اپنی روزمرہ زندگی کی مشکلات کے چکر سے رہائی نصیب ہو۔

پچھلے کئی سالوں سے سیاح حضرات ملتان کے قریب سے گزر جاتے تھے، اُن کا خیال تھا کہ ملتان ایک فرسودہ سی جگہ ہے اور یہاں جدید قسم کے آرام و آسائش کی کوئی گنجائش نہیں، اسی طرح اور بھی کئی قسم کے خیالات تھے جن کے باعث سیاح دنیائے قدیم کے اس خطے کی سیر سے کماحقہ لطف اندوز نہ ہوتے تھے، اگر ریل کے ذریعے سفر کیا جائے تو آپ ایک دن میں یہاں پہنچ سکتے ہیں۔ البتہ موٹر کے سفر میں زیادہ دن لگتے ہیں، لیکن اب ملتان میں پی۔ آئی۔ اے کی روزانہ فضائی سروس ہو گئی ہے، آپ ایک ہفتے میں چار مرتبہ بذریعہ ہوائی جہاز چار گھنٹوں سے بھی کم مدت میں ملتان پہنچ سکتے ہیں، باقی تین دن کوئٹہ کے راستے فضائی سفر کر سکتے ہیں، آپ کسی راستے سے آئیں، آپ کی یہ پرواز پُرمنظر اور دلکش ہو گی، ملتان تاریخی لحاظ سے کبھی بڑی طاقت و اہمیت کا حامل تھا، صدیاں

گزریں، برطانیہ کے زیرِ نگیں ہونے سے پہلے، یہ عربی سلطنت کا ایک صوبہ تھا، نوجوان مسلم سپہ سالار محمدؐ بن قاسم نے اسے ۷۱۲ء میں فتح کیا تھا، اس کے بعد ۱۰۰۵ء میں محمود غزنوی نے اس پر قبضہ جمایا، پھر امیر تیمور نے اسے زیر کیا اور ۱۳۹۸ء تک اس پر حکومت کی، بعدازاں یہ مغلیہ سلطنت کا حصّہ بن گیا۔ ان تمام فاتحین کے اصلاف نے اس کے آباد کرنے میں حصّہ لیا۔ قدیم کتبوں اور دفینوں سے، جو اب دریافت ہوئے ہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کی تہذیب مصر اور چین کی تہذیبوں سے کسی طرح کم نہ تھی۔ طاقتور اور سرکش دریائے سندھ نے اس وادی کو قابلِ کاشت اور زرخیز بنا دیا تھا، لیکن اسی دریا نے اپنے مسلسل سیلابوں کی وجہ سے اسے تباہ و برباد بھی کیا، جن سے اس میں جغرافیائی تبدیلیاں ہوئیں اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں میں بھی، چنانچہ اس کی نصف آبادی ان سیلابوں کی نذر ہوگئی، بعد میں آنے والی نسلوں نے اسے دوبارہ آباد کیا، لیکن اب کی بار اسے آب و ہوا کی تبدیلیوں نے پریشان کر دیا، جن کے باعث دریا خشک ہوگئے اور زمین ریتلی بن گئی، اس زمانے میں مُلتان کو دریائے سندھ سے دس میل پرے آباد کیا گیا، جس کے سرکش پانی کو آج سائنسی علوم کی بدولت زیر کر لیا گیا ہے، اور اب وہ اس کی فلاح و بہبود اور ترقی کے لیے انسانی دسترس میں ہے، میں کئی دنوں تک حیرت و استعجاب سے ملتان اور اس کے باشندوں کے متعلق معلومات فراہم کرتی رہی، میں کئی ایسے راستوں پر سے گزری، جن میں مختلف قوموں کے باشندے آباد تھے، جو دنیا کے مختلف ممالک سے یہاں آئے تھے، برطانوی، فرانسیسی، جرمن، اطالوی، سیرس، لبنانی اور امریکی، میں حیران تھی کہ وہ کس جذبۂ محرکہ سے متاثر ہو کر یہاں آگئے ہیں۔ ملتان پاکستان کے دلکش اور دلفریب شہر لاہور سے ۲۰۹ میل دُور ہے، موسم گرما میں اس

کی گرمی منطقہ حارہ سے بھی تجاوز کر جاتی ہے، جو مسلسل بارشوں اور طوفانوں میں تحلیل ہو جاتی ہے، پُرانے لوگوں نے اس کی تعریف یوں کی ہے ؎

چار چیز است تحفۂ ملتان
گرد و گرما ، گدا و گورستان

لیکن میرے خیال میں یہ شعر کسی سیّاح کا نہیں ہو سکتا، کیونکہ خوش قسمتی سے میں ملتان میں موسم بہار کے اواخر میں وارد ہوئی تھی۔ جب میں یہاں آئی تو موسم میں خنکی تھی، اور فضا سُورج کی ملائم روشنی میں شرابور تھی، یہ ایک ایسا شہر تھا جو جھلسی ہوئی زمین میں سے اُوپر اٹھتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ یہ وہ شہر تھا جس کے سامنے ایک درخشندہ مستقبل تھا، جو شاندار منصُوبوں کے شور سے گونج رہا تھا۔ متذکرہ بالا غیر ملکی لوگ بڑے اطمینان قلب کے ساتھ مغربی پاکستان کی فلاح و بہبُود کے لیے سرگرم عمل تھے، فرانسیسی کھاد کا پلانٹ تعمیر کر رہے تھے، امریکی پاکستانیوں کے دوش بدوش ایک اعلےٰ درجے کا فضائی اڈہ مکمل کر رہے تھے اور جرمن، لبنانی، سیوکس، اطالوی اور برطانوی باشندے واٹر اینڈ پاور ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کی زیر نگرانی کام میں مصروف تھے، اس اتھارٹی کو پیار سے واپڈا کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔

واپڈا میں ایک خاص خصوصیت ہے۔ وہ اپنی آغوش وا کیے کئی مسائل کا خیر مقدم کر رہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ کولمبو کے تحت تیار ہونے والا منصُوبہ ملتان سے جانب مغرب ۳۰۰ میل دور ورسک میں واقع ہے، جس کا کام صرف دریائے کابل کے نیچے کی مٹی کھودنا اور زمین دوز سُرنگیں تعمیر کرنا ہے، لیکن اس کے مقابلے میں واپڈا اہم خصوصیت کی حامل ہے۔ اس کے کنٹرول رومون میں ایسی لیبارٹریاں ہیں، جن میں ایسے سوئچ اور چمکدار بٹن لگے ہیں کہ انھیں آہستہ سے دبانے سے گیس کی مشینیں چلنے لگتی ہیں، برقی طاقت پیدا ہونے لگتی ہے

اور پانی ٹھاٹھیں مارتا ہوا مطلوبہ مقامات پر پہنچنے لگتا ہے۔ واپڈا کے طفیل جو کامیابی ملتان کو نصیب ہوئی ہے وہ اس کے باشندوں کی انتھک محنت اور جانفشانی کی مرہون منت ہے۔ جنہوں نے وہ تھرمل سٹیم پیدا کر لیا ہے، جس کی وجہ سے سوئی گیس کو دور دراز مقامات سے پائپ لائنوں کے ذریعے سارے علاقے میں لایا جاتا ہے۔

وہ سیاح جن کو ان چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، عظیم الشان ملتان پاور ہاؤس کے مناظر اور شور کو سن کر حیران ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس پاور ہاؤس میں جدید ترین آلات نصب کیے گئے ہیں، شیشے سے ڈھکی ہوئی میزوں کی قطاریں تاروں کے تانے بانے کا عجیب و غریب منظر پیش کرتی ہیں، صرف انگلی سے ایک بٹن دبانے سے مشینیں ورسک سے بجلی فراہم کرنے لگتی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے کوئی جن کھڑا ہے جو الہ دین کے چراغ میں سے مسکرا رہا ہے۔ میں نے ایک اور کمرے میں جا کر دیکھا کہ دیوار میں فریجڈیئر سے ملتی جلتی ایک چیز دیوار میں نصب ہے، جس میں متعدد ڈبے ہیں اور چمکدار چیزیں لگی ہوئی ہیں، غور کے بعد معلوم ہوا کہ یہ ٹیلیفون کا نیا طاقتور شعبہ ہے۔ جو پشاور میں واقع ورسک کے سرکلر سرکٹ کو لاہور سے ملاتا ہے۔ یہ شعبہ اب سرگرم عمل ہے اور ٹیلیفون کا نیا ڈائلنگ سسٹم از حد مقبول ہو رہا ہے، انجینئروں کو اکثر اس سے حیات بخش نتائج حاصل ہوتے ہیں۔ یہ منصوبہ اطالوی، امریکی، یوگوسلاوی باشندوں اور پاکستانیوں نے تیار کیا ہے، اور ان کی مشترکہ کوششیں بڑی نتیجہ خیز ثابت ہوئی ہیں۔ اب اس پر واپڈا کا مکمل کنٹرول ہے اور اسے اقوام متحدہ کی ایک کامیابی سمجھا جاتا ہے۔

واپڈا کی دوسری کامیابی ملتان تھرمل پاور سٹیشن ہے، جو برصغیر پاک و ہند میں اپنی قسم کا سب سے بڑا سٹیشن ہے، جو سوئی گیس سے ۲۵۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا کرتا ہے، اس کی پائپ لائن دریائے سندھ کو عبور کرتی ہے اور تین سو میلوں تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ پائپ دو ملین مکعب فٹ گیس مہیا کرتی ہے، جس سے تیز رفتار ٹربینیں چلتی ہیں، اس

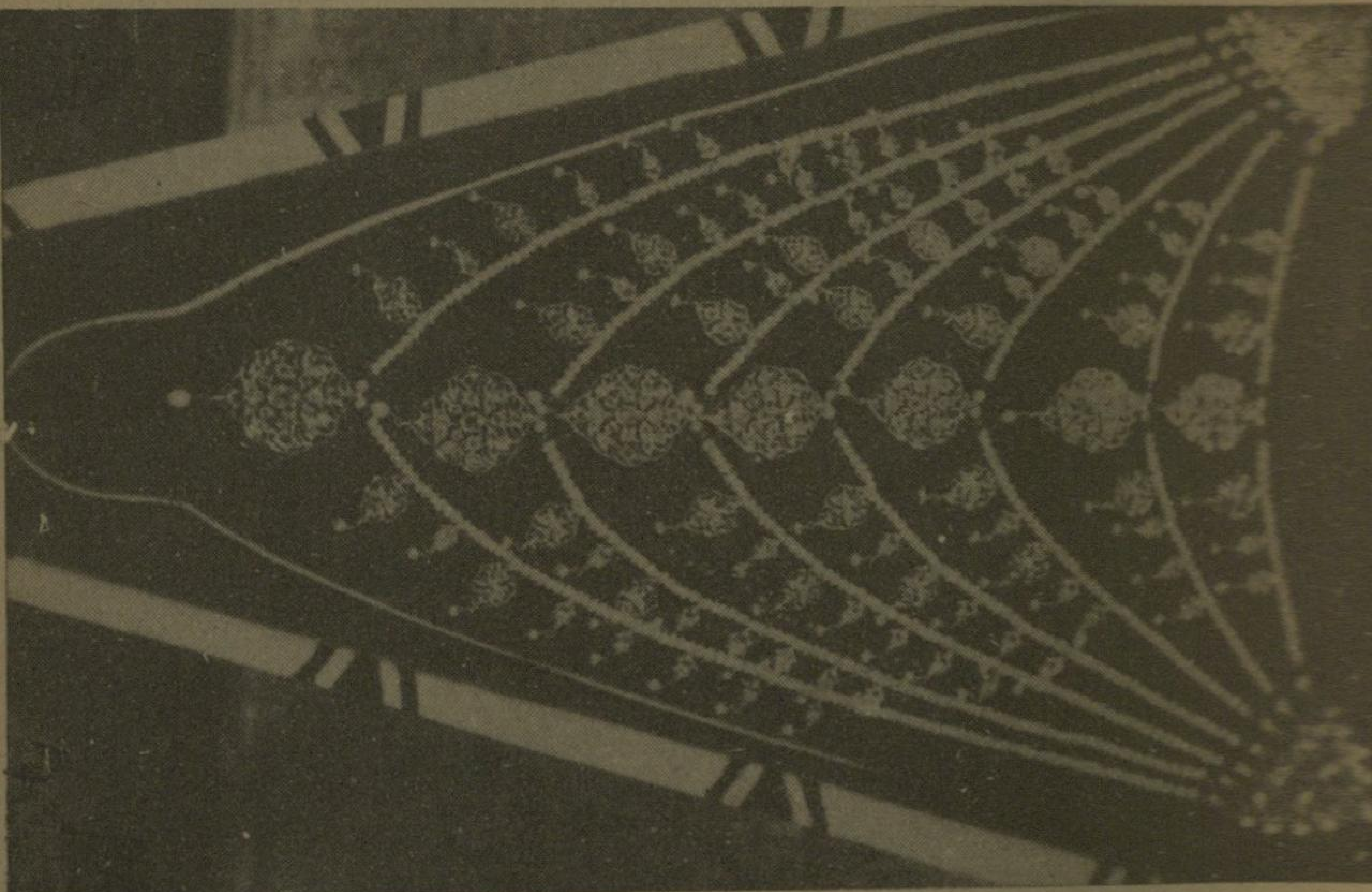
میں حیرانگی کی کوئی بات نہیں کہ سندھ طاس متبادل سکیم کی بلین ڈالر کی عمارت کے سوا، یہ پاور ہاؤس واپڈا کا محبوب ترین منصوبہ ہے، واپڈا کے پہلے صاحب فہم چیئرمین مسٹر غلام فاروق کی حالت بلاشبہ یہ تھی کہ وہ اسی منصوبے کی دُھن میں جیتے تھے، اسی کے خیال میں سوتے اور اسی کے خواب دیکھتے تھے، غرضیکہ وہ روز و شب اسی منصوبے کے متعلق سوچا کرتے تھے، یہ اُنہی کا مشورہ تھا، جس کے باعث دوسرے ممالک کے ماہرین اور مشیران پاکستان آئے تا کہ وہ پاکستانیوں کو انجینئری اور سائنسی کاموں کی تربیت دیں، جو واپڈا کے پلانٹ کو چلانے میں از حد ضروری تھے، پہلے سال غلام فاروق نے امریکہ کا دورہ کیا، وہ اس کے لیے بڑے پُرجوش تھے، آپ نے وہاں کے لوگوں کے سامنے گلوگیر لہجے میں اس معاملے کو پیش کیا اور اُنھیں سمجھایا کہ میرے ہموطن بنجر زمین میں زندگی کے دن کاٹ رہے ہیں، ان کے چاروں طرف خشک ریتلی زمین ہے، جو کوشش اور امداد سے زرخیز بن سکتی ہے، آپ نے یہ بھی بتایا کہ ہم نے واپڈا کی بنیاد رکھ دی ہے۔ لیکن ہمارے نوزائیدہ ملک میں سرمائے کی کمی ہے، آپ نے جوانوں کی طاقت کے ضائع ہونے اور بے کاروں کے لیے روزگار کی ضرورت کی نشاندہی بھی کی، تا کہ وہ لوگ اپنی زمینیں کاشت کریں، خوراک پیدا کریں اور اپنی روزی کمائیں، آپ نے دنیا کے بنکروں کو دعوت دی کہ وہ اس کام میں سرمایہ لگائیں اور ہمارے ملک آ کر ہماری سرگرمیاں اور جد و جہد ملاحظہ کریں اور ہمارے مسائل پر ہمدردی سے سوچیں، آپ نے کہا "آپ دیکھ لیں گے کہ اس امداد کی وجہ سے ہم خود کفیل ہو جائیں گے۔"

غیر ملکی آئے اور انھوں نے بچشم خود ان باتوں کا مشاہدہ کر کے امداد کی تجویز منظور کر لی۔ یہ لوگ جنگ سے نہیں بلکہ پاکستانیوں کی محنت شاقہ اور جد و جہد سے مفتوح ہو گئے۔

میں کوئی انجینئر نہیں، نہ میں کسی انجینئر کی رشتہ دار ہوں، میں تو ایک گیل بھی سیدھی

نہیں کر سکتی، کوئی معمہ حل نہیں کر سکتی لیکن واپڈا کی یہ کارکردگی مجھے اتنی پیاری لگی کہ آج میں دل و جان سے سفارش کرتی ہوں کہ ملتان پاور ہاؤس کی سیر ضرور کرنی چاہیے۔ اس پاور ہاؤس کے قریب ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس بھی ہے، جہاں صرف پانچ روپے کے عوض بستر اور بہترین ناشتہ مل جاتا ہے۔ باورچی بھی بہت اچھا ہے۔

اس کے علاوہ ملتان میں اور کیا ہے؟ ملتان شہر کے چھ دروازے ہیں جو مختلف سمتوں کو جاتے ہیں، دہلی دروازے کا رُخ قدرتی طور پر دہلی کی طرف ہے، حرم دروازہ اس جگہ واقع ہے جہاں مغل شہنشاہ اپنی حسین وجمیل خواتین کو رکھا کرتے تھے (اب ان کی تلاش فضول ہوگی)۔ پاک دروازہ قلعے کی جانب ہے جہاں گذشتہ جنگوں کے بعد امن و امان کا دور شروع ہوا تھا۔ خونی بُرج دروازہ اس مقام پر واقع ہے جہاں کبھی بڑے قتل ہوتے تھے، اور بوہڑ دروازہ ایک دیو قامت بڑ کے گرد بنایا گیا ہے۔ آخر میں لاہوری دروازہ ہے جو لاہور کو جانے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ ایک خوبصورت منڈی ہے، جو تجارتی اشیاء سے بھری پڑی ہے، یہ ایشیا کی بڑی منڈیوں میں شمار ہوتی ہے۔ لاہوری بازار میں آپ ادنٰے سے اعلےٰ اشیاء تک خرید سکتے ہیں، میں نے گائے کے گلے میں ڈالے جانے والے پیتل کے گھنگرو دو آنے فی گھنگرو کے حساب سے خریدے تھے، ایک اور عمدہ سودا بھی خریدا جا سکتا ہے جو کمرے کی زیبائش کے کام بھی آسکتا ہے، یہ ہے تانبے کی استری، جس میں کوئلہ جلایا جاتا ہے، میں کوئی قنوطی نہیں ہوں، لیکن بعض دفعہ بجلی فیل ہو جاتی ہے اور پرانے فیشن کی استری سے بخوبی کام چل سکتا ہے۔ یہ منڈی بڑی اہم ہے، لوگوں کو اس کا چکر کاٹنے میں کافی ہمت سے کام لینا پڑتا ہے، کم از کم دو دن تو لگ جاتے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ کبھی ختم ہونے کا نام نہ لے گی۔ اس منڈی میں آپ کو اونٹ کی کھال کے بنے ہوئے لیمپ ملیں گے، اس قدیم شہر





میں، جہاں اونٹ کثرت سے ہیں، مشہور ہے کہ ایک شتربان اپنے اونٹ کی موت سے اتنا غمزدہ ہُوا کہ وہ اس کی جدائی برداشت نہ کر سکا، آخر اس نے اونٹ کی کھال اتار کر اپنے پاس رکھ لی اور اس سے گدیاں اور لیمپ تیاّر کر لیے، تاکہ یہ دونوں چیزیں دوست کی یادگار کے طور پر محفوظ رہیں۔ یہ خیال عام ہوگیا اور بات چل نکلی، جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ اُونٹ کی کھال کے لیمپ سب کے سب ملتان کے کاریگر ہی تیار کرتے ہیں، ان کے علاوہ اس منڈی میں کامدانی جوتے ہیں، جن پر سونے اور چاندی کے تاروں کا کام ہے، برتن ہیں، چینی مٹی کے ظروف ہیں، جن کی خوبصُورتی کی تعریف الفاظ میں نہیں ہو سکتی، منڈی کی فضا میں مسالے دار ہوا کی تیز مہک رچی بسی رہتی ہے۔ خوانچہ والے اپنے خوانچے لیے اِدھر اُدھر گھومتے اور آوازیں دیتے رہتے ہیں، ایک طرف سنگتراش بیٹھے ہیں، جو سفید پتھر کے ٹکڑوں پر مزاروں اور قبروں کی لوحیں تیاّر کرتے اور ان پر موزوں اشعار کندہ کرتے ہیں۔ ملتان کے باشندوں کو ان لوحوں سے بڑی محبت ہے، ان میں سے اکثر اپنے مزار کے لیے کتبے کا اِنتخاب کرتے ہیں، حالانکہ ان کی صحت ابھی قابلِ رشک حد تک اچھی ہوتی ہے۔ کوئی شخص اس کے اس اِنتخاب پر اعتراض نہیں کرتا۔ بعض دفعہ اس انتخاب میں سارا خاندان شریک ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی رائے پیش کرتا ہے۔

شہر کو جانے والی تمام سڑکوں پر دو رویہ پھُولوں کے پودے ہیں، قلعے کی سفید اور گلابی دیواریں قدیم شہر کے بازاروں کے دوش بدوش کھڑی ہیں۔ مسجدوں کی دیواروں اور محرابوں میں سُرخ قیمتی پتھر جڑے ہوئے ہیں، جو روشنی میں چمکتے ہیں، پاک دروازے کے قریب اونچی دیواروں والا ایک باغ ہے۔ اس میں دو برطانوی سپاہیوں کا مقبرہ ہے جو اپنے فوجی دُستے کی حفاظت کرتے ہوئے اس مقام پر مارے گئے تھے، وہ ایک مزار کے

کے نیچے، جو ان کی یاد میں تعمیر کیا گیا ہے، آرام کر رہے ہیں۔ انگریز کو یہاں سے رخصت ہوئے مدت ہو گئی ہے۔ لیکن ملتان کے پاکستانی اب بھی اس یادگار کی حفاظت کر رہے ہیں، جس پر عشق پیچاں کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں، وہاں جو کتبہ نصب ہے اس کے الفاظ آسانی سے پڑھے جا سکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ پیٹرک ویکس ایگینو اور ولیم اینڈرسن کی بہادری کو ایک دوست ملک میں آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کر لیا گیا ہے۔ تاکہ سب لوگ اسے دیکھنے کے لیے رکیں اور اس پر غور کریں۔

اس میں کوئی شک و شبہ نہیں کہ ملتان میں میرا آخری قیام ملتان پاور ہاؤس میں ہوا۔ میں نے سوچا کہ اس کے اندر جا کر اس پر الوداعی نگاہ کس طرح ڈالوں؟ اس کے پُر پیچ گنبدوں کے قریب کس طرح جھکوں؟ اس کی سیدھی شاہ نشینوں پر کھڑے ہو کر ہلکے نیلے آسمان کے پس منظر میں وہ بالکل نئی وضع کا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی پیچدار سیڑھیوں پر اردو، بنگالی اور پنجابی مزدوروں کی ملی جلی آوازیں سنائی دے رہی تھیں، یہ ایک اور قسم کا مینارہ بابل معلوم ہوتا تھا، جو اس لیے تعمیر کیا گیا تھا کہ مدت تک قائم رہے، اس کا ڈیزائن اور طرزِ تعمیر بھی مسحور کن ہے۔

میں دو منزل نیچے اتر کر بوائلر روم میں داخل ہو گئی، اس کمرے کے انگریز انجینئر نے ہنس کر کہا، "یہ بوائلر نہیں ہیں بلکہ ہارٹل پول سے آتے ہوئے گیس آلٹرنیٹرز ہیں" یہ دیکھنے میں حیرت انگیز معلوم ہو رہے تھے، وہ فولاد کے بنے ہوئے تھے، لیکن شیشے سے زیادہ ملائم تھے، میں نے دل میں خیال کیا کہ یہ ایک ٹرین، سرکا بیسویں صدی کی کتنی مکمل تصویر ہیں، بہت تیز رفتار ٹرین کہ جس کی رسی کھینچو اور وہ جھٹ دوڑنے لگے، لیکن پھر میں نے سوچا مجھ پر کون یقین کرے گا، مجھے تو یہ ابھی تک ریل کی پٹری پر پڑے ہوئے بوائلروں کی

طرح معلوم ہو رہے تھے، پھر مجھے یاد آگیا کہ یہ تو "آلٹرنیٹرز" ہیں، یہ طاقت پیدا کرتے ہیں، سٹیم بناتے ہیں اور سٹیم سے اسے برقی طاقت میں تبدیل کر دیتے ہیں، گرم سٹیم، اور بہت زیادہ سٹیم --- لیکن یہ سب کچھ ابھی تک میرے لیے فریب نظر تھا، لیکن مجھے اس سے اور اس کی چمکیلی سطح سے پیار تھا، میں کبھی خواب میں بھی یہ تصور نہ کر سکتی تھی کہ ایک دن ایسا آئے گا کہ میں بوائلر روم (معاف کیجیے آلٹرنیٹرز) دیکھنے کے لیے بازار میں سے گزروں گی، مگر آخر ایسا ہو کر رہا، لیکن ملتان کی بہتر اور روز افزوں بڑی بڑی ترقیات، سیٹلائٹ قصبات کے متعلق کیا کہوں —— وہ سب دوش بدوش دوڑ میں شریک ہیں، کہ دیکھیں کون اول آتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ واپڈا نے اپنے منتخب کردہ کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا ہے، جن میں ٹیلیفون کا ڈائلنگ سسٹم شامل ہے، جس کے ذریعے پاکستان کے بڑے بڑے شہروں کے درمیان دور دراز مقامات سے ٹیلیفون کیا جا سکتا ہے —— تاہم وہ ان کاموں کو کس طرح ختم کریں گے؛ واپڈا کے کرتا دھرتا منصوبوں کو پایۂ تکمیل پہنچانے والے دماغ کے مالک ہیں، وہ کون سی بڑی ہستی ہے جو کامیابی حاصل کر کے رُک جاتی ہے؟ واپڈا والے مسلسل کام کرتے رہیں گے تاکہ اپنے ہموطن اہلِ پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے اور زیادہ سادہ طریقے اور نئی نئی راہیں تلاش کریں۔

ہڑپہّ   شہرِ خموشاں

اگر آپ مکمل آرام دہ جگہ کی تلاش میں ہیں تو ہڑپہ میں قیام اس کا بہترین جواب ہے۔ اس کے گرد و نواح میں آج بھی وہ بیل گاڑیاں نظر آتی ہیں جو صدیوں پہلے اس دور کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ پگڑیاں باندھے ہوئے ان کے مالک چلتے ہوتے تناور جانوروں کی باگیں کھینچتے ہیں یا اپنی بھاری بھرکم گاڑیوں کے پچھلے حصے میں چہرے پر طمانیت کی مسکراہٹ لئے بیٹھ جاتے ہیں یہ سواری کا وہی ذریعہ ہے جو چار ہزار سال پہلے ان کے آباؤ اجداد استعمال کرتے تھے۔

پاکستان میں سردیوں کے ٹھنڈے مہینوں کے بعد جب موسم بہار کسی کی یاد دلاتا ہے۔ ہڑپہ اپنے جوبن پر ہوتا ہے۔ یہ لاہور سے ایک سو اٹھارہ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ آپ کی کار (یا ریل) سابق پنجاب کے نہری علاقے کے میدانوں سے گزرتی ہے جہاں گندم کے کھیت لہلہاتے ہیں اور خاموش طبع لیکن پر خلوص پنجابی ہل چلاتے اور زمین سے اپنی روزی پیدا کرتے۔

اِن سادہ لوح کسانوں کے لئے زندگی عملاً یکساں رہتی ہے۔ درحقیقت وہ جدید دنیا کے طور طریقوں اور ہمارے لباس کو دیکھ کر ہنستے ہیں۔ اِن لوگوں کا لباس کمر کے گرد لپٹی ہوئی چادر اور لمبا کرتا ہے۔ وہ اپنے کھانے کے لئے اناج اُگاتے ہیں۔ کچھ بڑھئی ہیں جو کرسیاں اور چارپائیاں بناتے ہیں لیکن عموماً یہ لوگ اپنی جھونپڑوں میں سخت زمین پر کمبل بچھا کر سوتے ہیں۔ گیہوں سے بے تحاشا لدی

ہوئی اونٹ گاڑیاں وزن کرنے کے لئے مال خانے لے جاتی ہیں۔ سب کے لئے کھانا، کپڑے، عورتوں اور بچوں کے لئے جھلمل کرتے زیورات اور چوک میں چائے خانہ پر بڑا سا ریڈیو۔ یہ اُن کی زندگی ہے جو برسہا برس سے ایک ہی ڈگر پر چل رہی ہے۔ جب گاؤں کی کوئی دوشیزہ اپنے اَن دیکھے دولہا کے گھر پالکی میں بیٹھا کر لے جائی جاتی ہے تو کوئی لمبی چوڑی رسمیں نہیں ہوتیں، صرف چند گھنٹے غل غپاڑہ اور بھاگ دوڑ میں گزر جاتے ہیں۔ تمام لوگ تقریبات میں شریک ہوتے ہیں اور اس دن کام بالکل رُک جاتا ہے۔ ایسے وقت ہر کوئی خوش ہوتا ہے اور ان چھوٹے قصبوں میں پیدائش، شادی اور موت ایک عوامی معاملہ ہوتا ہے اور ہر موقعہ پر اس کے مطابق ہمدردی یا مبارکباد دی جاتی ہے۔

ہڑپہ تین ہزار قبل مسیح میں عروج پر تھا۔ اپنے مشترکہ دارالحکومت موہن جوڈارو سے اُس کا گہرا تعلق تھا اور دونوں شہروں کے درمیان وسیع پیمانے پر تجارت ہوتی تھی۔ یہاں کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ یہاں کے لوگ مالدار تاجر تھے جو شاہانہ عظمت کے بغیر بڑی منضبط روائتی زندگی بسر کرتے تھے۔ کسی بادشاہ نے ٹھاٹھ باٹھ کی اجازت نہیں دی۔ یہاں بتوں کی پوجا نہیں ہوتی تھی۔ یہاں سادہ اور باوقار خودکار حکومت تھی جس میں ہر شہری کو مساوی حقوق حاصل تھے ان کی تہذیب کوئی خاص عظمت حاصل کئے بغیر مر گئی۔ تمام چیزوں میں یکسانیت بنیادی اصول تھا۔ لوگوں کا رجحان زراعت کی طرف تھا۔ جن علاقوں میں کھدائی ہوئی ہے۔ اس سے بڑے بڑے ہوادار گوداموں اور اناج گھروں کا پتہ چلتا ہے۔ ایک قلعہ کے کھنڈرات کے نشانات اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ پرانا شہر دریائے راوی کی دو شاخوں کے درمیان تعمیر ہوا تھا۔ ایک بڑی فصیل کے نشان بھی ملتے ہیں جو سیلاب کا پانی روکنے کے لئے بنائی گئی تھی۔ پانی کے نکاس کے عمدہ طریقہ سے اُن کی فہم و فراست کی تصدیق ہوتی ہے۔ رہائش کے علاقہ سے دور اور باہر اینٹوں کے

بھٹّے سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہڑپّہ کے لوگ اپنے آس پاس دھواں پسند نہیں کرتے تھے۔ کھدی ہوئی مہریں جو مختلف کھدائیوں سے ملی ہیں قیمتی قسم کی ہیں اور یقیناً عام لوگوں کی ملکیت تھیں۔

زیورات، بازوبند، سونے کی تختیاں اور کم قیمتی پتھر جو کھنڈرات سے ملے ہیں۔ ہڑپّہ کے تاجروں کے تبّت، ایران، میسوپوٹیمیا اور شمالی برما سے تعلقات پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان کے ڈیزائن پیچیدہ اور باریک ہیں اور ان کے بنانے میں بڑی محنت صرف ہوتی ہوگی۔ ان کے برتن بالکل سادہ اور بغیر کسی کام کے ہیں۔ ہڑپّہ کی ہر چیز، معہ ان کی روزمرّہ کی زندگی کے انتہائی سادگی کی نشاندہی کرتی ہے۔ بہرحال، اس سادگی میں بھی وقار تھا۔ بربروں کے آنے اور اُن کی فتح سے پہلے تک اِن کی حکومت کا تسلسل برقرار رہا۔

ہڑپّہ کے کھنڈرات سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی سادہ تہذیب کے اندر نیک دل دھڑکتے تھے۔ ان کے بہت سے خیالات آج کی جدید دنیا کے مقابلے پر اترتے ہیں۔

ان سیاحوں کے لئے جو ہڑپہ کے دور کے متعلق پوری تحقیق کرنا چاہتے ہیں۔ حکومت نے ایک ریسٹ ہاؤس بنوایا ہے جہاں جدید سہولتیں اور اچھا باورچی مہیّا ہے اور ماحول میں پُرسکون خاموشی ہے۔



بادشاهی

مسجد

عظمت و وقار کا شہر   لاہور

مغل شہنشاہوں کے اس قدیم شہر کا ایک اپنا مقام ہے۔ اس کے گلی کوچوں کی ایک اپنی انفرادیت ہے۔ بازاروں میں بڑی گہما گہمی رہتی ہے، گلبرگ کے درختوں سے گھرے ہوئے علاقے میں زندگی بڑی پُرسکون ہے اور شہر کے بڑے بازاروں میں، جہاں نئی اور پرانی دکانیں ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی ہیں، ہر وقت رونق رہتی ہے۔ پھیری والے، رس بھرے پھل، کھلونے، چمکتے، دمکتے ہار اور دوسری چیزیں بیچتے پھرتے ہیں۔ یہاں ضرورت کی ہر چیز مل جاتی ہے۔ گلی گلی آلتی پالتی مارے درزی بیٹھے ہیں جو ہر کام کرنے کو تیار ہیں خواہ ٹوٹا ہُوا بٹن لگانا ہو یا اچانک پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت۔

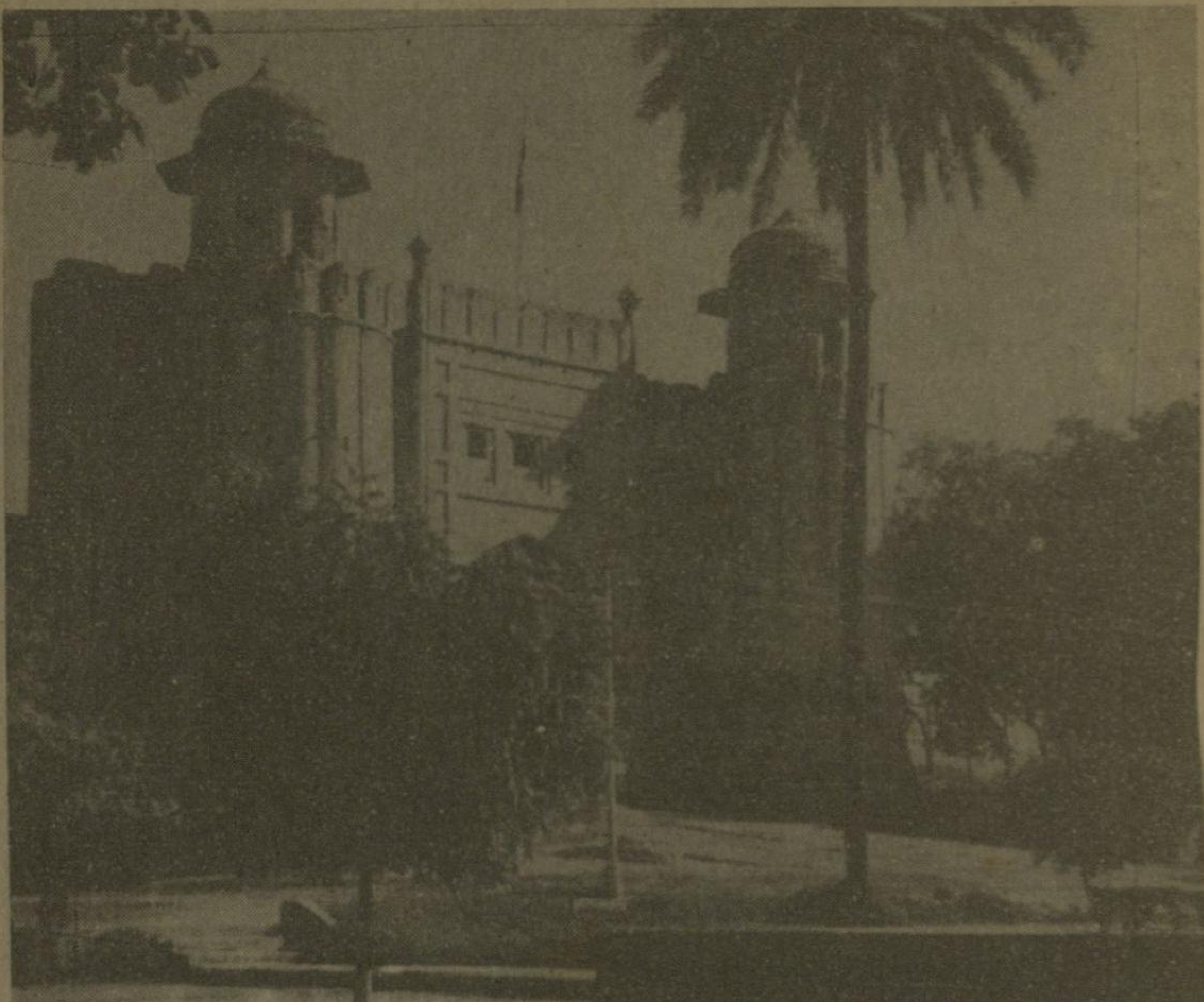
لاہور میں ہر طبقے کے لوگ آباد ہیں۔ باہر سے آنے والوں سے نہایت محبت سے پیش آتے ہیں۔ فطرتاً صاف گو ہیں اور ہر بات پر اپنی رائے کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ یہ لوگ داستانوں کے رسیا ہیں۔ یہاں پرانے دور، خوشیوں، جنگوں، اور رُوحانی کہانیاں آج بھی سننے کو ملتی ہیں۔ اس علاقے کے رومان کو ہمایوں، اقبال اور موجودہ دور کے شاعروں نے شاعری کے روپ میں ڈھالا ہے اور یہ نغمے آج بھی گائے جاتے ہیں۔

سایہ دار درختوں سے ڈھکی، بل کھاتی مال پر دھیمی دھیمی باتوں کی آواز آتی ہے اور ہلکے

ہلکے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے۔ صبح نور کے تڑکے سے شام ڈھلنے تک لاہور کی اس سیرگاہ پر رونق رہتی ہے ...... یہ سابق پنجاب کا علاقہ ہے اور مغربی پاکستان کا دارالحکومت پنجاب کے لوگ لاہور کو "پاکستان کا دیوان خانہ" کہتے ہیں۔

لاہور کے باسیوں کو اپنے شہر سے اس قدر محبت ہے کہ وہ ساری دنیا گھوم آئیں اور دوسرے ملکوں کی خوبصورتی سے متاثر بھی ہوں، لیکن واپسی پر یہی کہتے ہیں ..... "مشرق ہو یا مغرب، لاہور لاہور ہے۔" شام کو شیزان یا ہیکو (Hico) ریستوران میں چائے پیتے ہوئے آپ پنجاب کے جوانوں، سیّاحوں اور پاکستان کے کونے کونے سے آئے ہوئے لوگوں کو شلوار قمیض پہنے دیکھ سکتے ہیں۔ ساڑھیوں میں ملبوس خواتین مغربی لباس پہنے مردوں کے ساتھ آتی ہیں۔ شوٹنگ کا لباس زیبِ تن کیے فلمی ستارے بڑی بڑی دکانوں میں خرید و فروخت کرتے نظر آتے ہیں۔ یہ شہر اس قدر خوبصورت ہے کہ وہ سیّاح بھی جو یہ دعوےٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے ہر چیز دیکھ رکھی ہے، یہاں زیادہ سے زیادہ قیام پسند کرتے ہیں اور اگر موقع مل جائے تو کون نہ ٹھہرے؟ لاہور میں نئی نئی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ گلیوں میں رہنے والی لڑکیاں پردہ سیمیں کی شہزادیاں بن جاتی ہیں اور دلفریب ماحول میں اجنبی خود کو بڑا بلند محسوس کرتے ہیں۔ کہا جاتا ہے رات کو معجزے ظہور میں آتے ہیں اور سیر کرنے والا وسیع حال اور ماضی کا حصّہ بن جاتا ہے۔ فضا کی سنجیدگی دل اور رُوح پر چھا جاتی ہے۔

کراچی سے سات سو پچاس میل دور، لاہور مغربی پاکستان کی سیر کی خصُوصیت ہے۔ کراچی سے جدید ایئر کنڈیشنڈ ریلیں چلتی ہیں اور سفر چوبیس گھنٹے سے بھی کم کا ہے۔ راستے میں ٹرین مختلف اسٹیشنوں پر رکتی چلتی ہے جہاں لوگ چوڑیاں، پھل اور نوادرات بیچتے ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے کے جہاز سے یہی سفر دو گھنٹہ پچیس منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔ جہاز روزانہ صبح چھ بجے روانہ ہوتا ہے اور لاہور



شاہی قلعہ، لاہور

پہنچنے سے پہلے بڑا لذیذ ناشتہ دیا جاتا ہے۔

لاہور مغلیہ فنِ تعمیر کا شہر ہے۔ تاریخی طور پر راجہ جے پال کے عہد میں (۹۰۰ء سے ۱۰۰۲ء تک) یہ طاقت کے مرکز کی حیثیت سے ابھرا۔ بعد میں جے پال کی فوجوں کو شکست ہو گئی اور لاہور فاتحین کا دارالخلافہ بن گیا۔ اگلی پانچ صدیوں میں لاہور پر خاندانِ غلاماں، تغلق، سیّد اور لودھی بادشاہوں نے باری باری حکومت کی۔ لودھی خاندان کا خاتمہ اُس وقت ہُوا جب پنجاب میں دولت خاں لودھی نے کابل کے بادشاہ کے خلاف مدد کی درخواست کی۔ ترکستان میں پیدا ہونے والے بابر

نے، جو چنگیز خاں کے خاندان سے تھا، یہ درخواست قبول کر لی اور دشمن بادشاہ کو شکستِ فاش دی، بابر نے اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا اور ۱۵۲۶ء میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ ۱۵۳۰ء میں بابر کے انتقال کے بعد تخت اُس کی اولاد کو ملا۔ انہوں نے پنجاب اور کابل پر حکومت کی اور مشہورِ زمانہ جرنیلی سڑک تعمیر کرائی۔ ۱۵۸۵ء میں مغل شہنشاہ اکبر نے لاہور کو اپنا دارالمقام بنایا۔ لاہور کے قلعہ کی مضبوطی اور خوبصورتی اکبر کی مرہونِ منت ہے جس نے مٹی کے قلعہ کی پتھر سے دوبارہ تعمیر کرائی۔ اکبر کے بیٹوں اور پوتوں نے اپنے عہد میں اس کی خوبصورتی میں اضافہ کیا۔ سیّاح قلعہ میں شیش محل کی صناعی دیکھ کر دنگ رہ جاتے ہیں۔ محدب شیشوں کے ٹکڑے آج بھی صدیوں پہلے کی طرح جگمگاتے ہیں۔ قلعہ میں ایک قابلِ ذکر چیز شاہ برج دروازہ ہے جس کی دیواروں پر تصویریں بنی ہوتی ہیں۔ پلاسٹر پر بنی ہوئی یہ تصویریں مغلوں کے کھیلوں کی تفصیل بیان کرتی ہیں۔

اکبر کے عہد میں ایک رقاصہ انارکلی اُس کے بیٹے شہزادہ سلیم، جو بعد میں جہانگیر کے نام سے مشہور ہُوا، کی محبت میں گرفتار ہو گئی۔ شہزادہ نے بھی محبت کا جواب محبت سے دیا۔ اکبر نے ایک دن جب انارکلی اور شہزادہ کو ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے ہوئے دیکھا تو اُسے اُن کی محبت کا علم ہو گیا۔ اکبر کو یہ دیکھ کر سخت طیش آیا کہ ایک کنیز اُس کے بیٹے سے محبت کرنے کی جرأت کر سکتی ہے اُس نے انارکلی کو سزائے موت دی اور حکم دیا کہ اُسے دیوار میں زندہ چنوا دیا جائے۔ اِس افسوسناک واقعہ سے شہزادہ سلیم کا دل ٹوٹ گیا۔ کئی سال بعد جب وہ بادشاہ بنا تو اُس نے مقبرہ پر نہایت خوبصورت سفید اور قرمزی گنبد تعمیر کروایا۔ یہ یادگار لاہور کے وسط میں آج بھی قائم ہے اور انارکلی کے مقبرہ کے نام سے مشہور ہے۔ ہزاروں سیّاح اِسے دیکھنے آتے ہیں۔ مقبرہ کے ایک طرف خدا کے ننانوے صفاتی نام لکھے ہوئے ہیں اور دوسری طرف جہانگیر کے اشعار ہیں جو اُس کے دُکھی دل کی پکار ہیں.........

"آہ، اگر ایک بار میں اپنی محبوبہ کا چہرہ
اور دیکھ سکتا تو قیامت تک خدا کا شکر
ادا کرتا"

وقت گزر گیا ہے لیکن انار کلی کی یاد آج بھی باقی ہے ایک بڑا بازار اُس کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں امیر و غریب سب ہی آتے ہیں اور صبح سے شام تک خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جہانگیر کا مقبرہ، جو ۱۶۳۷ء میں اس کے بیٹے شاہجہاں نے تعمیر کرایا، وسیع باغوں کے درمیان واقع ہے۔ جو روایتی مغلیہ انداز میں بچھائے گئے ہیں۔ روزانہ یہاں سینکڑوں لوگ آکر دُعا مانگتے ہیں اور سرسبز میدانوں میں پکنک مناتے ہیں۔

لاہور کی عظمت کا اندازہ خوبصورت شالامار باغ کو دیکھ کر ہوتا ہے جو شہر کے مشرق میں تین میل دور جرنیلی سڑک پر واقع ہے۔ یہ شاہی باغ بادشاہوں کی لاہور میں آمد کے موقعہ پر رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسے ۱۶۶۷ء میں شہنشاہ شاہجہاں نے تعمیر کرایا۔ یہ ایرانی انداز میں بنا ہوا ہے۔ باغ کے چاروں طرف پختہ دیوار ہے جس کے کونوں پر گنبد بنے ہوئے ہیں۔

خوبصورت نہروں کے درمیان سنگِ مرمر کا پویلین ہے، جگہ جگہ فوارے لگے ہیں اور چاروں طرف سرو کے درخت ہیں۔ اس باغ کا نقشہ مشہور انجینئر علی مردان خاں نے بنایا تھا جسے پنجاب کا مغل وائسرائے مقرر کیا گیا تھا۔ باغ میں سات تختے تعمیر کئے گئے تھے جن میں سے چالیس ایکڑ کے رقبہ میں تین تختے آج بھی باقی ہیں۔ چار تباہ ہو گئے ہیں۔ شالامار باغ سترہ مہینے اور چار روز میں تعمیر ہوا اور اس پر چھ لاکھ روپے صرف ہوئے۔

یہ مستطیل نما باغ مربعوں میں بٹا ہوا ہے۔ درمیان میں پانی کا تالاب ہے جس کے چاروں

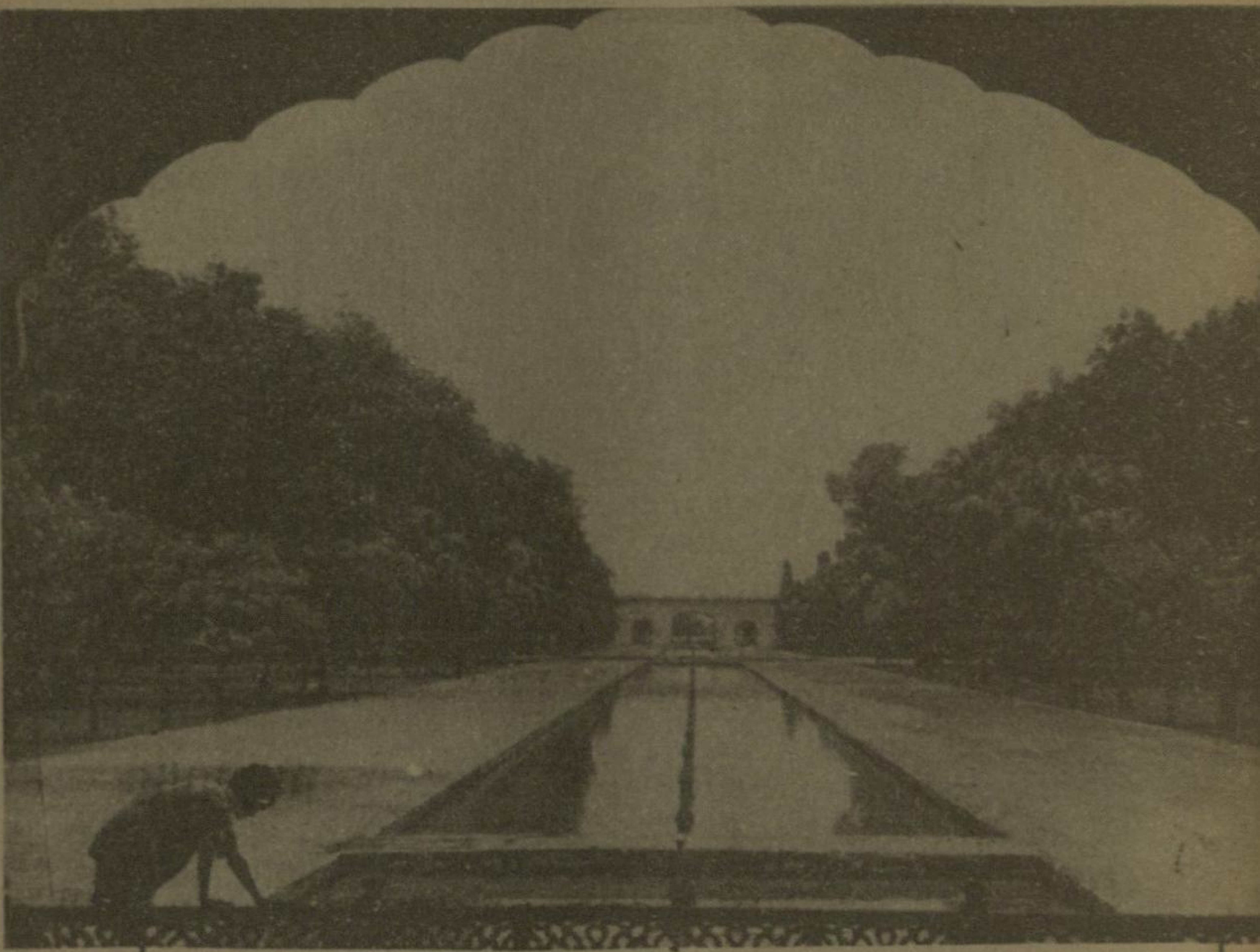
طرف کنگورے دار حاشیہ ہے اور جا بجا فوارے لگے ہوئے ہیں۔ پانی آبشار کی صورت میں سنگِ مرمر کے ٹکڑوں پر سے بہتا ہے جن کے پیچھے بلب لگا کر روشنی کی جاتی ہے۔ باغ کی فقید المثال خوبصورتی سے متاثر ہو کر شہنشاہ اورنگ زیب کی شاعرہ بیٹی زیب النسا نے لکھا!

"اے آبشار! تو کس کی یاد میں آنسو بہاتی ہے؟

کس کی یاد نے تیرے ماتھے پر بل ڈال دیئے ہیں؟

وہ کیا درد ہے جس سے تو میری
طرح مجبور ہو کر تمام رات پتھر
سے اپنا سر پٹکتی ہے اور آنسو
بہاتی ہے؟"

شالامار میں ہر سال مارچ میں میلہ چراغاں منعقد ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر بھانت بھانت کے لوگ نظر آتے ہیں۔ غریب اور امیر سب ہی تفریح کے لئے آتے ہیں۔ میلہ میں داخلہ کا کوئی ٹکٹ نہیں ہوتا۔ مغل بادشاہوں کی بنوائی ہوئی عمارات قیمتی ورثہ ہیں۔ آخری عظیم مغل شہنشاہ اورنگ زیب کی بنوائی ہوئی بادشاہی مسجد عظمت کا مرقع ہے۔ سرخ پتھر سے بنے ہوئے اس کے چار بلند مینار سنگِ مرمر کے تین گنبدوں کے مقابلے میں بڑا خوبصورت تضاد پیش کرتے ہیں۔ مسجد کی بائیں جانب فلسفی شاعر علامہ اقبال کا مزار ہے جس نے سب سے پہلے پاکستان کا نظریہ پیش کیا۔ لاہور میں بے شمار مساجد ہیں۔ اُسی دور سے تعلق رکھنے والی دائی انگا کی مسجد اور چوبرجی اپنے خوبصورت فنِ تعمیر کے لئے مشہور ہیں۔ غالب نے اسے متاثر ہو کر لکھا تھا: "مسجد کے سائے میں محبت، جذبات اور گناہ کو بھی پروان چڑھنا چاہیئے تاکہ زندگی کے پلڑے برابر ہو سکیں"۔ انگریز شاعر ملٹن نے کافی وقت لاہور میں گزارا اور اپنی تحریروں میں اس کی تعریف کی۔ [ڈیارڈ کپلنگ لاہور



شالامار باغ

کے مشہور اخبار سول ملٹری گزٹ کا ایڈیٹر تھا۔ اب یہ اخبار مالک اور کارکنوں کے تنازعہ کی وجہ سے بند ہو چکا ہے۔ مالک نے ان کے حقوق پر پیسے بچانے کو ترجیح دی۔ بہر حال دروازے پر اب بھی ایک تختی لگی ہے جس پر لکھا ہے۔ "یہاں رڈیارڈ کپلنگ نے کام کیا"

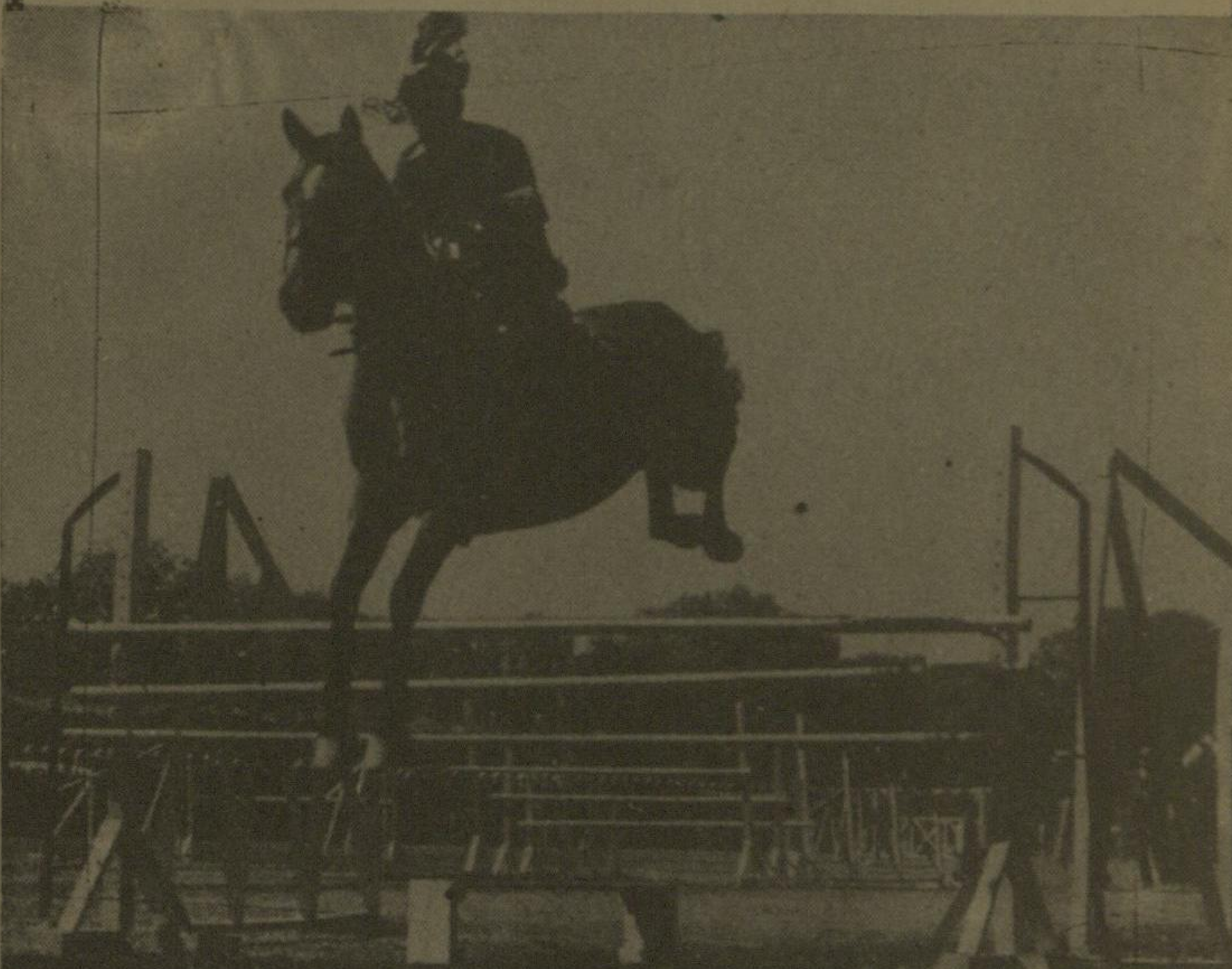
پرانی چیزوں کی جگہ نئی چیزوں نے لے لی ہے۔ ۲۶، نومبر ۱۹۶۴ء کو لاہور میں ٹیلیویژن شروع ہو گیا۔ اس سے اب لوگوں کی معلومات اور سمجھ بوجھ میں اضافہ ہو گا۔ پروگراموں کا انتخاب نہایت احتیاط سے کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ بھی یہاں دلچسپی کی بے شمار چیزیں ہیں۔ چیکوسلاواکیہ

کی حکومت نے کٹھ پتلیوں کی نمائش کی ہے۔ یہ مظاہرہ مال روڈ پر پاکستان آرٹس کونسل میں مفت کیا گیا تھا۔

لاہور کے لوگ، خواہ وہ جواں ہوں یا بوڑھے، بسنت پنچمی کے زمانے میں، جو جنوری کے ختم پر ہوتا ہے، پتنگ اڑاتے ہیں۔ اس موقعہ پر جوش وخروش دیکھنے والا ہوتا ہے۔ لوگوں کے گروہ مقابلوں میں حصّہ لینے کے لئے منٹو پارک، بھاٹی اور موچی دروازہ پر جمع ہو جاتے ہیں۔ یہ مقابلے اتنے مقبول ہیں کہ صرف ایک دن میں پچیس ہزار لوگوں نے بیس ہزار روپیہ داخلے کے ٹکٹوں پر صرف کئے۔ ہر سال زیادہ سے زیادہ لوگ اس تہوار میں شرکت کرتے ہیں، جس کی ابتدا انیسویں صدی میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں ہوئی تھی۔ ایک اور مقبول مشغلہ دریائے راوی میں کشتی رانی ہے۔ یہ دریا میلوں بل کھاتا ہوا چلا جاتا ہے۔ دریا میں جگہ جگہ کشتیاں رکھی ہوتی ہیں۔ دسمبر سے مارچ تک لاہور میں اچھی خاصی سردی پڑتی ہے۔ موسم بہار کی گرم گرم دھوپ میں سارا شہر نہا جاتا ہے اور سردیوں میں بھی روز دھوپ چمکتی ہے۔ اپریل کے بعد موسم گرم ہو جاتا ہے لیکن یہ گرمی بھی صحت بخش ہے۔ جولائی اور اگست میں بارش ہوتی ہے۔

فروری میں لاہور میں ہارس شو ہوتا ہے، جو دنیا بھر میں مشہور ہے۔ اس موقعہ پر ہمیشہ بڑے بڑے لوگ آتے ہیں۔ افتتاح کے وقت عظیم الشان بینڈ دھنیں بکھیرتا ہے اور سارا منظر اس قدر پرسکون ہوتا ہے گویا مغل شہنشاہ زمین پر اتر آتے ہوں۔ دوسرے سازوں کے ساتھ بیگ پائپ (BAG PIPE) بھی ہوتے ہیں اور گھڑسواروں کی وردی ایسی ہوتی ہے گویا کوئی رسم تاجپوشی ہو رہی ہو۔ بہترین بیلوں، گھوڑوں اور گایوں کے انتخاب کے علاوہ رقص کرتے ہوئے اونٹ، پھولدار چادروں سے ڈھکی ہوئی گھوڑیاں اور سفید عربی گھوڑے بھی دیکھنے کی چیز ہیں۔

گلستانِ فاطمہ کے اوپن ایئر تھیٹر میں منعقد ہونے والے ڈرامے اور موسیقی کے مقابلے بھی



لاہور کے ہارس اینڈ کیٹل شو کا منظر

دلچسپی کے مواقع مہیا کرتے ہیں۔ لاہور جمخانہ کا ماحول بڑا دوستانہ ہے اور مہمانوں کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ یہاں اکثر باہر سے آنے والے طائفے اپنے فن کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ عجائب گھر اور آرٹس کونسل کے دروازے سب کے لئے کھلے ہیں۔ یہاں ہر ہفتہ نمائشیں ہوتی ہیں۔ حکومت کی کھولی ہوئی دست کاری کی دکانیں بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ایک اور قابل دید جگہ پنجاب پبلک لائبریری ہے جو ۱۸۸۴ء میں قائم ہوئی تھی۔ یہ تاریخی عمارت وزیر خاں نے تعمیر کرائی تھی جس نے مشہور مسجد وزیر خاں بھی بنوائی تھی۔ لائبریری میں مشرقی علوم پر کتابیں ہیں جن میں عربی، فارسی، ترکی اور اردو

کی کتابیں شامل ہیں۔ اِن کے علاوہ برطانوی عہد کی بے شمار کتابیں ہیں اور اُس دور کے متعلق سرکاری گزٹ ہیں۔ عربی کی چار ہزار کتابوں کے علاوہ محققّوں کے لئے سنسکرت، بدھ مت اور عیسائیت پر نایاب نسخے ہیں، تقریباً آدھی کتابیں قرآن حکیم کی تفسیریں ہیں۔

لاہور اپنی تعلیمی سہولتوں کے لئے مشہور ہے اور یہاں دُور دُور سے طالب علم آتے ہیں۔ لاہور میں پنجاب یونیورسٹی، ایڈورڈ میڈیکل کالج۔ لڑکیوں کے لئے کوئین میری کالج۔ لا کالج، اورینٹل کالج، انجینئرنگ کالج اور لاتعداد اسکول ہیں۔ فنّی تعلیم کے لئے بہت سے ادارے، ریڈیو انسٹی ٹیوٹ اور نیشنل آرٹس کالج ہے۔ تعلیم کے معاملے میں لاہور تمام شہروں پر فوقیت رکھتا ہے۔

لاہور کا ماحول ثقافتی ہے اور پاکستان میں کوئی دوسرا ضلع ایسا نہیں جو سیاسی اور روشن خیالی کے اعتبار سے اس سے لگّا کھاتا ہو۔ لاہور ہی میں ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو قائدِ اعظم محمد علی جناح نے آل انڈیا مُسلم لیگ کے اجلاس میں پاکستان کی تاریخی قرارداد اختیار کی تھی۔ لاہور ہی وہ شہر ہے جہاں سب سے پہلے ہندوستان کے ظلم و ستم کے ستائے ہوئے مہاجرین آئے اور اُن کا خیر مقدم کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء کے بعد سے لاہور، جو پہلے پنجاب کا دارالخلافہ تھا، مغربی پاکستان کا سرکاری دارالحکومت بن گیا۔ یہاں گورنر رہتا ہے جو کمشنروں اور دوسرے قابل افسروں کے ساتھ تمام انتظام سنبھالتا ہے۔

لاہور میں بے شمار اچھے ہوٹل ہیں اور بہت سے نئے بن رہے ہیں۔ پارک لگژری (جو کراچی کے مشہور ہوٹل بیچ لگژری کے مالک مسٹر اویری کی ملکیت ہے) وسیع باغات سے گھرا ہُوا ہے اور اُس کے کمرے چھوٹی چھوٹی کٹیاؤں کی طرح ہیں۔

مشہور قدیم ہوٹل فلیٹیز میں ہر طرح کے لوگ آتے ہیں۔ یہاں ہر رات کیبرے ہوتا ہے۔ نوجوان فن کاروں پر مشتمل بڑا عمدہ آرکسٹرا ہے جو بلیو نوٹس (Blue Notes) کے نام سے مشہور ہے۔ اُن کی یادداشت بے حد تیز ہے۔ جب کبھی کراچی یا دنیا کے کسی حصّہ سے

آیا ہوا مہمان کھانے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے تو سوچتا ہے! "میں تو یہاں کسی کو نہیں جانتا، میں اُس کونے میں بیٹھ جاؤں گا۔" اچانک اُس کا محبوب نغمہ فضا میں گونجتا ہے۔ "یہ میرا نغمہ ہے" وہ خود سے سرگوشی کرتا ہے۔ "انہیں اِس کا علم کیسے ہو گیا؟"

یہ لوگ صرف مہمان کو پہچانتے ہی نہیں بلکہ اُس کی پسند بھی یاد رکھتے ہیں۔ ہوٹل کے وسیع میدانوں اور صاف ستھرے کمرے دیکھ کر بڑا سکون ہوتا ہے۔ فلیٹیز میں ہی لوگ اپنے دوستوں سے ملنے کا پروگرام بناتے ہیں۔

ہوٹل کے برآمدے میں نوادرات کی دکان ہے جس کا نام اورینٹل سٹورز ہے۔ اِس کے خوش مزاج بوڑھے مالک کو اس بات کی پرواہ نہیں کہ آیا آپ کچھ خریدتے ہیں یا نہیں۔ وہ تو صرف یہ چاہتا ہے کہ آپ دکان میں گھومیں، چیزوں کو چھو کر دیکھیں، انہیں پرکھیں اور خریدنے سے پہلے انہیں پسند کریں۔ وہ تو کہتا ہے "اگر اِس وقت آپ کے پاس پیسے نہیں تو کوئی حرج نہیں آپ چیزیں لے جائیے۔" اُسے معلوم ہے کہ دوبارہ آنے پر آپ حساب چکا دیں گے۔ جب میں آخری بار وہاں گئی تو اُس کا نوجوان بھانجا اُن تمام خوبیوں کے ساتھ دکان چلا رہا تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا گویا میں اپنے پرانے گھر لوٹ آئی ہوں، لیکن بوڑھا مالک جنت کو سدھار چکا تھا۔ مجھے یہ جان کر بے حد افسوس ہوا لیکن اس کا جذبہ اور خیالات آج بھی موجود ہیں اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ دکان میں موجود ہے جس سے اُسے بے حد محبت تھی۔

نئے ایمبسڈر ہوٹل میں کرایہ چالیس روپیہ یومیہ ہے۔ یہ ائیرکنڈیشنڈ ہے اور تمام سہولتیں میسر ہیں۔ ہوائی اڈہ کے نزدیک زنوبی کا ماحول بڑا مانوس ہے اور امپریل اور والڈورف میں کرایہ پچیس روپیہ یومیہ ہے جس میں ناشتہ بھی شامل ہے۔

خوشنما انڈس ہوٹل میں ساڑھے تیئس روپیہ میں کمرہ مل جاتا ہے جس میں سروس کے علاوہ

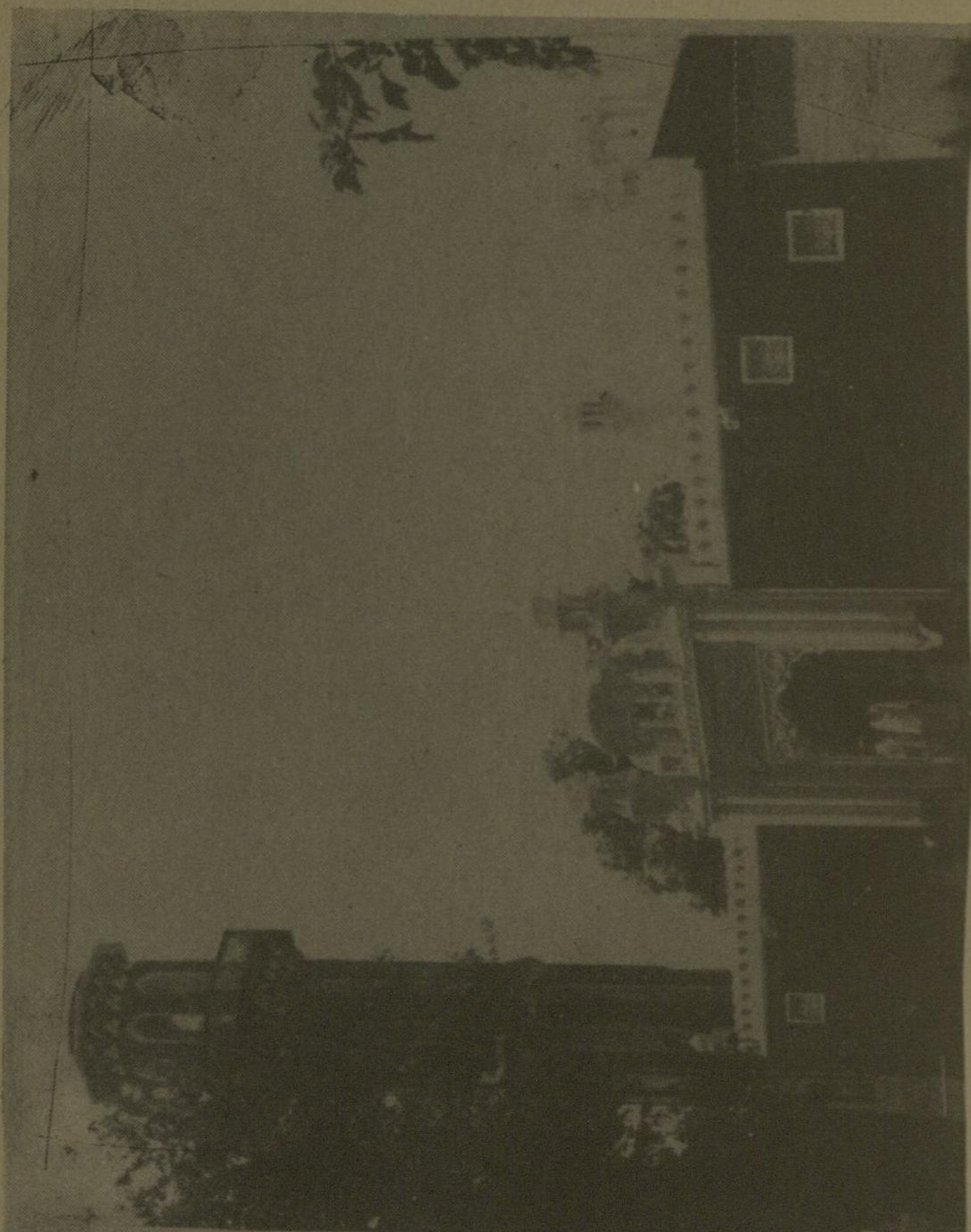
ناشتہ بھی شامل ہے۔ اِس کا ماحول بڑا عمدہ ہے اور اُن کے گیلکسی (Galaxy) ریسٹورنٹ میں مشرقی اور مغربی طرز کے لذیذ کھانے ملتے ہیں۔ یہاں فلمی دنیا کے تمام لوگ آتے ہیں۔ انڈس مال روڈ کے وسط میں واقع ہے اور یہاں سے ہر جگہ نزدیک ہے۔ اِس کے خوش مزاج مینیجر سردار طفیل ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ مہمانوں کو ہر قسم کا آرام میسّر ہو۔

کم خرچ کے لئے، برگینزا اور بینٹ میں بالترتیب بارہ اور تیرہ روپے لئے جاتے ہیں۔ یہ کشادہ ہوٹل ہیں اور کمرے آرام دہ ہیں۔ مناسب ہوگا کہ آپ کمرے پہلے سے مخصوص کرا لیں۔ اُوپر دیئے ہوئے کرائے غیر ایئر کنڈیشنڈ کمروں کے لئے ہیں۔ اچھے ہوٹلوں میں ایئرکنڈیشنڈ کمرے دس روپیہ زیادہ پر مل جاتے ہیں۔

سواری کے لئے لاہور میں رکشہ اور ٹیکسیاں ہیں جن کا فی میل کرایہ بے حد سستا ہے۔ انتیس راستوں پر ساڑھے تین سو بسیں چلتی ہیں اور سارے شہر کا چکّر لگاتی ہیں۔

لاہور سے بے شمار اخبارات نکلتے ہیں۔ انگریزی کے روزنامہ پاکستان ٹائمز میں تمام تازہ خبریں اور بیرونی نمائندوں کی بھیجی ہوئی خبریں ہوتی ہیں۔ نوائے وقت اور اردو کے دوسرے اخبارات صبح اور شام شائع ہوتے ہیں۔ اِن کے علاوہ اردو، پنجابی، پشتو اور انگریزی کے پچاس کے لگ بھگ ماہنامے بھی نکلتے ہیں۔ لاہور میں ستّر چھاپہ خانے ہیں جن میں پیکچرز لمیٹڈ، فیروز سنز، مکتبہ جدید پریس اور گورنمنٹ پرنٹنگ پریس شامل ہیں۔ یہاں پاکستان کے تمام مشہور ناشروں کے صدر دفتر بھی ہیں۔ چالیس کے قریب نئے اور پرانے سینما گھروں میں تازہ ترین فلموں کی نمائش ہوتی ہے۔

لاہور میں ہر سیّاح کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ انہیں فلمی نگار خانوں کی سیر بھی کرائی جاتی ہے۔ یہاں ہالی ووڈ کی طرح تمام ساز و سامان موجود ہے گو اُتنے بڑے پیمانے پر کام



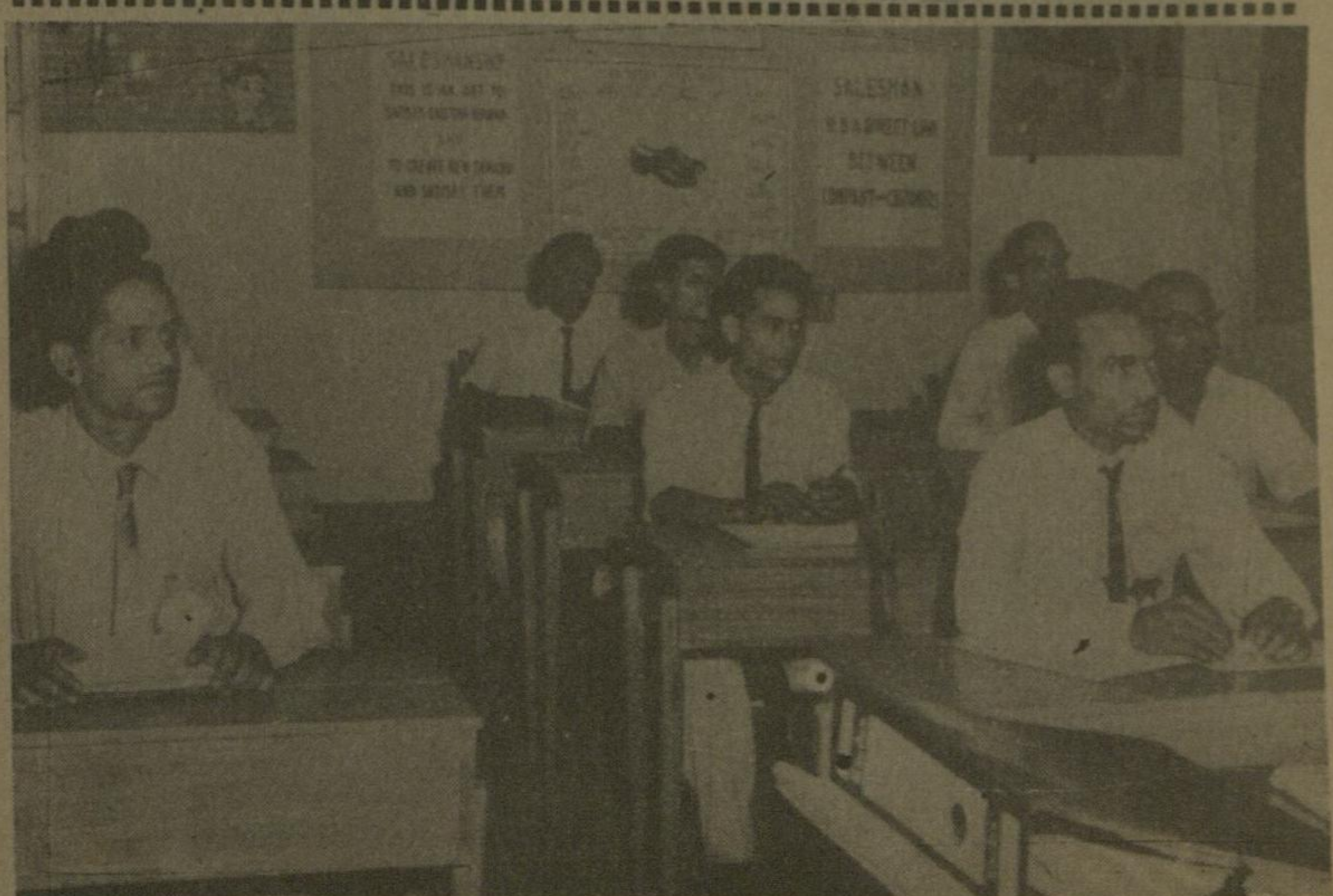
باٹا پور کی مسجد

نہیں ہوتا۔ لاہور میں سیّاحوں کے لئے نگارخانوں کی سیر کرنا اور فلمیں بنتے دیکھنا برطانیہ اور امریکہ کی نسبت بے حد آسان ہے۔ پنجابی بڑے یار باش اور دوست نواز لوگ ہیں اور آپ کی دلچسپی کو اپنی دلچسپی سمجھتے ہیں۔

یہ دلچسپی بھی دیکھنے سے تعلّق رکھتی ہے۔ ایک روز میں پی۔ آئی۔ اے (P I A) کے دفتر سے نکل رہی تھی کہ میری جیکٹ دروازے میں اٹک گئی۔ توبہ، توبہ، کس بُری طرح پھٹی ہے! میں اس حلیئے میں عجب ہی دکھائی دیتی تھی اور اب آگے سیر کرنا میرے لئے ناممکن تھا۔ اچانک میری نظر ایک درزی پر پڑی جو شاہ دین بلڈنگ کے دروازے میں قالین پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا۔ اُس نے میری پریشانی بھانپ لی اور چند ہی منٹ میں اُس نے کھونچ کو نہایت نفاست سے سی دیا۔ میں قسم کھاتی ہوں کہ اس کے ہر ٹانکے میں خلوص پرو دیا ہُوا تھا۔ وہ اس کام کے پیسے بھی نہیں لینا چاہتا تھا۔ اُس کا نام دیر تھا۔ اِس کا تلفظ ڈیر (dear) سے ملتا ہے اور میں بھی اُسے ایسا ہی محسوس کرتی ہوں۔ چند روز بعد میں اس کی چھوٹی سی دکان میں گئی اور اپنے لئے بہت سے کپڑے سلوائے۔ دوسرے ممالک میں یہ بات یقیناً اتنی آسان نہیں تھی۔ تمام سیّاحوں کے لئے خواہ وہ پاکستانی ہوں یا غیر ملکی، یہ درزی نہایت عمدہ کام کرتے ہیں۔

جب آپ لاہور آتے ہیں اور ہوٹل کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تو اس بات کا اطمینان کر لیجئے کہ آپ کے پاس یوتھ ہوسٹل کا کارڈ موجود ہے (یہ کارڈ ساری دنیا میں کارآمد ہے) اکیس سال تک کے لوگوں سے ایک روپیہ، چوبیس سال تک کے لئے دو روپیہ اور اس سے زیادہ عمر کے لوگوں سے ممبر بننے کے پانچ روپے لئے جاتے ہیں۔ آپ ساٹھ سال کے ہی کیوں نہ ہوں پھر بھی یوتھ ہوسٹل میں شامل ہو سکتے ہیں اور اس کارڈ کے ذریعہ تمام یورپ، امریکہ، مشرق بعید،




SALESMANSHIP
SALESMAN

برطانیہ، متحدہ عرب جمہوریہ اور بہت سے ممالک کے علاوہ آپ تمام پاکستان میں کسی بھی یوتھ ہوسٹل میں ٹھہر سکتے ہیں۔ میرے خیال میں یہ بڑا سستا سودا ہے اور اس میں لطف بھی بے حد آتا ہے۔ ہر عمر کے لوگوں سے ملنا ہو جاتا ہے اور مختلف اقوام کے لوگوں سے واقفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا صدر دفتر لاہور میں ہے۔ پتہ کے لئے صرف سیکرٹری، پاکستان یوتھ ہوسٹلز ایسوسی ایشن، لاہور لکھ دینا کافی ہے یا ۶۸۸۰۵ پر فون کریجئے اور آپ کو تمام معلومات حاصل ہو جائیں گی۔ ابتدا میں یوتھ ہوسٹل صرف طالب علموں کے لئے شروع کیا گیا تھا، لیکن اگر آپ کی امنگیں جوان ہیں تو یہ آپ کے لئے بھی حاضر ہے۔

خوبصورت بازار لاہور کی بے شمار دلچسپیوں میں سے ایک ہیں۔ زیورات، عمارتی لکڑی، برتن، مشینری اور بہت سی چیزوں کے علیحدہ علیحدہ بازار ہیں۔ دہلی دروازے کے باہر کھالوں اور چرم کا بہت بڑا بازار ہے، جس کے گرد بیٹھے ہوئے سبزی اور پھل فروش بالکل الف لیلائی ماحول پیش کرتے ہیں۔ خرید و فروخت کرتے ہوئے سیّاح سیخ کباب کی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں دہکتے ہوئے انگاروں پر دُنبہ بُھنتے ہوئے دیکھ سکتے ہیں۔ گرم گرم روٹیوں کے ساتھ اِس کا بہت لطف آتا ہے۔ اس کے ساتھ دہی بھی دی جاتی ہے جو اس مشرقی کھانے کی لذّت کو دوبالا کر دیتی ہے

لاہور کے گرد و نواح میں چمڑے اور جوتے بنانے کے باٹا اور سروس کے بڑے بڑے کارخانے ہیں۔ باٹا کی تاریخ بڑی دلچسپ ہے۔ شہر سے دس میل دور باٹا پور ہے، جسے عمدہ جوتوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ یہ شہر سارے پاکستان کے لئے جوتے مہیّا کرتا ہے۔ پچیس سال پہلے اس کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ یہ سارا قطعہ بالکل بنجر تھا اور گھاس کی ایک پتّی تک نہ اُگتی تھی چند غریب دیہاتی ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیوں میں رہتے تھے اور آس پاس کا علاقہ اس قدر ویران تھا کہ یقین نہیں آتا کہ زندگی سے بھرپور یہ شہر کس طرح اُبھر آیا۔ کہانیوں میں تو کیوں د۔یہاں



باٹا پور میں سیلز مین کی تربیت

حنسلا ٹ ٹ) کا دادا، جو موچی تھا، جوتے بناتے وقت ہزاروں لوگوں کو مسحور کر دیتا تھا۔ اب باٹا کے لاتعداد کام کرنے والے اپنی مشینوں کے استعمال سے ہزاروں دیکھنے والوں کو مسحور کرتے ہیں۔

باٹا کا ادارہ، جو اپنے ترقی پسند نظریہ کی بنا پر ساری دنیا میں مشہور رہا ہے۔ ہندوستان اور مشرق بعید کے ممالک کو جوتوں کی اہمیت کا احساس دلانا چاہتا تھا۔ چنانچہ ۱۹۳۰ء کے عشرے کے آخر میں ہندوستان میں کارخانہ شروع کیا گیا۔ اس کے جوتوں کو فوری مقبولیت

حاصل ہوئی اور ۱۹۴۲ء میں لاہور کے باہر ایک گودام قائم کیا گیا۔ آزادی کے بعد اس کی توسیع کی گئی جو آج بھی جاری ہے۔

اُس زمانے میں اِس کے ڈائریکٹر نوجوان اور پرجوش مسٹر ڈولیزل تھے جو چیکوسلاواکی نژاد پاکستانی شہری ہیں۔ باٹا فیکٹری قائم کرنے کی راہ میں بے شمار دشواریاں تھیں لیکن چند یورپی ماہروں کی مدد سے انہوں نے اُن تمام مشکلات پر قابو پالیا جنہیں دیکھ کر بہت سے لوگ ہمت ہار بیٹھتے۔ جلد ہی اِس ملک میں مشینوں سے آراستہ پہلی جوتوں کی فیکٹری قائم ہوگئی، اور گاؤں کے لوگوں کے لئے ملازمت کے دروازے کھل گئے۔ ڈولیزل کو معلوم تھا کہ اگر کارکنوں کو خوش رکھا گیا تو پیداوار بہت بڑھ جائے گی۔ اُنہوں نے بچّوں کے لئے اسکول تعمیر کرائے اور جلد ہی برادری کا ماحول پیدا ہوگیا۔ کچھ عرصہ بعد مسجد، ڈاکخانہ اور ہسپتال تعمیر کئے گئے۔ کھیلوں اور تفریح کے لئے میدان بنائے گئے اور لاہور کے اِس نواحی ویران علاقہ میں زندگی پیدا ہوگئی اور اِس کا نام باٹا پور پڑ گیا۔ لوگوں کی زندگی پُرسکون اور سودمند ہے۔ اِس کے تین ہزار چھ سو ملازم پاکستان کے دونوں صوبوں سے تعلّق رکھتے ہیں۔ یہ لوگ بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر باٹاپور کے بیس ہزار مکینوں کی مدد کرتے ہیں جن میں سے بہت سے دکاندار ہیں۔ اُن کی دکانوں میں روزمرّہ کے استعمال کا تمام سامان موجود ہے۔ باٹا کے کارکنوں کے چار سو بچّے جدید طرز کے باٹا ماڈل اسکول میں پڑھتے ہیں۔ تمام بچّے جوتے پہنتے ہیں جس کی کسی زمانے میں انہیں عادت نہیں تھی۔

نوّے ایکڑ کے علاقے میں، جو ہندوستان کی سرحد سے صرف چار میل دور ہے، خوبصورت مکانات بنے ہوئے ہیں۔ عملہ کے پچاس فیصد لوگ کمپنی کے گھروں میں رہتے ہیں۔ گھروں کے گرد پھول لہلہاتے ہیں، پچھلے صحن میں مُرغیاں اور بکریاں پالی جاتی ہیں اور پھولوں کے ساتھ



ساتھ سبزیاں اُگی ہوئی ہیں۔ تمام ملازمین کمپنی کی کواپریٹو سوسائٹی کے منافع میں حصہ دار ہیں۔
باٹا پورا ایک بڑے خاندان کی طرح ہے۔ تعلیم مفت ہے، طبّی امداد بھی مفت ہے اور انتظامیہ
ہر کام میں والدین کی طرح ذاتی دلچسپی لیتی ہے۔ باٹا کے ڈائریکٹروں نے باہمی مشاورتی ادارہ قائم
کیا ہے جس کے تحت مجلسِ عمل، سپورٹس کلب، اسکول اور باٹا کے ملازمین کی بیماروں کی بہبود کی
سوسائٹی (Sihness Benefit Society) کام کرتے ہیں۔ ان اداروں
کے زیرِ نگرانی مزدوروں کی شکایات، تعلیم اور دوسری سہولتوں کا خیال رکھا جاتا ہے جو باٹا

جیسے بڑے ادارے میں پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ کارکنوں کے معاملات سے یہ دلچسپی باٹا کے انتظام اور ترقی میں بڑی ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ ماہرین ملازمین کو ہر کام خود کر کے سمجھاتے ہیں۔ باٹاپور کا اپنا ٹریننگ اسکول ہے، جہاں ٹیلیفون ایکس چینج کو سنبھالنے سے لیکر جوتے بنانے تک کی تعلیم دی جاتی ہے۔

۱۹۵۵ء میں باٹا نے سائیکل کے ٹائیر اور ٹیوب بنا کر مقامی صنعت کی تاریخ میں نیا مقام حاصل کیا۔ یہ شعبہ کمپنی اور پاکستان دونوں کے لئے بیش قیمت اثاثہ ہے کیونکہ اس کی برآمد سے کثیر زرِ مبادلہ حاصل ہوتا ہے۔ گذشتہ دو سالوں میں یہاں بالترتیب دس لاکھ ٹائیر اور بیس لاکھ ٹیوبیں ہر سال تیار ہوئیں۔ ہر ہفتہ یہاں دو لاکھ سے اُوپر ربڑ اور چمڑے کے دیدہ زیب جوتوں کے جوڑے تیار ہوتے ہیں۔ ان کا ایک حصّہ برآمد کیا جاتا ہے جس سے ملک کی معیشت کے لئے روپیہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ اُس کمپنی کا حیران کن کارنامہ ہے جس کا کچھ عرصہ پہلے اِس ملک میں نام و نشان تک نہ تھا۔

کمپنی کے موجودہ ڈائریکٹر جناب جے۔ بیرک (J-Berich) ان تھک ہمّت کے مالک ہیں۔ وہ نہایت جوش سے اُن دکانوں، ایجنسیوں اور تقسیم کاروں کا ذکر کرتے ہیں جو باٹا نے پاکستان میں قائم کی ہیں۔ انہیں وہ لوگ چلاتے ہیں جن کا کسی زمانے میں خیال تھا کہ ننگے پیروں سے صحت قائم رہتی ہے۔ بیرک صاحب ان دکانوں کا بھی تذکرہ کرتے ہیں جو نئی آبادیاں قائم ہونے پر کھولی جائیں گی۔ وہ کارکنوں سے مشورہ طلب کرتے ہیں اور ہر ایک کو باہم موقع دیتے ہیں، خواہ وہ معمولی مزدور ہو یا بڑا افسر۔ مزدوروں کو ترقیاں دی جاتی ہیں اور عملہ کے پرانے لوگ نئے مزدوروں کو اپنے شعبہ میں لے لیتے ہیں۔

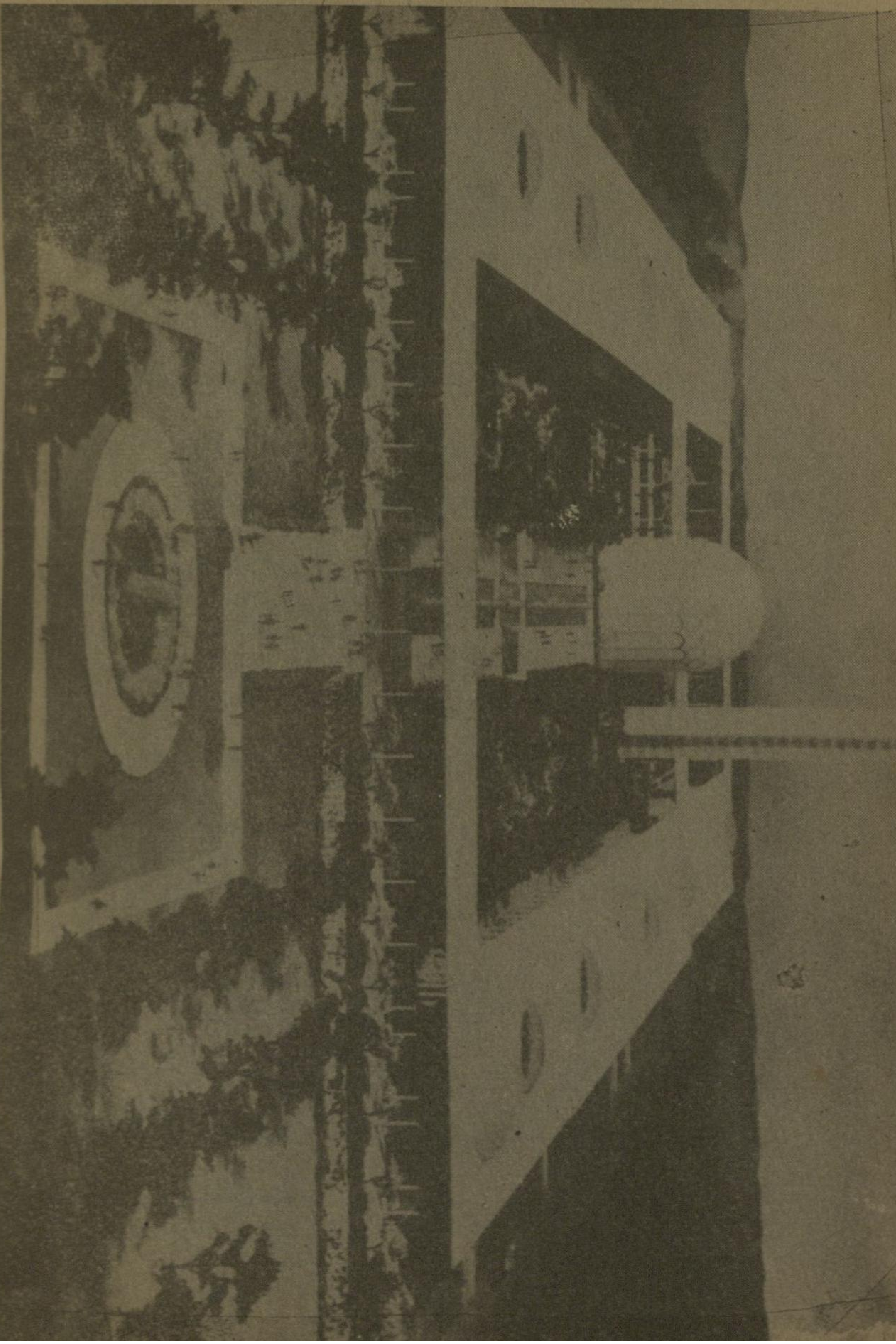
کام کے بعد مزدوروں کی تفریح کے لئے کھیلوں کے میدان ہیں۔ صحت مند مزدوروں کو

کام کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی حصہ لینا چاہیئے۔ عام تعطیلات کے علاوہ ہفتہ اور اتوار کو چھٹی ہوتی ہے۔ ان دنوں میں لائبریری کینٹین اور باٹا سینما لوگوں سے کھچا کھچ بھرے ہوتے ہیں بمعقول تنخواہ پانے کی وجہ سے ہر شخص اپنی پسند کی تفریح کا انتخاب کر سکتا ہے۔ اس معاوضہ سے مزدور لوگ اپنے مستقبل کے انتظام کے لئے جائداد بھی خرید سکتے ہیں۔ باٹاپور کے آس پاس کے علاقوں میں پکنک منائی جاتی ہے۔ غیر شادی شدہ مردوں کے لئے الگ جگہ ہے۔ اکثر اِس کا کوئی نہ کوئی فرد کم ہو جاتا ہے۔ اور باٹا کے کارکنوں کے خاندانوں کے درمیان شادیاں بڑی پُر لطف ہوتی ہیں، لاہور اور دوسرے مقامات سے آنے والے لوگوں کو خوش آمدید کہا جاتا ہے۔ ایک آدمی ان کا خیر مقدم کرتا ہے اور تمام جگہوں کی سیر کراتا ہے۔ دروازے پر میلہ کا سا سماں ہوتا ہے اور دیواروں پر یہ فقرے لکھے ہوتے ہیں:-

"آپ عمدہ جوتوں کے شہر میں داخل ہو رہے ہیں۔ کیا یہ ایک حقیقت ہے؟
کیا یہ سب کے ساتھ یکساں ہے؟ کیا یہ خیر سگالی پیدا کرے گی؟"

اندر ایک کھڑکی میں باٹا کے تمام جوتے نمائش کے لئے رکھے گئے ہیں۔ مشرقی، مغربی اور تمام نئے ڈیزائن موجود ہیں۔ دیکھنے کی سب سے بڑی چیز وہ سنجیدگی ہے جو سارے ماحول پر چھائی ہوئی ہے۔

بیس ہزار لوگوں کا یہ شہر انسانی دلچسپی کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جو دو ہزار سال پرانے "پاکستان کے دیوان خانہ" میں نگینے کی طرح جڑا ہوا ہے۔ لاہور اس مہمان نواز خاتون کی طرح ہے۔ جس کے خاندان کے افراد خود کو سب کے برابر سمجھتے ہیں اور جن کا خلوص تمام آنے والوں کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔



راولپنڈی اور اسلام آباد

راولپنڈی مسجدوں، گرجاؤں، کلبوں، پارکوں اور گلیوں کا شہر ہے۔ یہ تمام چیزیں سیاحوں اور تاجروں کے آرام اور لطف میں اضافہ کرتی ہیں۔ اکتوبر ۱۹۵۹ء میں دارالخلافہ کی منتقلی کے بعد سے اس شہر کا اپنا مخصوص اور انفرادی رنگ ہو گیا ہے۔ یہاں زندگی کی گہما گہمی میں اضافہ اور صنعتی اور سماجی زندگی میں ترقی ہو رہی ہے۔

اپنے جاندار حال کے علاوہ راولپنڈی کا مستقبل بھی درخشاں ہے اپنی پرانی خوبصورتی کھوئے بغیر یہ شہر روز بروز صاف ستھرا، جدید اور آرام دہ ہوتا جا رہا ہے۔ ہوٹلوں کے کمرے از سرِ نو آراستہ کئے جا رہے ہیں اور چاق و چوبند دکاندار اب سوسائٹی میں شمار ہوتے ہیں۔ عبوری دارالحکومت ہونے کی وجہ سے راولپنڈی بذاتِ خود ملکہ کی حیثیت رکھتا ہے.... اور جب تک ہتھوڑوں، رندوں، بل ڈوزروں اور دوسری چیزوں کی آواز بند نہیں ہو جاتی پرجوش توقع کا جذبہ بیان سے باہر ہے۔

گو فوجی پس منظر اور برطانوی دور کا ہلکا سا رنگ یہاں اب بھی عیاں ہے، پاکستان کے بیشتر لوگ راولپنڈی کو ایک آرام دہ شہر یا ایک اچھے پڑوسی یا مالدار غیر شادی شدہ خالہ کی طرح دوست نواز سمجھتے ہیں۔ چونکہ راولپنڈی کو

مقامی لوگ پیار سے پنڈی کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس لئے سارے ملک میں یہی نام مشہور ہوگیا ہے مغربی پاکستان میں یہ تیسرا بڑا شہر ہے۔ اس کی آبادی دو لاکھ ہے اور لوگوں کا خلوص ہر جگہ عیاں ہے۔ یہاں بے شمار بسیں ہیں جو دوسرے شہروں کو جانے والی بسوں سے ملاتی ہیں۔ پنڈی، مری بس۔ پنڈی لاہور بس اور بیشمار دوسری بسیں یہ تمام بسیں بغیر کسی استثنا کے مقامی لوگوں اور اجنبیوں سے ملنے اور راستے میں رک کر چائے پینے والے سفر کے شوقین سیاحوں سے بھری ہوئی صبح سے شام تک چلتی رہتی ہیں۔

راولپنڈی کو تاریخی شہرت اس وقت حاصل ہوئی جب دارالحکومت کو پرہجوم کراچی سے منتقل کرنے کا آخری فیصلہ کیا گیا۔ یہ اعلان دنیا کے تمام اخبارات میں پہلے صفحہ پر شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوا۔ پنڈی کے خوش باش عوام کی خوشی اور بڑھ گئی۔ ان کا شہر اب پاکستان کا اہم ترین علاقہ بن گیا۔ پرسکون ماحول میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔ لوگ خوشی کے جذبہ سے مغلوب ہو گئے۔

اسلام آباد ــ پاکستان کا زیرِ تعمیر نیا دارالحکومت خوبصورت علاقہ میں واقع ہے ہمالیہ کی سی چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں سے گھرا ہوا اسلام آباد ایسے ابتدائی کیمپ کی طرح ہے جو ہمالیہ کی کسی چوٹی کی تسخیر کے لئے لگایا گیا ہو۔ نئے دارالحکومت کا علاقہ پوٹھوار پلیٹو میں واقع ہے جہاں زندگی کے آثار آج سے پانچ لاکھ سال پہلے نمودار ہوئے۔

یہ منصوبہ جون ۱۹۵۹ء میں وجود میں آیا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ اس طرح کراچی پر بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ کراچی میں صنعت، سیاحی، تجارت اور بے شمار دوسری چیزیں اس طرح گڈ مڈ ہو گئی تھیں کہ جگہ بالکل باقی نہ رہی تھی۔ صدر ایوب نے فرمایا۔

"دارالحکومت کو تجارتی یا صنعتی مرکز نہیں ہونا چاہیئے۔ اس کو صرف دارالحکومت ہونا چاہیئے جہاں عوام کی بہبود کے لیے ملک کی انتظامیہ کام سنبھالے۔" اس بات پر پوری طرح عمل ہوا ہے۔

کام شروع ہونے کے بعد چار سال سے کم عرصہ میں مری کی پہاڑیوں کے دامن میں ایک نیا شہر ابھر آیا ہے آج اسلام آباد زندگی سے بھرپور ہے۔ جہاں تعمیر کا کام زور شور سے جاری ہے اور یہ شہر اس ترقی پذیر ملک کے نئے دارالحکومت کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔

کسی بھی نظریہ سے جانچیئے، جتنا ترقیاتی کام ہو چکا ہے حیران کن ہے خوبصورت نئی سڑکیں بچھائی گئی ہیں۔ سرکاری ملازمین کے لیے مکانات بنائے گئے ہیں اور انہوں نے اپنے نئے ماحول میں گھر بسا لیا ہے بیشتر دفاتر کی عمارتیں مکمل ہو چکی ہیں اور باقی تکمیل کے مختلف مراحل میں ہیں۔ ان میں قابلِ ذکر پاکستان ہاؤس ہے۔ اس عظیم الشان سہ منزلہ عمارت کے آگے وسیع میدان پھیلے ہوتے ہیں۔ یہ سیاحوں کے لیے جدید طرز کا ہوٹل ہے جہاں اس کے لیے تمام آسائشیں اور سہولتیں موجود ہیں۔ پاکستان ہاؤس سے وسیع میدانی علاقہ، راول جھیل اور راول ڈیم کا دلفریب نظارہ دکھائی دیتا ہے یہ ہوٹل ایر کنڈیشنڈ ہے اور ہر کمرہ میں ریڈیو اور ٹیلیفون موجود ہے۔

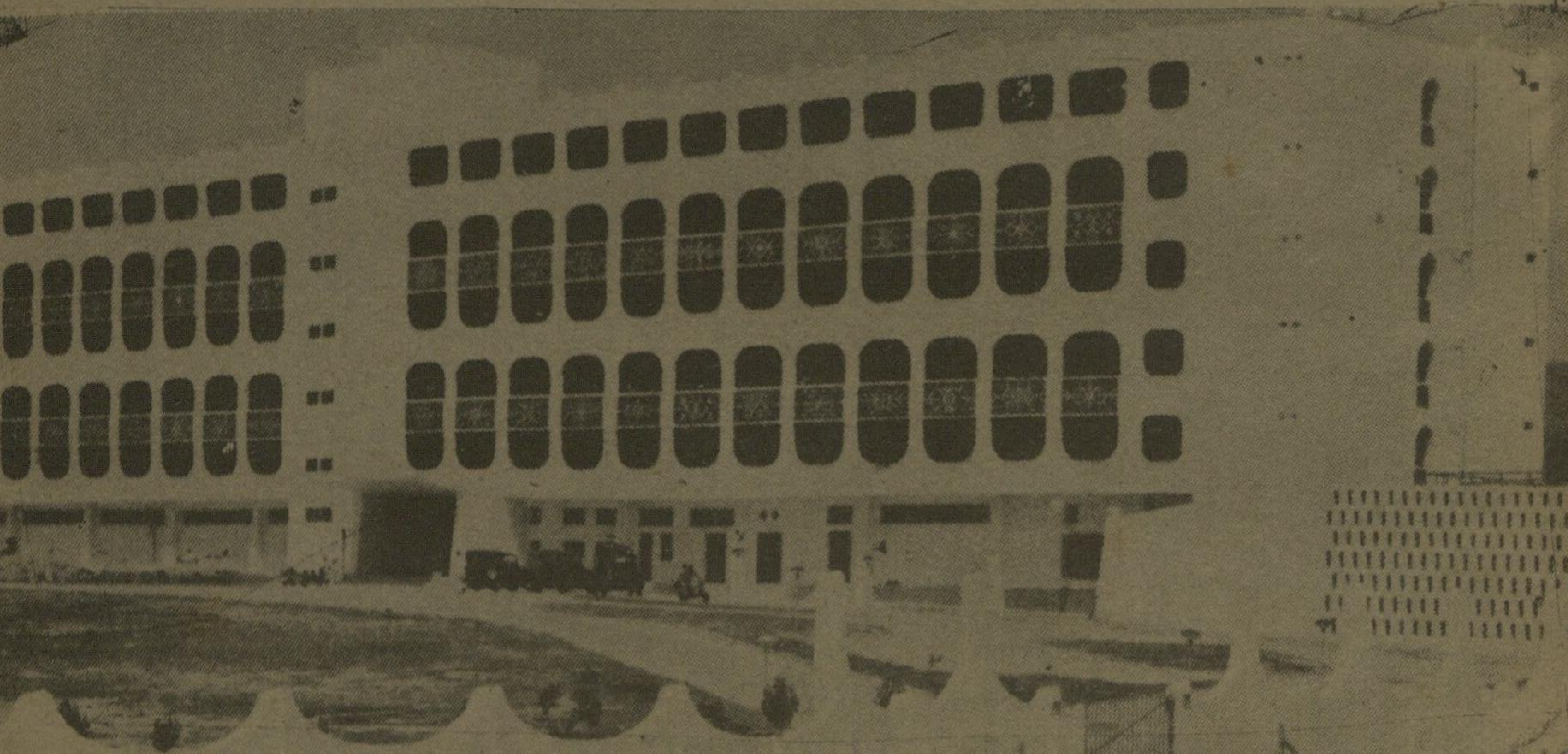
اسلام آباد میں پارک، تفریح گاہیں، اسکول، لائبریریاں، مساجد اور بازار اور نئی شاہراہیں بن چکی ہیں اور پنڈی سے دارالحکومت تک لمبا راستہ بے حد خوشگوار ہے پہاڑیوں کے پس منظر نے اس نئے شہر کو ملکوتی حسن بخش دیا ہے۔ کچھ عرصہ میں ہسپتال اور دوسرے بہبودی مراکز قائم ہو جائیں گے۔ سیکرٹریٹ کے بڑے بڑے بلاکوں کا منصوبہ تیار کیا گیا ہے جن میں سے کچھ تعمیر ہو چکے ہیں۔

خوبصورت ترین عمارات میں سے ایک ایٹمی سائنس کا مرکز (NUCLEAR SCIENCE CENTRE) ہے جو امریکی امداد سے تعمیر کیا گیا ہے یہ عمارت ہر دور

میں قومی افتخار، اتحاد اور انسانیت کی خدمت کا مظہر رہے گی۔

نئے دارالحکومت کا پلان یونان کی مشہور فرم ڈوکیاڈیز نے تیار کیا ہے جنہوں نے کراچی میں بنجر زمین پر کورنگی تعمیر کی ہے۔ راولپنڈی کے لوگوں کو اپنے گرد ابھرتا ہوا یہ علاقہ پریوں کی کہانی کی طرح معلوم ہوتا ہے اور ابتدائی رسمی باتوں کی جگہ اب ان جملوں نے لے لی ہے "ہماری عزت کتنی بڑھ گئی ہے؟" "کیا یہ اعزاز نہیں ہے؟" ان کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں۔ جس روز پاکستان کے صدر سرکاری طور پر کراچی (وہاں وہ پاکستانی فوج کے سپہ سالار کی حیثیت سے رہتے تھے) سے واپس لوٹے تو سڑکوں کو جھنڈیوں، پھولوں اور رنگ برنگی روشنیوں سے سجایا گیا، فضا پر تہوار کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ شہر میں اس وقت پہنچنے والے مسافر بھی خوشی کی رو میں بہہ رہے تھے۔ سیاح ہر حال میں ایک مہمان ہے اور لوگ اسے دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ ریلوے سٹیشن ہر وقت کھچا کھچ بھرا رہتا ہے اور آدمی سوچتا ہے "کیا یہ سب لوگ مجھے خوش آمدید کہنے آئے ہیں؟"

راولپنڈی کے فضائی مستقر پر پی آئی اے (P.I.A) کا سٹیشن منیجر ہر وقت موجود اور مدد کے لئے تیار رہتا ہے وہ آنے والے مسافروں کا خیال رکھتا ہے۔ اور اگر ان کے ٹھہرنے کا انتظام پہلے سے نہ ہو تو ہوٹل میں جگہ کا بندوبست کرتا ہے۔ چائے اور مشروبات کے لئے انھیں مستقر کے آرام دہ رسیٹورنٹ میں لے جاتا ہے۔ خواہ آپ پی۔آئی۔اے کے جہاز پر کتنا ہی گھبرا کر کیوں نہ آئے ہوں، سٹیشن منیجر ان باتوں کو رد کر دیتا اور کہتا ہے "روئے زمین پر جمے ہوئے قدموں سے مضبوط اور کونسی چیز ہے؟" میں ہوائی اڈہ کے کیفے میں لوگوں کی سوالیہ



پاکستان اٹامک انرجی سنٹر اسلام آباد

نگاہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔ جب میں نے چائے کی جگہ کافی طلب کی۔ ملازمین حیران رہ گئے۔ "کافی"؟ کیفے کے مالک نظیر محمد اور اس کے دو بھائیوں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہم ابھی حاضر کرتے ہیں، بالکل آپ کی طرح امریکن"۔ انھوں نے کہا "ہم چاہتے ہیں کہ آپ یہاں خوش رہیں"۔

میں مسکرائی اور کافی کا ڈبہ کھولا جو انھوں نے میرے سامنے لاکر رکھا تھا انھوں نے پھر سوالات کی بوچھاڑ کردی "آپ شاید تلے ہوتے انڈے پسند کرتی ہیں"۔ "شکریہ" ادا کرتے ہوتے جب میں نے بتایا کہ مجھے پاکستانی کھانے بھی مرغوب ہیں تو وہ تشکر سے مغلوب ہو گئے۔ مجھے ان کے آرام دہ ریسٹورنٹ میں بہت لطف آیا۔

سیاحوں کے لئے یہاں چھ اچھے ہوٹل ہیں۔ پنڈی کے بہترین ہوٹل فلشمین میں خوش مزاج منیجر او ہیگن مہمانوں کا خیر مقدم کرتا ہے اور کاٹیج نما کمروں کو دیکھ کر سیاحوں کو محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے گھر میں ہیں جو خوبصورت باغوں سے گھرا ہوا ہے۔ خوبصورت لاؤنج، بار اور کشادہ، فرنیچر سے آراستہ مطالعہ کا کمرہ مشہور "اوبیراتے انداز" کے مظہر ہیں۔ تانگوں میں جُتے جھومتے ہوئے گھوڑے میدان میں آتے جاتے رہتے ہیں اور روایتی ماحول کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ سیاحوں کو یہاں تمام جدید سہولتیں میسّر ہیں۔ یورپی انداز کا کمرہ اٹھائیس روپیہ یومیہ پر مل سکتا ہے۔ نیا ریکس ہوٹل صاف ستھری جگہ ہے گو زیادہ بڑا نہیں لیکن آرام دہ ہے اور تمام چیزیں ملاکر یومیہ کرایہ پچیس روپے ہے۔ مسز ڈیویز ہوٹل پرانی برطانوی سرائے کی یاد دلاتا ہے اونچی چھتوں والے کمرے، اپنا پکانے کا انتظام اور کرایہ بھی نسبتاً کم۔ کشمیر ہوٹل بھی سستی جگہ ہے۔ گیٹ مال اور کامران ہوٹل میں

مختلف کمرے ہیں۔ جس کا کرایہ سات روپے یومیہ سے شروع ہوتا ہے۔ راولپنڈی آنے والے سیاح اپنی ضروریات اور بجٹ کے مطابق جگہ کا انتخاب کر سکتے ہیں۔ ممتاز ریسٹورانوں میں شیزان، سلور گرل اور ریسپر شامل ہیں۔ ایورگرین ہوٹل کا کیفے بہت عمدہ ہے اور میجسٹک، مرینا، پنڈی ہوٹل، مغل سرائے اور میزبان میں کھانے کی اچھی چیزیں ملتی ہیں۔

کراچی اور لاہور کے اخبارات کے علاوہ یہاں سے چھ روزنامے نکلتے ہیں جس میں انگریزی کا پاکستان ٹائمز بھی شامل ہے اس مصروف شہر میں تیرہ چھاپے خانے ہیں۔ سب سے بڑا حکومت کی ملکیت ہے۔ گو پنجابی یہاں کی خالص زبان ہے۔ پھر بھی پنڈی کے بیشتر لوگ انگریزی کے علاوہ جرمن اور فرانسیسی بھی بولتے ہیں۔ اگر آپ بیمار ہو جائیں تو فکر کی بات نہیں یہاں تو اچھے ہسپتال ہیں جو جدید آلات سے آراستہ ہیں۔

ملاقات کی ایک مشہور جگہ پنڈی کلب ہے۔ جہاں سوئمنگ پول اور ٹینس کورٹ موجود ہیں۔ جھٹپٹا ہوتے ہی پنڈی اور گرد و نواح کے لوگ چاندنی کا لطف اٹھانے کے لئے اس کے کشادہ سبز لان میں جمع ہو جاتے ہیں اور موسیقی اور رقص سے دل بہلاتے ہیں۔ اب پنڈی میں زیادہ عرصہ بغیر کہیں مدعو ہوئے نہیں رہ سکتے سیاح اپنے موٹاپے کو گھڑ سواری کی مدد سے دور کر سکتے ہیں جس کے لیے یہاں الگ راستے بنے ہوتے ہیں۔ گھوڑے گھنٹہ کے حساب سے کرایہ پر مل سکتے ہیں۔ ان کیساتھ سائیس بھی ہوتے ہیں۔ خرید و فروخت کا مرکز ایڈورڈز روڈ خوبصورت جگہ ہے۔ مصروف ترین جگہ مشہور لنڈن بک شاپ ہے جہاں پُرخلوص پاکستانی

گھریلو طرز پر ملتے ہیں۔ یہاں تمام مشہور امریکی اور برطانوی رسالوں کے علاوہ مختلف زبانوں کے ادب کی کتابیں بھی ملتی ہیں۔ کتابیں اور دوسری چیزیں مہیا کرنے میں انتظامیہ کے کارکن ذاتی دلچسپی لیتے ہیں اور سیاح مستقل دوست بن جاتا ہے۔ آس پاس کی دکانیں، درزیوں، جوتے والوں، قصابوں اور بیکری والوں کی ہیں۔ ان لمبے بازاروں میں مضحکہ خیز چیزوں سے لے کر بہترین قسم کا ہر سامان دستیاب ہے۔ اگلے حصّہ میں عموماً پنجابی دہقانوں کی بھیڑ رہتی ہے جو آس پاس کے علاقوں سے روزانہ ہاتھ کی بنی ہوئی چیزیں بیچنے آتے ہیں۔ ان پنجابی تاجروں کی ایک مرغوب چیز چاقو اور بندوقیں ہیں۔ ایک آدمی سے میں نے آٹھ آنے کے حساب سے بے شمار پیتل کے دستے والے جیبی چاقو خریدے۔ میں خوش تھی کہ یہ پاکستانی تحفے اپنے رشتہ دار بچوں کو دوں گی۔ ہر چاقو پر اُردو میں خوبصورتی سے کوئی مقولہ (میں نے یہی سوچا تھا) لیکن یہ کچھ ایسی بات نکلی جو لندن کے سیلفرج یا نیویارک کے میں ہی کر سکتے ہیں۔ ترجمہ کروانے پر یہ جملہ نکلا۔۔۔۔ "اگر یہ چاقو کاٹنے کے قابل نہ ہو تو لوٹا کر اپنے دام واپس لے سکتے ہیں"۔ —— یہ دیانت داری اتنی حیران کن تھی کہ میں واپس گئی اور ایک درجن چاقو اور خرید ڈالے۔

آرام اور سکون کے لئے ایوب نیشنل پارک شہریوں اور سیاحوں کے لیے ایک نعمت ہے یہ سوڈان ندی کے نزدیک ہے اور یہاں پھول اور سایہ دار درختوں کی بہتات ہے۔ سات مصنوعی جھیلوں اور باسٹھ ایکڑ میں پھیلے ہوئے پانی میں مچھلیاں پلی ہوئی ہیں۔ اس کے اندر آٹھ میل لمبی سڑکیں اور بارہ میل لمبی فٹ پاتھ میں وہ سیاح جنہیں چلنے کا شوق ہے یہاں یقیناً لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ کشتی رانی کے

لئے جھیلیں، پکنک کے میدان، کھانے کی جگہیں اور بچوں کے کھیلنے کے لیے پارک اس کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں۔ یہاں روزانہ سینکڑوں لوگ آتے ہیں۔ اور بعض اوقات چھ ہزار چھ سو ستر فٹ لمبی بل کھاتی جھیل کے کنارے پارک میں ساری چھٹی گذار دیتے ہیں۔

پنڈی کے وسط میں بڑا ڈاکخانہ دیکھنے کی چیز ہے اور بینک کی عمارت سے ملتا جلتا ہے۔ یہ کبھی بند نہیں ہوتا اور یہ معلوم ہو کر خوشی ہوتی ہے کہ یہاں کسی وقت بھی خط ڈالا جا سکتا ہے۔

راولپنڈی کے شروع کے دَور میں ڈاک کی سہولتیں معدوم تھیں۔ اس تاریخ کے ابتدائی حصّے میں اس علاقے میں وادیٔ سندھ کی تہذیب پھولی پھلی۔ پندرھویں صدی قبلِ مسیح میں یہاں آریہ آئے۔ ان کے بعد ٹکّا لوگ آئے جو تورانی قوم سے تھے۔ وہ سانپ کی پوجا کرتے تھے۔ انھوں نے ٹیکسلا آباد کیا۔ ان کے ایک سردار راجہ گاجی نے گاجی پور کی بنیاد رکھی جہاں اب راولپنڈی واقع ہے۔ چھٹی صدی قبلِ مسیح کے اوائل میں دارا نے اس علاقے کو ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ اس کے سپاہی ایرانی فوج کے ساتھ یونانیوں کے خلاف لڑے تھے۔ سکندر نے ۳۲۶ قبل مسیح میں ایران فتح کیا اور ٹیکسلا کی طرف بڑھا جو اس زمانہ میں اماند کہلاتا تھا۔ بابل میں سکندر کی موت کے بعد غیر ملکیوں کے خلاف بغاوت ہو گئی۔

۲۶۲ قبل مسیح کے لگ بھگ اشوک نے بدھ مت کو سرکاری مذہب بنایا۔ لیکن یہ مذہب ہندوستان میں زیادہ نہ پھیل سکا۔ البتہ اسے اس خطّے کی زمین راس آ گئی۔ ایک صدی سے زیادہ یونانی حکومت کرتے رہے لیکن انھیں ساقہ اور پارتھیا کے لوگوں کے

حق میں دستبردار ہونا پڑا۔ ان کے بعد کُش آئے اور اپنے ساتھ زندگی اور خوشحالی لائے اس کے ساتھ ہی گندھارا آرٹ کا دور شروع ہوا۔ سو سالہ ترقی کے دور کے بعد یہاں جنگجو سفید نام ہُن آتے۔ وہ جہاں گئے ہر چیز کو تہس نہس کر دیا وہ بدھ مت برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ ہن قوم کے بعد راجپوت پھیلے اور ٹیکسلا اور گندھارا کی عظیم عظمت کا خاتمہ ہو گیا۔ . . . برہمنیت اس زمانہ میں اپنے ابتدائی دور میں تھی جب یہ ضلع کشمیر کا حصہ سمجھا جاتا تھا۔ گیارھویں صدی کے شروع میں مسلمانوں نے اس شہر کو فتح کیا اب تک اس شہر پر حملوں اور جنگوں کی چھاپ ہے۔ ۱۰۰۰ء میں محمود غزنوی نے دریائے سندھ کو عبور کر کے بقایا دشمنوں کو بھی زیر نگیں کر لیا۔ اس نے یہ علاقہ گھکڑ شاہ کو بخش دیا۔ جس کی اولاد یہاں آٹھ صدیوں تک حکومت کرتی رہی۔ راولپنڈی میں گھکڑوں اور شیر شاہ سوری کی لڑائی ہوئی۔ شیر شاہ سوری کی فتح انتہائی زبردست تھی اور اسکی تعمیرات کے نشانات آج تک باقی ہیں۔ اس نے مشہور جرنیلی سڑک (GRAND TRUN R-ROAD) بنوائی جو کلکتہ سے پشاور تک پھیلی ہوئی ہے۔ پھر سکھوں نے طاقت حاصل کی اور ۱۷۶۵ء سے ۱۸۴۹ء تک سارے پنجاب پر حکومت کرتے رہے۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دور میں راولپنڈی میں انھوں نے اسلام کے احیاء کی تحریک کو دبانے کی کوشش کی۔ ۱۸۵۸ء میں برطانوی فوجوں نے سکھوں کو شکست دی اور ۱۹۴۷ء میں تقسیم تک علاقے پر حکومت کرتے رہے اس عرصے میں انگریزوں نے عظیم الشان گرجا تعمیر کرائے اور شیر شاہ سوری کی سڑک کو دوبارہ بنوایا۔ لوگوں کو خوش کرنے کے لئے انھوں نے چھاونی بنوائی اور آخر کار یہ شہر شمالی علاقہ کا ہیڈ کوارٹر بن گیا۔ ابتدا میں ڈویژن کا صدر مقام جہلم تھا لیکن اسے بعد میں راولپنڈی منتقل کر دیا گیا۔ آجکل یہ پاکستانی فوج کا ہیڈ کوارٹر ہے

اور حکومت کے تحت بڑی ترقی کر رہا ہے۔

راولپنڈی ایک بڑا صنعتی اور تجارتی شہر بھی ہے۔ یہاں مشہور مری بریوری (Murree Brewery) کا کارخانہ اور ہیڈ کوارٹرز ہے۔ گرد و نواح میں اور بہت سی اہم صنعتیں ہیں۔ یہاں ہوزری، گلاس کے کارخانے اور حتیٰ کہ بجلی گھر کے پاس ربڑ کا کارخانہ بھی ہے۔ بے شمار کپڑے کے کارخانے جس میں کوہِ نور، باوٹرے اور ہنزہ شامل ہیں، ہمہ وقت چلتے ہیں۔ دو بڑے اُون کے کارخانے ہیں جو ہوزری کے کارخانوں کو اُون مہیا کرتے ہیں۔ وطن وولن ملز میں دو ہزار پانچ سو اور راحت وولن ملز میں ایک ہزار چھ سو کرگھے ہیں۔

ان بڑی صنعتوں کے علاوہ یہاں چھوٹی چھوٹی فیکٹریاں بھی ہیں۔ جہاں ٹوکریاں، لکڑی کا کام، دیسی جوتے، سوٹ کیس اور خوبصورت کشیدہ کاری کی شالیں بنتی ہیں۔ اس شہر کے خوشگوار ماحول میں اجنبی جلد ہی مانوس ہو جاتے ہیں۔ بے شمار بازار نہایت خوبصورت ہیں۔ کم از کم ان میں سے نو بازاروں میں خریداروں کی پسند کی تمام چیزیں ملتی ہیں۔ راجہ بازار جانا ہرگز نہ بھولیے۔ جہاں ہر چیز ملتی ہے۔ صرافہ بازار میں خوبصورت زیورات اور عطریات نمائش کے لیے رکھے رہتے ہیں۔ لوہٹر بازار میں دوائیوں کی بیشمار دکانیں ہیں۔ سبزی منڈی میں گھس کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی لامتناہی باغ میں آگئے ہیں ــــ راولپنڈی میں بے شمار بینک ہیں جن میں اسٹیٹ بنک بھی شامل ہے یہاں آپ کسی ریسٹ ہاؤس میں بھی ٹھہر سکتے ہیں۔ اور مقامی ماحول کی زندگی کے عادی ہو سکتے ہیں۔ اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے علاوہ یہاں میو روڈ پر مغربی پاکستان ہاؤس، پشاور روڈ پر مشرقی پاکستان ہاؤس اور سیٹلائٹ ٹاؤن میں سرکاری

گیسٹ ہاؤس ہے۔

راولپنڈی میں تفریح کے مقامات بے شمار ہیں۔ بارہ سینما گھر ہیں، فلیشمین کے سامنے کرکٹ کا میدان ہے۔ پانچ مشہور کلب ہیں۔ جن کے دروازے سیاحوں کے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ پنڈی کلب کے علاوہ یہاں ڈیپارٹمنٹل کلب اور ٹاؤن کلب اور سوئمنگ پول بھی ہیں۔ چھاؤنی کے علاقہ میں آرمی میوزیم، مچھلی گھر، آرمی سپورٹس سٹیڈیم اور ریس کورس ہیں سیاحوں کے لیے دوسری دلچسپیوں کے علاوہ یہاں پھاروالہ ہے جہاں قدیم قلعہ کے کھنڈرات ہیں جو گھکڑوں کے زمانہ میں صدر مقام تھا، گھکڑ قوم کے کچھ افراد آج بھی یہاں رہتے ہیں یہ قلعہ دریا سوواں کے قریب چٹیل ڈھلان پر واقع ہے ـــ جنرل جان نکلسن کی یادگار راولپنڈی سے پندرہ میل دور حسن ابدال جانے والی سڑک پر ہے۔ یہاں ایک صاف شفاف پینے کے پانی کا تالاب ہے۔ سڑک کے شمال میں پہاڑیوں کو کاٹ کر نوسو فٹ لمبی سرنگ بنائی گئی ہے۔ مرگلہ میں شہنشاہ اورنگ زیب کے زمانہ کا راستہ ہے منقش پتھروں کے نشانات لگے ہیں۔ ایک تاریخ بھی کھدی ہے جو ۱۶۷۲ء کے مطابق ہے یہ وہ زمانہ تھا جب اورنگ زیب نے شہزادہ سلطان کو قبیلہ خٹک اور دیگر سندھ کے پار رہنے والے قبائل کے خلاف لڑنے بھیجا تھا۔

راولپنڈی سے چودہ اور رلوات سے تین میل کے فاصلہ پر مانکیالہ کے کھنڈرات ہیں۔ رسالو کی کہانی اسی شہر سے منسلق ہے کہا جاتا ہے کہ سیالکوٹ کے راجہ سالیوداہنا کا بیٹا رسالو سات رکھششوں کا دشمن تھا۔ جو مانک پور (مانکیالہ کا پہلا نام) میں رہتے تھے۔ یہ راکھشش روز ایک آدمی کھاتے تھے جس کا انتخاب قرعہ کے ذریعے ہوتا تھا۔ ایک دن رسالو نے ایک عورت کو کھانا پکاتے وقت روتے اور گاتے ہوئے دیکھا رسالو

کو اس پر تعجب ہوا اور اس نے عورت سے پوچھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے۔ عورت نے جواب دیا "میں خوشی میں گا رہی ہوں کہ آج میرے اکلوتے بیٹے کی شادی ہے۔ روتی اسلیے ہوں کہ قرعہ میں آج اس کا نام نکلا ہے اور وہ راکھششوں کی خوراک بنے گا۔"

"رونا بند کرو اور لڑکے کو اپنے پاس رکھو۔ میں ساتوں راکھششوں کا مقابلہ کروں گا اور تمہارے لڑکے کی جگہ خود جاؤں گا۔ اس کے بعد وہ مانگھور گیا اور بہادری کے ساتھ سوائے ایک کے سب راکھششوں کو قتل کر ڈالا۔ بچنے والا راکھشش جس کا نام ٹھیرا تھا۔ کہا جاتا ہے آج بھی گندگار ہتھ کے ایک غار میں رہتا ہے یہ پرانی کہانی سیکاتے سے متعلق بدھوؤں کی روایت سے ملتی جلتی ہے جس نے اپنا جسم سات شیروں کے حوالے کر دیا تھا۔

راولپنڈی کی پرسکون ترقی کا اس کی اہم جغرافیائی حیثیت سے گہرا تعلق ہے۔ قدیم تاریخی حملوں کے راستے پر واقع یہ شہر صوبہ سرحد سے سڑک کے ذریعے براہ راست ملا ہوا ہے اور یہاں سے خوبصورت وادی کاغان جانے کے لیے ایبٹ آباد سے گذرتا ہوا جیپ کا راستہ ہے۔ صاف موسم میں روزانہ طیارے گلگت یا سکاردو کے لیے پرواز کرتے ہیں۔ ان پہاڑی مقامات کے لیے اجازت نامے پنڈی میں وزیر امور کشمیر سے براہ راست مل سکتے ہیں۔ راولپنڈی سے پشاور یا لاہور آپ ہوائی جہاز، ریل یا کار کے ذریعہ جا سکتے ہیں۔ ٹیکسلا اور ہزارہ نزدیک ہی ہیں۔ مری صرف اڑتیس میل دور ہے۔

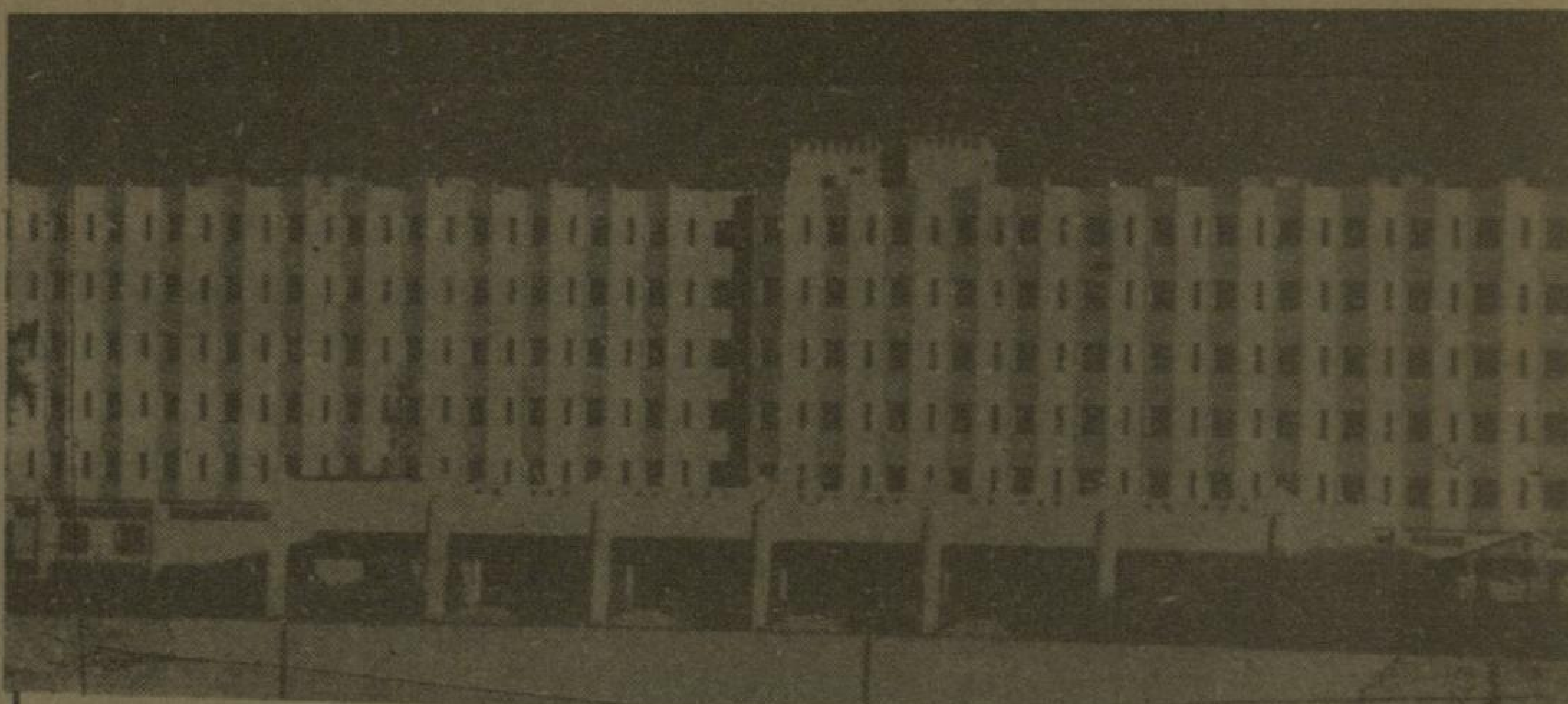
گیارہ لاکھ سنتیس ہزار پچاسی افراد کی آبادی والے اس شہر میں تعلیمی سہولتیں بے شمار ہیں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے بیس ہائی سکول، تین ڈگری کالج اور لاتعداد ابتدائی سکول ہیں۔ آس پاس کے دیہاتوں میں بھی سکول ہیں۔

راولپنڈی کو ہر دور میں مجاہدین اور شہدا نے پاک رکھا ہے۔ اکتوبر ۱۹۵۳ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم لیاقت علی خاں ایک جلسہ کو خطاب کرتے ہوئے یہیں شہید ہوئے تھے۔ آج کل اس شہر کو پاکستان کے صدر فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں کی ذات نے متبرک بنا دیا ہے جو اپنے رفقار کے ساتھ ملک کی معاشی، سماجی اور تعلیمی ترقی کے لیے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔

پنڈی میں شروع میں آباد ہونے والوں میں ریلوے ملازمین کے خاندان ہیں۔ ریلوے کے سابق ڈسٹرکٹ سپرنٹنڈنٹ جناب الف، ایم، خاں، راولپنڈی میں میرے میزبانوں میں سے ایک تھے۔ اس دوران میں روز صبح ناشتہ کے میز پر نہایت عمدہ دودھ موجود ہوتا تھا۔ یہ اتنا لذیذ اور کراچی کے دودھ سے اتنا مختلف تھا کہ میں نے بیگم خان سے پوچھ ہی لیا کہ وہ دودھ کہاں سے حاصل کرتی ہیں وہ مسکرائیں اور جواب دیا "آپ دیکھتی نہیں کہ میں نے اپنے باغ میں بھینس پال رکھی ہے" کتنی سیدھی سادھی بات ہے۔

پنڈی کے لوگ بھینس پالتے ہیں اور اپنے مہمانوں کو خوش اور صحتمند رکھتے ہیں۔

راولپنڈی میں آج کل چھٹیوں میں آنے والے لوگوں کے علاوہ اکثریت تجارتی وفود کی ہوتی ہے جو ہر ایشیائی ملک سے یہ دیکھنے آتے ہیں کہ پاکستان میں کیا مل سکتا ہے۔ کچھ ہی عرصہ کی بات ہے یہاں چینی وفد آیا ہوا تھا اور ایک معاہدے پر دستخط ہوئے جس کے بعد چینی حکومت نے مغربی پاکستان کے کارخانوں سے ہزاروں ٹن روئی خریدنی شروع کر دی۔ اس سے پہلے جرمنی ترکی، عراق اور مشرق قریب سے وفود آتے۔ یہ لوگ یہاں اجنبیوں کی طرح آتے۔ تجارتی حیثیت سے ٹھہرے اور دوستوں کی طرح واپس گئے۔ راولپنڈی میں ان پر نوازشات کی بوچھاڑ ہوتی گو آمد پر ان کا استقبال کراچی میں

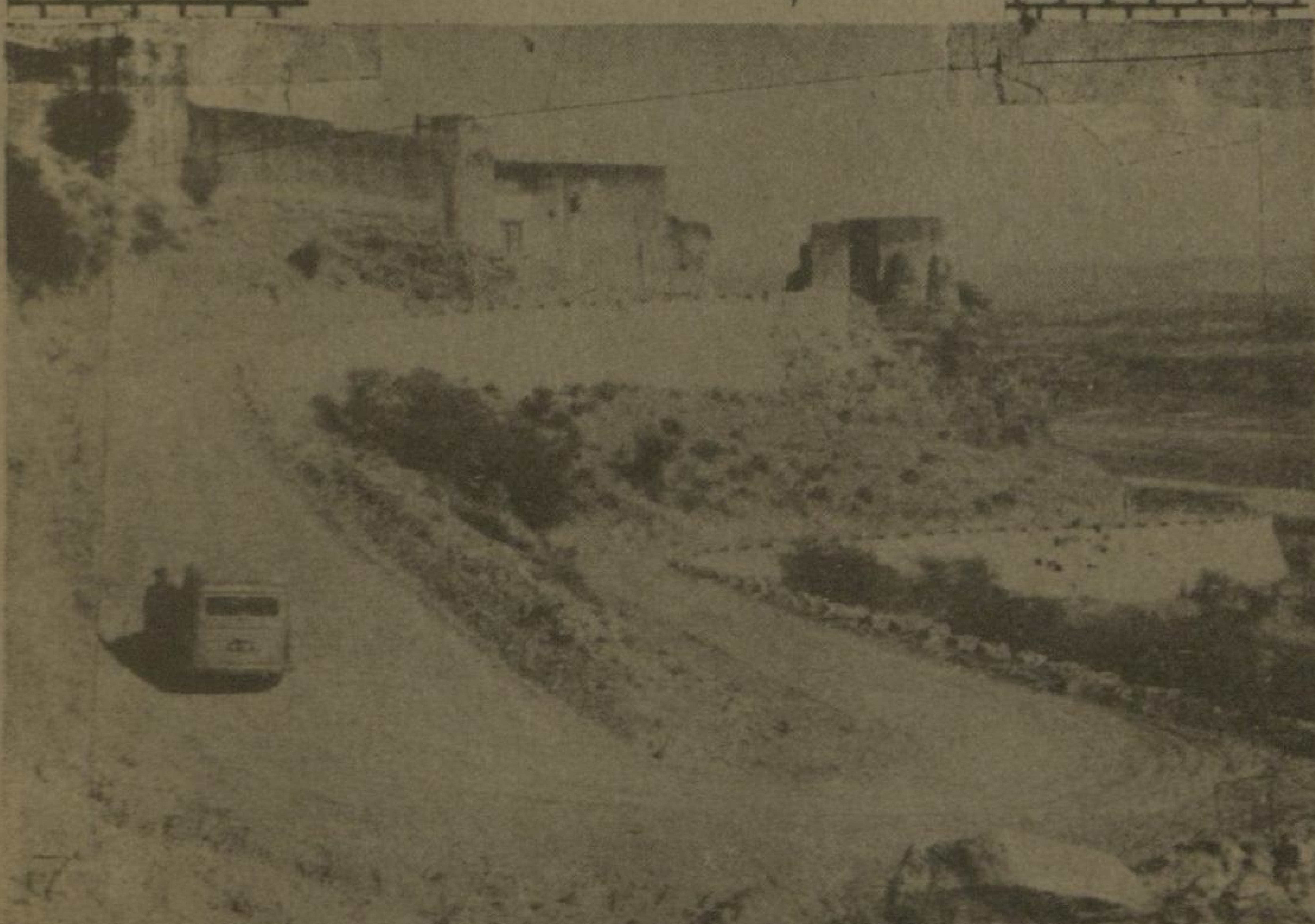


پاکستان ہاؤس —— اسلام آباد

گرم جوشی سے کیا جاتا ہے۔ ایسی فراخدلی انھیں دوسرے ممالک میں کم ملے گی۔ درحقیقت وہ ان نوازشات سے مغلوب ہو جاتے ہیں، یہی تجارتی لوگ ایک دن اپنے خاندانوں کے ساتھ جمہوریہ پاکستان کے قلب، عبوری دارالحکومت راولپنڈی میں لطف اٹھانے کے لیے سیاحوں کی حیثیت سے آئیں گے۔



منگلا ڈیم ——— دو مناظر



منگلا ڈیم   عظیم منصوبہ

عظیم منگلا ڈیم — جہاں تاریخ جنم لے رہی ہے۔ مسحور کن الفاظ جو ایسی خوش آئند زندگی کا پتہ دیتے ہیں جس کا قدیم لوگوں نے تصوّر بھی نہ کیا تھا — ایک حقیقت ہے جو سچائی کا روپ دھار رہی ہے۔ پاکستان کا یہ علاقہ پانی کے ساتھ ساتھ ترقّی کی راہ پر گامزن ہے۔

حکومتِ پاکستان کی زیرِ نگرانی امریکیوں نے اپنے وطن سے دور دُھوپ، کی سرزمین میں اپنا گھر بسا لیا ہے اور اس خوش باش چھوٹی سی دنیا میں ہر طرف سکون اور طمانیت کا راج ہے۔ امریکی لوگ مختلف مذاہب اور اقوام کے ساتھ رہنا سیکھ رہے ہیں اور اُن کے بچّے پاکستانی، فرانسیسی اور جاپانی بچّوں کے ساتھ پڑھائی، کام اور کھیل کود میں لگے ہیں۔ اُس وقت کتنی خوشی منائی گئی۔ جب منگلا میں سوویں بچّے کی پیدائش کا اعلان کیا گیا۔ یہ ایک پاکستانی بچّہ تھا جس کی ولادت امریکی ڈاکٹر اور موٹی تازی ہنس مکھ نرس کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ یہ خیر سگالی کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ سفارتی حلقہ کے لوگ ہر ممکن طریقے سے لوگوں میں اپنائیت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔

بین الاقوامی منصوبوں میں منگلا نے، جو چند سال پہلے ایک غیر معروف مقام تھا، اب حقیقی بین الاقوامی حیثیت حاصل کر لی ہے اور مختلف ممالک کے لوگ شانہ بشانہ نہایت جوش و خروش اور تعاون کے ساتھ محنت میں مصروف ہیں۔ اس منصوبہ کے لئے مقام کے انتخاب سے پہلے کئی سال تحقیقات اور ارضیاتی تجربوں میں صرف ہوئے۔ یہ تمام کام پاکستان کے پانی اور بجلی کے ترقیاتی ادارہ

(WAPDA) نے اپنی اور پارٹنرز کے اشتراک سے کیا تھا جو ۱۹۵۸ء سے اس ادارہ کے مشیر ہیں۔ تکمیل کے بعد ڈیم کے ایک طرف بہت بڑا بجلی گھر ہوگا اور دوسری طرف فالتو پانی کے نکاس کا رستہ بجلی گھر کے لئے پانچ میں سے تین نہروں سے کام لیا جائے گا، جہاں کھدائی کا کام جاری ہے، نہروں کی تکمیل سے پہلے تقریباً ایک کروڑ مکعب گز مٹی کھود کر دوسری جگہ منتقل کی جائے گی۔

جب بھی اس منصوبہ کا کوئی حصّہ مکمل ہوتا ہے اور دوسرے پر کام شروع ہوتا ہے تو پاکستانی مزدور خوشی سے ناچنے لگتے ہیں۔ انہیں یہ جان کر بڑی طمانیت ہوتی ہے کہ ان کا کام تیزی سے ختم ہو رہا ہے ان کی نظر میں پانی وسیلۂ خوشحالی ہے اور منگلا میں یہ بات پورے طور پر نمایاں ہے۔

پاکستانیوں کے لئے منگلا طلسماتی اثر رکھتا ہے اور اس کا نام آتے ہی ذہن میں اس کا ماضی اور درخشاں مستقبل گھومنے لگتا ہے۔ یہ سیارہ مریخ کا نام ہے اور رومان اس کا حصّہ رہا ہے۔ داستانوں سے پتہ چلتا ہے کہ ایک زمانہ میں یہاں راجہ سرکپ کا قلعہ تھا، جس کو اس نے جنگ میں داؤ پر لگا دیا۔ جب وہ ہار گیا تو اس نے اپنی خوبصورت بیٹی کو پیش کیا۔ وہ اسقدر خوبصورت تھی کہ جیتنے والے خوش قسمت راجہ رسالو نے اس سے شادی کر لی۔ اُن کا عروسی بجرا دریائے جہلم کے دائیں کنارے نہر میں برل گاؤں کے پاس سے گزرا تھا، جہاں آجکل ڈیم پر کام کرنے والے امریکی رہتے ہیں۔

منگلا نے، جو کسی زمانے میں لڑائیوں، خوشیوں اور فتوحات کا مقام تھا، اب سود مندی کا روپ دھار لیا ہے اور اس کا پانی مغربی پاکستان کی خشک زمین کی پیاس بُجھائے گا۔ شروع میں دس ہزار مزدوروں کے لئے کیمپ اور دو سو گھر بنائے گئے جو مزدوروں کے اپنے مکانات سے بہت بہتر ہیں اور جہاں رہ کر وہ بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے بعد اسّی بستروں والا ہسپتال بنا اور پھر پاکستانی علاقہ میں دو عمدہ شفاخانے قائم کئے گئے۔ دو اسکول جن میں سے ایک یورپی طرز کا ہے اور دوسرا پاکستانی، بڑی عمدگی سے چل رہے ہیں۔ ان کے کمرے شوخ رنگوں کے ہیں اور

کھیلنے کے لئے بڑے بڑے میدان ہیں۔

یہاں سیر کرنے اور استادوں کو لڑکوں کو پڑھاتے دیکھ کر بہت لطف آتا ہے۔ پھلوں کا رس، دودھ اور کھانا تمام بچّوں کو ملتا ہے اور اُن کی اِس طرح حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ اسکول جانا ان کے لئے باعثِ مسرت ہوتا ہے۔ قدرتی طور پر ان کے والدین بہت مطمئن رہتے ہیں۔ خواہ باپ ڈیم پر کام کرنے والا مزدور ہی کیوں نہ ہو لیکن اس کے بچّے کو وہ تمام تعلیمی سہولتیں ملتی ہیں جو کسی فورمین کے بچّے کو۔ ہزاروں مزدوروں کو خاص طور پر تیار کیا ہُوا دوپہر کا کھانا ملتا ہے۔

بازار پُر رونق ہیں اور تجارتی مرکز میں خوبصورت دکانیں بنائی گئی ہیں تاکہ عورتوں کو روزمرّہ کی چیزیں خریدنے کے لئے دور نہ جانا پڑے۔ تازہ چیزیں اتنی عمدہ ہوتی ہیں کہ امریکی بھی انہیں خریدنے کے لئے آتے ہیں اور بہت سے تو انہیں ڈبوّں میں بند چیزوں پر ترجیح دیتے ہیں۔ پاکستانی علاقے میں درزی اور موچی نہایت ارزاں قیمت پر بڑا عمدہ کام کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ یہاں ڈیم بننے سے پہلے بھی رہتے تھے، لیکن ان میں بیشتر کسان تھے جن کے پاس گائیں، بھینسیں، بیل اور اپنی زمین تھی۔ انہیں اپنی جگہ سے اکھاڑنا کوئی آسان کام نہیں تھا اور پھر پاکستانی کسان تو اپنے آخری سانس تک کسان ہی رہتا ہے۔

اچھی اُجرت اور حالات میں اچانک تبدیلی بھی کسان کو متاثر نہ کر سکی۔ وہ تو اپنے جانور، گھوڑے اور زمین چاہتا تھا۔ آخر اس نے جگہ چھوڑنے کا معاوضہ قبول کر لیا اور منگلا ڈیم محکمہ آبادکاری کی مدد سے اپنے خاندان اور جانوروں سمیت نئے مکان اور نئی زمین پر بخوشی منتقل ہو گیا۔ اس منصوبہ کی وجہ سے اٹھارہ ہزار پانچ سو خاندان متاثر ہوتے جن میں سے تین ہزار جگہ چھوڑنے پر خوش تھے باقیوں کو دو لاکھ تینتیس ہزار نو سو تینتیس ایکڑ زمین الاٹ کی گئی اور پانچ کروڑ پچپن لاکھ روپیہ دیا گیا اس کے علاوہ نو کروڑ چالیس لاکھ روپیہ معاوضہ کے طور پر ادا کیا جا رہا ہے۔ اب وہ لوگ بالکل

مطمئن ہیں جنہیں اپنے گھر چھوڑنے پڑے۔ نئی جگہ ملنے کے علاوہ ان کے پاس بہت سی چیزیں خریدنے کے لئے پیسہ بھی تھا جو وہ پہلے نہیں خرید سکتے تھے۔ منگلا کے پرانے اور نئے لوگ اب بالکل مطمئن ہیں۔ پچیس ایکڑ میں پھیلے ہوئے فارم سے انہیں سبزیاں، مرغیاں اور انڈوں کے علاوہ پھول بھی ملتے ہیں جو پاکستانیوں کو بے حد بھاتے ہیں۔

تمام ضروری سامان کی دیکھ بھال کے لئے ایک ورکشاپ قائم کی گئی ہے۔ چھ ایکڑ کے رقبہ میں سپلائی ڈپو بھی کھولا گیا ہے۔ یہ تمام کام واپڈا نے کیا ہے جو ہر طرح کا آرام مہیا کرنے میں کوشاں ہے۔ آٹھ ہزار مزدوروں نے منصوبہ کے آدھے سے زیادہ علاقہ میں کھدائی کر ڈالی ہے۔ اس میں خاص ڈیم کے ایک کروڑ بیس لاکھ مکعب گز کے علاقہ میں سے ایک کروڑ دس لاکھ مکعب گز کا حصّہ بھی شامل ہے۔ یہ کام بہت زیادہ ہے۔ منگلا پہاڑی، جو اس علاقے میں سب سے اونچی جگہ ہے اور جس پر تین لاکھ کلوواٹ کا بجلی گھر قائم کیا جا رہا ہے، کی شکل بالکل بدل چکی ہے۔ ڈیم کے باقی حصّوں پر بھی کافی کام ہو چکا ہے اور یہ دیکھ کر بڑی مسّرت ہوتی ہے کہ ہر مزدور اپنی پوری کوشش کر رہا ہے۔

بیشتر پاکستانی تعلیم یافتہ انجینئر، ڈرافٹسمین اور ماہرِ ارضیات ہیں، جنہوں نے انگلینڈ، جرمنی اور امریکہ میں تعلیم پائی ہے اور اب انہی کمپنیوں کے ملازم ہیں، جہاں انہوں نے واپڈا اور بنی (WAPDA AND BINNIE) کے زیرِ نگرانی تعلیم پائی ہے جو واپڈا کے برطانوی مشیر ہیں۔ منصوبہ کے سربراہ، مشہور انجینئر میاں بشیر تمام کام کرنے والوں کو اپنے خاندان کا فرد سمجھتے ہیں اور اگر کوئی کام خراب ہو جائے تو وہ سب ٹھیک ٹھاک کر دیتے ہیں۔

اپنے دفتر اور واپڈا ریسٹ ہاؤس میں، جہاں معزز مہمان ڈیم دیکھنے آتے ہیں، وہ بے حد مصروف رہتے ہیں۔ اکثر اپنے گھر وہ رات گئے پہنچتے ہیں کیونکہ ان کی نظر میں منصوبہ سب سے مقدم

ہے۔ میاں بشیر تمام لوگوں کو جو بارہ ہزار سے اوپر ہیں، خوش رکھنا چاہتے ہیں اور اس مقصد کیلئے دن رات کوشاں رہتے ہیں۔

برل کالونی میں میاں بشیر کا خیر مقدم کیا جاتا ہے اور وہ امریکہ کے یوم آزادی کی تقریبات میں حصّہ لیتے ہیں۔ چودہ اگست کو پاکستانی علاقہ میں انہوں نے امریکیوں کی میزبانی کی اور اس بات کا خاص خیال رکھا کہ وہ تمام تقریبات سے لطف اندوز ہو سکیں۔ میاں بشیر ہر وقت امریکی ٹھیکہ داروں سے بات چیت کے لئے تیار رہتے ہیں اور اس طرح تمام معاملات نہایت خوش اسلوبی سے سرانجام پاتے ہیں۔ یہ لوگ آپس میں اس وقت کا تذکرہ کرتے ہیں، جب ڈیم مکمل ہو جائے گا۔ پانی کو مقررہ مدت میں موڑنے کے علاوہ یہاں سو مربع میل لمبی جھیل ہوگی جو سیاحوں کی دلچسپی کا مرکز ہوگی۔ یہاں کشتی رانی، تیراکی اور مچھلیاں پکڑنے کا انتظام ہوگا۔ امریکی اور پاکستانی ڈائریکٹروں کے باہمی تعاون کی وجہ سے تعمیر کا کام نہایت تیزی سے تکمیل پا رہا ہے۔

پاکستانی مزدوروں کے لئے صرف کام ہی سب کچھ نہیں ہے۔ ان کے لئے مفت سینما، کھیل اور تیراکی کے مواقع حاصل ہیں۔ اس علاقہ میں مساجد، گرجا اور چھوٹے چھوٹے کیفے ہیں جہاں وہ حقہ اور پائپ کا لطف اٹھاتے ہیں اور آرام کرتے ہیں۔ ان کے لئے نمائشیں اور تقریبات منعقد کی جاتی ہیں گو بیشتر مزدور اپنے گھر جا کر آرام کرنا پسند کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ جنہیں پڑھنے لکھنے کا شوق ہے۔ منگلا میں رات کے اسکول جاتے ہیں۔ وہ پاکستانی لوک ناچوں سے محظوظ ہوتے ہیں جو اُن کی تفریح کے لئے پیش کئے جاتے ہیں۔ برل کالونی میں امریکیوں کے لئے یہ گروہ رقص کرتے ہیں۔

یہاں تخلیقی سرگرمیوں اور دوسرے مشاغل کی طرف بھی توجہ دی جاتی ہے۔ یہ اُن پاکستانی مزدوروں کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں جو اس سے پہلے اپنے علاقہ سے باہر نہیں نکلے۔ اب انہیں معلوم ہے کہ محنت سے وہ ہر کام سرانجام دے سکتے ہیں۔ ہمّت اور شجاعت نے مختلف

روپ دھار لئے ہیں۔ پاکستانیوں نے، جو پہلے کام میں ماہر نہیں تھے، اب مختلف شعبوں میں تربیت حاصل کر لی ہے۔ ایسی تربیت جو آئندہ اُن کے ذریعہ معاش کا کام دے گی۔ اُن کی زندگی میں روحانی اور اخلاقی پختگی آگئی ہے۔ اب ان کے کلب ہیں، جن کے بارے میں انہوں نے پہلے سُنا تک نہ تھا۔ ان کے اپنے سربراہ ہیں جو قبیلہ کے سردار نہیں بلکہ اپنی اہمیت کی وجہ سے سربراہ بنے ہیں۔ اب یہ لوگ اپنے ماضی کی کوتاہیوں سے آگاہ ہیں جو حکمت حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ منگلا میں پاکستانیوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ انسانی محنت کوئی بازار میں ملنے والی جنس نہیں۔ محنت اور شوق سے کام کرنے میں عزت اور وقار ہے۔ عزت محنت سے ملتی ہے اور دنیا کے سب سے بڑے منصوبے ـــ منگلا ڈیم ـــ پر مزدور کی حیثیت سے کام کرنے میں اُن کے پیشے میں خوشی ہی خوشی ہے۔

برل کالونی جہاں امریکی رہتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کی طرح ہے جہاں تمام لوگ برابر ہیں۔

تمام کو آرام کے بعد لوگ سیر اور سینما دیکھنے نکلتے ہیں، جو امریکیوں اور پاکستانیوں سب کیلئے کھلے ہیں، اس طرح چھٹی کا دن گزر جاتا ہے۔

ڈیم پر کام کسی وقت بند نہیں ہوتا۔ دن رات چوبیس گھنٹے برل کالونی کے تین سو جوان اور بوڑھے دھوپ اور بارش کی پرواہ کئے بغیر مختلف کاموں میں جٹے رہتے ہیں۔ پاکستانی انجینئر بھی ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اور ان کی زیرِ نگرانی ہزاروں مزدور کام میں لگے رہتے ہیں۔ تعاون بے پناہ ہے اور مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں ہر طرف دوستی ہی دوستی ہے۔ ہر روز یہ لوگ نئی معلومات کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں گویا وہ کسی اسکول کے طالب علم ہوں۔

منگلا ڈیم کی تعمیر ملک کی عظمت میں اضافہ کرے گی، علاقہ کے لوگوں کے لئے ترقی کی راہیں کھولے گی اور وہ اُس خوشحالی سے فیضیاب ہوں گے جو انہیں پہلے میسّر نہیں تھی۔ بالائی

جہلم نہر کے ہیڈ ورکس کے نزدیک امریکی زمین اور سرنگوں کے نیچے گیارہ ہزار فٹ لمباتی اور ۳۸۰ تین سو اسی فٹ کی بلندی پر پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں دنیا کے سب سے بڑے ڈیم کی تکمیل میں حصہ لینے پر فخر ہے۔ انہیں منگلا ڈیم کے ان فوائد کا احساس ہے جو کسانوں کو معاہدہ قرطاس سندھ کے تحت ہندوستان کے تین دریاؤں کا پانی بند ہونے کے بعد حاصل ہوں گے۔ منگلا ڈیم میں سیلاب کے زمانے میں پچاس لاکھ دس ہزار ایکڑ فٹ پانی اکٹھا کر کے سردیوں میں پانی کی کمی کے زمانے میں چھوڑا جائے گا۔ منگلا ڈیم کا مقصد دریائے جہلم کے پانی کو محفوظ کرنا ہے اور یہ قرطاس سندھ کے بڑے منصوبوں میں سے ایک ہے۔

اس عظیم منصوبہ کی سب سے پہلی ضرورت مزدوروں کے لئے رہائش کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ شہر تعمیر کیا گیا۔ خاندانوں کے لئے مکانات اور کنواروں کے لئے خوبصورت کمرے بنائے گئے، لازمی چیزوں سے آراستہ ہسپتال، خوبصورت باغ میں نہانے کا تالاب، قہوہ خانہ، آرام دہ بار اور ریسٹورنٹ، ٹینس کورٹ، والی بال کے میدان اور دوسری تمام تفریحی سہولتیں مہیا کی گئیں، یہاں پر وٹسٹنٹ اور کیتھولک گرجا گھر ہیں۔ مکمل ائیر کنڈیشنڈ بازار ہے، خوبصورت سوپر مارکیٹ ہے اور ایک آرائش خانہ (Beauty Saloon) ہے جسے امریکی عورتیں چلاتی ہیں جو صبح سے شام تک مصروف رہتی ہیں۔ چھوٹی سی خوبصورت لائبریری میں صنعت و حرفت کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ امریکی عورتیں اپنے فالتو وقت میں جو سلائی بنائی اور دوسرے تعمیری کام کرتی ہیں، وہ یقیناً قابل تعریف ہے۔ منگلا میں اسکول بھی تعمیر کئے گئے ہیں جہاں تین سو بچے تعلیم پا سکتے ہیں۔

پہلے سال کے اختتام پر پاکستان میں امریکی سفیر والٹر میکناگھی، عالمی بنک کے انجینئرنگ کے مشیر جنرل وہیلر اور واپڈا کے انجینئرنگ کے مشیر جنرل اچنز نے منصوبہ کا معائنہ کیا۔

ایک اخباری انٹرویو میں امریکی سفیر نے منصوبہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار

روپ دھار لئے ہیں۔ پاکستانیوں نے، جو پہلے کام میں ماہر نہیں تھے، اب مختلف شعبوں میں تربیت حاصل کر لی ہے۔ ایسی تربیت جو آئندہ اُن کے ذریعہ معاش کا کام دے گی۔ اُن کی زندگی میں روحانی اور اخلاقی پختگی آگئی ہے۔ اب ان کے کلب ہیں، جن کے بارے میں انہوں نے پہلے سُنا تک نہ تھا۔ ان کے اپنے سربراہ ہیں جو قبیلہ کے سردار نہیں بلکہ اپنی اہمیت کی وجہ سے سربراہ بنے ہیں۔ اب یہ لوگ اپنے ماضی کی کوتاہیوں سے آگاہ ہیں جو حکمت حاصل کرنے کی طرف پہلا قدم ہے۔ منگلا میں پاکستانیوں کو معلوم ہو گیا ہے کہ انسانی محنت کوئی بازار میں ملنے والی جنس نہیں۔ محنت اور شوق سے کام کرنے میں عزت اور وقار ہے۔ عزت محنت سے ملتی ہے اور دنیا کے سب سے بڑے منصوبے ——— منگلا ڈیم ——— پر مزدور کی حیثیت سے کام کرنے میں اُن کے پیشے میں خوشی ہی خوشی ہے۔

برل کالونی جہاں امریکی رہتے ہیں۔ ایک چھوٹی سی لیگ آف نیشنز (LEAGUE OF NATIONS) کی طرح ہے جہاں تمام لوگ برابر ہیں۔

شام کو آرام کے بعد لوگ سیر اور سینما دیکھنے نکلتے ہیں، جو امریکیوں اور پاکستانیوں سب کیلئے کھلے ہیں، اس طرح چھٹی کا دن گزر جاتا ہے۔

ڈیم پر کام کسی وقت بند نہیں ہوتا۔ دن رات چوبیس گھنٹے برل کالونی کے تین سو جوان اور بوڑھے دھوپ اور بارش کی پرواہ کئے بغیر مختلف کاموں میں جٹے رہتے ہیں۔ پاکستانی انجینئر بھی ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں اور ان کی زیرِ نگرانی ہزاروں مزدور کام میں لگے رہتے ہیں۔ تعاون بے پناہ ہے اور مشترکہ کوششوں کے نتیجہ میں ہر طرف دوستی ہی دوستی ہے۔ ہر روز یہ لوگ نئی معلومات کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹتے ہیں گویا وہ کسی اسکول کے طالب علم ہوں۔

منگلا ڈیم کی تعمیر ملک کی عظمت میں اضافہ کرے گی، علاقہ کے لوگوں کے لئے ترقی کی راہیں کھولے گی اور وہ اُس خوشحالی سے فیضیاب ہوں گے جو انہیں پہلے میسّر نہیں تھی۔ بالائی

جہلم نہر کے ہیڈ ورکس کے نزدیک امریکی زمین اور سرنگوں کے نیچے گیارہ ہزار فٹ لمباتی اور تین سو اسی ۳۸۰ فٹ کی بلندی پر پھرتے نظر آتے ہیں۔ انہیں دنیا کے سب سے بڑے ڈیم کی تکمیل میں حصّہ لینے پر فخر ہے۔ انہیں منگلا ڈیم کے ان فوائد کا احساس ہے جو کسانوں کو معاہدہ قرطاس سندھ کے تحت ہندوستان کے تین دریاؤں کا پانی بند ہونے کے بعد حاصل ہوں گے۔ منگلا ڈیم میں سیلاب کے زمانے میں پچاس لاکھ دس ہزار ایکڑ فٹ پانی اکٹھا کر کے سردیوں میں پانی کی کمی کے زمانے میں چھوڑا جائے گا۔ منگلا ڈیم کا مقصد دریائے جہلم کے پانی کو محفوظ کرنا ہے اور یہ قرطاس سندھ کے بڑے منصوبوں میں سے ایک ہے۔

اس عظیم منصوبہ کی سب سے پہلی ضرورت مزدوروں کے لئے رہائش کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ شہر تعمیر کیا گیا۔ خاندانوں کے لئے مکانات اور کنواروں کے لئے خوبصورت کمرے بنائے گئے، لازمی چیزوں سے آراستہ ہسپتال، خوبصورت باغ میں نہانے کا تالاب، قہوہ خانہ، آرام دہ بار اور ریسٹورنٹ، ٹینس کورٹ، والی بال کے میدان اور دوسری تمام تفریحی سہولتیں مہیا کی گئیں، یہاں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک گرجا گھر ہیں۔ مکمل ایئر کنڈیشنڈ بازار ہے، خوبصورت سوپر مارکیٹ ہے اور ایک آرائش خانہ (Beauty Saloon) ہے جسے امریکی عورتیں چلاتی ہیں جو صبح سے شام تک مصروف رہتی ہیں۔ چھوٹی سی خوبصورت لائبریری میں صنعت و حرفت کی کلاسیں ہوتی ہیں۔ امریکی عورتیں اپنے فالتو وقت میں جو سلائی بُنائی اور دوسرے تعمیری کام کرتی ہیں، وہ یقیناً قابلِ تعریف ہے۔ منگلا میں اسکول بھی تعمیر کئے گئے ہیں جہاں تین سو بچے تعلیم پا سکتے ہیں۔

پہلے سال کے اختتام پر پاکستان میں امریکی سفیر والٹر میکناگھی، عالمی بنک کے انجینئرنگ کے مشیر جنرل وہیلر اور واپڈا کے انجینئرنگ کے مشیر جنرل اچنر نے منصوبہ کا معائنہ کیا۔

ایک اخباری انٹرویو میں امریکی سفیر نے منصوبہ کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار

ان الفاظ میں کیا:۔ "میں نے اندازہ کیا ہے کہ کام کی رفتار بے حد تیز ہے۔ بہت سا کام تکمیل پا چکا ہے۔ پیچیدہ مشینوں پر پاکستانی مزدوروں کی کارگزاری دیکھ کر میں بہت متاثر ہُوا ہوں۔ میں نے دیکھا ہے کہ امریکی اور پاکستانی کارکنوں کے لئے سہولتیں نہایت عمدہ ہیں۔ میں لوگوں میں کام کا شوق اور ٹھیکہ داروں، انجینئروں اور واپڈا کے درمیان اچھے تعلّقات اور تعاون سے بھی بے حد متاثر ہُوا ہوں۔ میرے لئے یہ بہت خوش کن تجربہ ہے۔"

برل کالونی امریکی شہر کا خوبصورت نقشہ ہے جہاں پانچ سو خاندان رہتے ہیں جن میں سے بہت سے واپڈا کے انجینئر اور برطانوی اور بیرونی مشیر ہیں۔ بھاری مشینوں، ٹریکٹروں اور مٹی کھودنے والے انجنوں کے ساتھ زندگی اپنے ڈھرّے پر چل رہی ہے۔

امریکی اور دوسری عورتیں مل کر رفاعی کاموں میں حصّہ لیتی ہیں جو ان کی نیک دلی کی علامت ہے۔ بہت سی عورتیں رضاکارانہ طور پر دستیاں کے لئے دوکان ٹی۔ ایس۔ اے (T.S.A. SHOP) میں کام کرتی ہیں۔ یہ دوکان غریب لیکن ذہین پاکستانیوں کی بہبودی کے لئے کھولی گئی ہے۔ جن کا کام اس دوکان سے چلتا ہے اور جنہیں فروخت سے حاصل ہونے والی تمام آمدنی ملتی ہے دُستیاں ان عورتوں کی محفل ہے جو رفاعی کاموں کے لئے اپنی خدمات پیش کرتی ہیں اور میزبان ملک میں خیرسگالی کا جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ ٹی۔ ایس۔ اے جس سے مراد ٹیکنیکل سروس ایسوسی ایشن ہے عورتوں اور لڑکیوں کو کام مہیّا کرنے کے لئے لاہور میں قائم ہوئی تھی۔ تاکہ معیارِ زندگی بلند کیا جا سکے۔ انہیں کشیدہ کاری کا کام سکھایا جاتا ہے اور مال مہیّا کیا جاتا ہے۔ کام کا اچھا معاوضہ ملتا ہے۔ اس کے نتائج حیران کن ہیں۔ یہاں کشیدہ کاری کی ہوئی ساڑھیاں، بچّوں کے خوبصورت کپڑے اور ہاتھ کی بنی ہوئی دوسری چیزیں ملتی ہیں۔ پھر دُستیاں، منگلا منتقل ہو گئی اور بہت سی عورتیں اس کی ممبر بن گئیں۔ ان خواتین کو اِس غیر منافع بخش ادارہ کی رکنیت پر فخر ہے۔ جس



دریائے جہلم کا رُخ تبدیل کرنے کے لیے پانچ سُرنگیں،

کے تحت ریڈ کراس اور زچہ و بچہ کی بہبود کا مرکز بھی چل رہا ہے۔ تحائف اور ہاتھ کی بنی ہوئی چیزوں کی دکانیں برل کالونی میں خوب چلتی ہیں۔ فیروز سنز کی چھوٹی سی دکان بھی مقبول جگہ ہے۔ فوٹو گرافک کلب تعلیمی موضوعات پر فلمیں دکھاتا ہے جن سے برل کالونی کے لوگ خوب لطف اندوز ہوتے ہیں۔

کالونی کے لوگ بچوں اور والدین کی محفل، سکاؤٹوں کا کیمپ، ۴ جولائی کو امریکہ کے یوم آزادی کی تقریبات، بنگو، رقص، تیراکی کے مقابلے، برج کی کلاسیں، ڈرامے اور ہر طرح کی

محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ جن میں تمام لوگ ہنسی خوشی حصّہ لیتے ہیں۔ انفرادی طور پر یہاں لوگوں کی بہبود کے لیے اور بھی بہت سی چیزیں ہیں۔ منگلا میں ایک امریکی عورت نے ٹائپ رائٹر خرید کر طالب علموں کو کام میں مدد دینے کے لئے مستعار دے دیئے ہیں۔ میرے خیال میں سب سے اثر انگیز وہ دن تھا۔ جب منگلا کی پنک لیڈیز (PINK LADIES) ایک امریکی خیراتی ادارہ نے برل ہسپتال میں پیدا ہونے والے سوویں بچے کو تحائف سے لاد دیا۔ یہ خوبصورت پاکستانی بچہ واپڈا کے انجینئر کا تیرہواں بچہ تھا جو خوش قسمتی سے اپنے ملک کے یوم آزادی ۱۴ اگست کو پیدا ہُوا تھا۔ اس بچہ کی پیدائش پر شور غوغا کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ یہ پاکستانی امریکی کالونی میں پیدا ہُوا تھا۔ آرچی بالڈ کو بھی اس کی فوراً اطلاع دی گئی اور وہ بے حد خوش ہوئے۔

برل کالونی کی ایک اور خاص چیز چھوٹا سا اخبار برل ٹاؤن کرائیر (BARAL TOWN CRIER) ہے جس کو منگلا ڈیم ٹھیکہ داروں کا محکمہ تفریح چھاپتا ہے۔ اس میں تمام خبریں اور عورتوں کی پسند کے لطیفے ہوتے ہیں۔ مختلف اطلاعات، اسکول کی خبریں، سفر کے بارے میں اطلاعات (منگلا میں پان امریکن اور پی۔ آئی۔ اے کے دفاتر موجود ہیں)، منگلا آنے والے لوگوں اور مشہور صحافیوں اور اُنکے اپنے محکمۂ تعلقاتِ عامہ کے مضامین بھی چھاپے جاتے ہیں۔ برل کالونی میں ٹاؤن کرائیر کی حیثیت بالکل روزنامہ اخبار کی سی ہے۔

گو برل میں امریکی اور یورپی گروہ اُونچے درجے کے پاکستانیوں سے مختلف تقریبات اور کام پر ہر وقت ہی ملتے ہیں لیکن برل بذاتِ خود ایک چھوٹا سا محدود علاقہ ہے۔ ہر امریکی دوسرے سے واقف ہے۔ امریکہ کی طرح ایک دوسرے کی خدمت کے جذبہ نے انہیں یکجا کر رکھا ہے۔ یہاں پانچسو خوبصورت مکانات، دومنزلہ فلیٹ اور کنواروں کے لیے ایک سو دس کوارٹر ہیں جو باغات اور ہرے بھرے میدانوں سے گھرے ہوتے ہیں۔ اس علاقہ میں طمانیت ہی

ہے۔ جن کے پاس اپنی کاریں ہیں ان کے لئے بسیں مفت چلتی ہیں (گو تقریباً ہر ایک کے پاس جیپ یا کار موجود ہے) منڈام کو (Mandamco) اور دوسرے کلب اور سینما سب کے لئے کھلے ہیں۔ آپ کا ذوق کچھ ہی کیوں نہ ہو یہاں تفریح کے تمام ذرائع موجود ہیں۔ کوئی خود کو تنہا محسوس نہیں کرتا۔ ایلکس (Elks) ایسٹرن اسٹار، جو بز ڈاٹرز (Jobs Daughters) رینبو گرلز (Rainbow Girls) انڈس ٹوسٹ ماسٹرز کلب اور وائیوز لنچیون (Wives Luncheon) اور دوسرے ادارے ہر ہفتہ میل ملاپ کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ گاف اور کنٹری کلب میں ہر طرح کی تفریح کے مواقع ہیں۔ ہر چھٹی کے روز محفلیں ہوتی ہیں اور منگلا انٹرنیشنل اسکول بچوں کے لئے تقریبات منعقد کرنے میں خاص مقام رکھتا ہے۔ تصاویر کی نمائش اور تقاریر فرصت کے لمحات کو چار چاند لگا دیتی ہیں۔ برل کالونی کے ایک ہزار سات سو چالیس مکینوں میں سے ہر ایک کے لئے کچھ نہ کچھ موجود ہے۔ یہاں گوشے گوشے سے مسرت پھوٹتی ہے۔



ٹیکسلا کے عجائب گھر میں ایک مجسمہ

مشہور ٹیکسلا

پرانی اور نئی کھدائیوں تک پہنچنے کے لئے ایک بار پھر راولپنڈی کی جرنیلی سڑک پر واپس آنا پڑتا ہے جو درحقیقت ٹیکسلا کے عظیم الشان آثارِ قدیمہ کی ابتدا ہے کیونکہ یہاں فضا پر ایک پُراسرار خاموشی طاری ہے۔

راستے کے ساتھ ہرے بھرے کھیت ہیں۔ دیہقانی کپڑوں میں ملبوس گاؤں کے لوگ شرماتے ہوتے آنے والوں کو عجیب نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے دوستی جھلکتی ہے اناج سے لدی ہوئی بیل گاڑی کار کو راستہ دینے کے لئے رک جاتی ہے۔ زندگی بذاتِ خود پرسکون ہے۔ پتوں سے بھری شاخوں سے لدے پھندے درخت ہوا میں جھومتے ہیں گویا پرانے زمانے کے بارے میں سرگوشیاں کر رہے ہوں ۔۔ اس دور کی باتیں جب خانقاہوں میں رہنے والے راہب علم کا منبع سمجھے جاتے تھے جو لوگوں کے لئے وقت کی ہر چیز کا تعین کرتے تھے۔ دور فاصلہ پہ پہاڑیاں نظر آتی ہیں اور سٹوپوں اور ٹیلوں کے کھنڈرات سنہرے آسمان کے سائے میں نظر آتے ہیں۔

ٹیکسلا کے عجائب گھر پہنچنے سے پہلے ذرا سے فاصلہ پر ایک خوشگوار اچنبھا آنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔ ماحول سے لگا کھاتا ہوا ہلکی اینٹوں سے بنا ہوسٹل طالبعلموں اور نوجوانوں کے لئے حاضر ہے جو یہاں کچھ روز رہ کر پرانے عہد کی عظمت کے

کے بارے میں کچھ سیکھنا چاہتے ہیں" کتنی خوشی کی بات ہے" میں نے نئی نسل کے بارے میں سوچا۔ حکومت پاکستان نے یہ جدید مقام صرف بارہ آنے روز کے کرایہ پر ان لوگوں کے لئے بنایا ہے جو بستر، پلیٹیں اور دوسری چیزیں اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔

عجائب گھر، جو خوبصورت باغ میں واقع ہے، ایک عظیم خاموشی میں تخیلی جنت کی طرح لگتا ہے۔ کھیریل سے بنی ہوئی یہ عمارت اپنے دامن میں قدیم دور کے خزانے لئے پرشکوہ انداز میں کھڑی ہے۔ دروازہ عمدہ پتھروں کو جوڑ کر بنایا گیا ہے بیضوی شکل کے دروازے کے اندر داخل ہوتے ہی، گلاب کی پتیوں سے منقش محراب آنکھوں کا خیر مقدم کرتے ہیں۔ محراب ایک سامنے کے دروازے سے نظر آتی ہے جو پھولوں، درختوں اور جھاڑیوں سے بھرے وسیع میدان کو جاتا ہے۔ عجائب گھر کے مہتمم ریاض حسین پُر فخر انداز میں سیاحوں کو چیزیں دکھانے کے لئے آگے بڑھتے ہیں۔ ٹیکسلا سے ان کی گہری دلچسپی ان تفصیلات سے ٹپکتی ہے جو وہ آنے والوں کو بتاتے ہیں۔ ان کی باتوں سے احساس ہوتا ہے کہ یہ کوئی عام عجائب گھر نہیں بلکہ مختلف ادوار کی دنیا ہے جو ایک مختلف طرزِ زندگی کی عکاسی کرتی ہے جب وقت کو پر نہیں لگے تھے اور ہر شخص اور ہر شے کو اس کا مناسب مقام ملتا تھا ہماری بیسویں صدی کے اس ہنگامہ خیز دور میں جب کہ تباہی کے ہتھیاروں کی زیادہ اور بہتر تیاری اتنی ہی اہم ہے جتنی قوموں کے درمیان امن قائم رکھنے کے لئے مذاکرات۔ ٹیکسلا کے عجائب گھر اور اس کے تین شہروں میں رکھے ہوئے نوادرات اور فن پارے اصول کی سادگی اور انسانی زندگی کی متبرک قدر و قیمت کا درس دیتے ہیں۔

گندھارا مجسموں کے بہترین نمونوں میں خالص ہندوستانی اور یونانی رنگ نمایاں ہے۔ پتھروں میں کپڑوں کی سلوٹیں، خواب آلود مسکراہٹیں اور پاکیزہ نقوش یونانی مکتب کے مظہر ہیں۔ ان کی صناع کاری اس دور میں مفقود ہے۔ عمدہ پتھر کے بنے ہوئے بے شمار مجسّمے اور گل دان چھٹی صدی قبل مسیح سے لے کر پانچویں صدی عیسوی تک موجود ہیں۔ ابھی تک چمکتے ہوئے پیتل کے پیالوں کے کناروں پر ہیرے جڑے ہوتے ہیں۔ مٹی کے برتن، سکّوں اور ہیروں سے ان لوگوں کا عہدہ ظاہر ہوتا ہے جو انھیں استعمال کرتے تھے۔ خاص کمروں میں خوبصورت الماریوں میں شہزادوں اور بادشاہوں کے جواہرات و زیورات نمائش کے لئے محفوظ رکھے ہیں۔ ہزاروں سال پرانے ہیرے، یاقوت، نیلم اور لعل آج بھی قیمتی ڈلوں میں لگے ہوئے اتنے ہی خوبصورت لگتے ہیں جتنے عرصہ دراز پہلے عورتوں پر سجے ہوئے لگتے ہوں گے۔ چھوٹی چھوٹی انگوٹھیاں اور کنگن ان کی محبت کی نشانیوں کی غمازی کرتے ہیں جو یونانی اور بدھ اپنے بچوں کی پیدائش سے لے کر بڑے ہوتے تک استعمال کرتے تھے۔

ان بیش قیمت زیورات پر نادر الوجود صناع کاری کی تفصیل دیکھنے میں ہفتے گذر سکتے ہیں۔ ٹیکسلا کے فن کار غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ جس عہد سے وہ تعلق رکھتے تھے وہ پارسائی، صبر و تحمّل اور آشتی کا دور تھا۔ یہ چیزیں عالموں، تعلیم یافتہ لوگوں اور اس دور کا پتہ دیتی ہیں جب صناع کاری تمام پیشوں سے مقدم نہ سمجھی جاتی تھی۔

عجائب گھر کے ٹھنڈے ماحول میں قدیم عہد کی چیزوں کی تعریف کرتے ہوئے

انسان خود کو بھول جاتا ہے۔ پھر چائے کا وقت ہو گیا اور مہتمم نے مجھے ٹیکسلا کے مہمان خانہ میں چائے کی دعوت دی۔ میں یہاں کے تکلفات کو دیکھ کر تعریف کئے بغیر نہ رہ سکی کیونکہ تمام انتظامات کسی اوّل درجہ کے ہوٹل جیسے تھے۔ مجھے افسوس ہوتا تھا کہ یہاں کتنے کم لوگ آکر ٹھہرتے ہیں۔ مجھے رونا آتا تھا کہ مغربی پاکستان کا محکمہ سیر و سیاحت اپنے کتابچوں میں صرف اتنا بتاتا ہے کہ ٹیکسلا کے ریسٹ ہاؤس میں صرف دو ڈبل اور دو سنگل کمرے، ملحقہ غسلخانے، ڈرائنگ روم اور کھانے کا کمرہ ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ان کتابچوں میں یہاں کی پرانی دور کی دلچسپیوں، باغ اور اس کے گرد والا لونوں کا ذکر نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ان پر خلوص پٹھان ملازموں کا بھی نہیں جو آپکی تمام ضروریات پوری کرتے ہیں اور آپ کی منشا کے مطابق کھانے پکاتے ہیں ان کتابچوں میں باہر کے پرسکون ماحول میں سَرو کے درختوں کا بھی ذکر نہیں ہے اور نہ یہ ذکر ہے کہ اس مسحور کن خاموشی میں جہاں صرف فطرت کی آواز ہے اور رات کو پتوں کے سَر سَر انے کی آواز آتی ہے، ٹھہرنے کا کرایہ کھانے کے علاوہ صرف تین روپیہ یومیہ ہے . . . . . .

میں نے دنیا بھر کی عظیم الشان اقامت گاہوں کے بارے میں لکھا ہے۔ میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میں دریائے چین سے لے کر بحرِ اوقیانوس تک اور بحر الکاہل سے لے کر ہمالیہ تک ریسٹ ہاؤس میں ٹھہری ہوں لیکن میں نے ٹیکسلا جیسا سستا سودا کہیں نہیں دیکھا"

ایک ایسا ریسٹ ہاؤس نکرا میں بھی ہے جو جولیاں سے صرف ایک میل دور ہے۔ جولیاں ماہرینِ آثار قدیمہ کی جنت ہے جس کے بارے میں اوسط درجے کے سیاح بہت کم جانتے ہیں۔

ٹیکسلا کی تاریخ اس وقت شروع ہوئی جب دنیا اپنے ابتدائی دور میں تھی۔

اس کا ذکر مہابھارت میں بھی آتا ہے۔ ٹیکسلا کا پہلا نام ٹکشیلا تھا جس کے معنی پتھروں کے شہر کے ہیں۔ اس نام کو بعد میں یونانیوں نے مختصر کر دیا۔ ٹیکسلا پر ایرانیوں نے حملہ کیا اور اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ سات عہدوں کے عروج و زوال کے دور تک، جس میں سکندر اعظم، کنشک، پارتھیائی، چینی، اشوک اور جنگجو سفید فام ہُن شامل ہیں، ٹیکسلا ترقی کرتا رہا یہ تمام فاتحین اس شہر کو ترقی دیتے رہے حتیٰ کہ یہ امیر ترین شہر کہلانے لگا۔ پارسا لوگ اس کے گردونواح میں آکر عبادت کرتے تھے۔ کاریگر اپنے پیشوں میں دلچسپی لیتے تھے۔ اس کی شہرت پھیلتی گئی اور دور دور یہ علم کا مرکز سمجھا جانے لگا۔ عالم اور فلسفہ دان اس کی یونیورسٹی میں آتے تھے۔ سکندر کے بیان کے مطابق ٹیکسلا آباد اور متمول شہر تھا اور یہاں دانا گورنر حکومت کرتے تھے۔

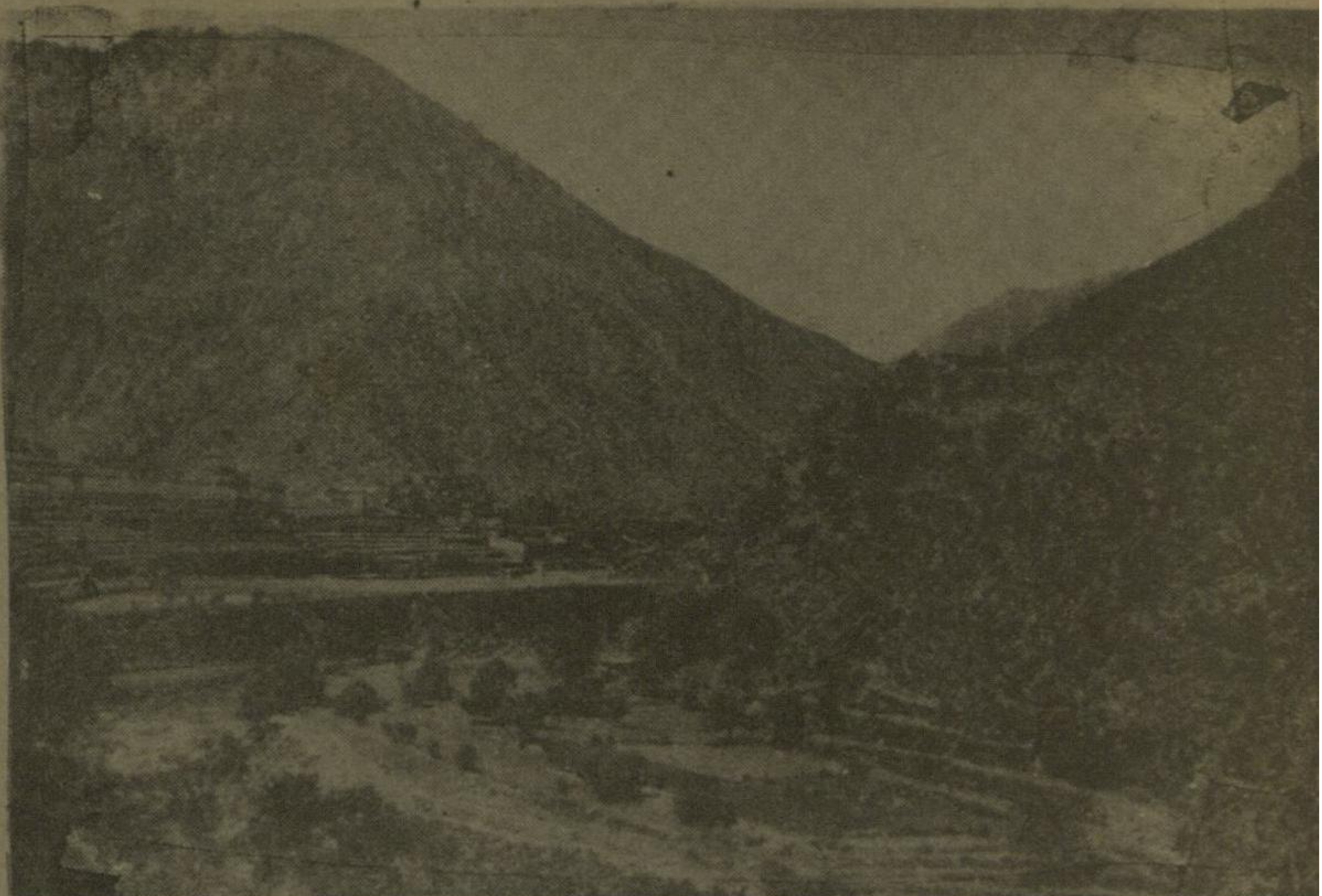
اس صدی کے شروع میں ہونے والی کھدائیوں سے علم کے اس مرکز کی عظمت کا پتہ چلتا ہے۔ یونیورسٹی میں بڑے بڑے کمرے، تالاب اور مکانات تھے۔ پاس کی پہاڑیوں پر تنہائی اور عبادت کے لیے خانقاہیں بنائی گئی ہیں۔ خوبصورت اور ہموار سفیدی شدہ اینٹوں سے بنے ہوئے انتیس چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں چمنیاں ہیں اور دیواروں میں الماریاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ طالب علموں اور راہبوں کے کمرے ہیں ان کے فرشوں میں اب بھی مٹی کے برتن دبے پڑے ہیں۔ نیچے اتر کر حکمرانوں کے اسٹوپے ہیں جو گندھارا فنِ تعمیر کے شاہکار ہیں۔ یہ پاس پاس بنے ہوئے ہیں بڑے اسٹوپوں کے گرد چھوٹے اسٹوپے ہیں جو لازماً خاندانوں کے لیے ہیں۔ کنال کے اسٹوپے سے ایک المیہ کہانی وابستہ ہے۔ یہ شہزادہ کنال کی یاد میں تعمیر

کیا گیا جس کی آنکھیں اس کی سوتیلی ماں کے حکم سے نکلوا دی گئی تھیں جو بدکار عورت تھی........ اشوک کے عہد میں یہ بیر پہاڑی، جو پانچ شہروں میں سے پہلی ہے۔ سنگھا بدھوں کے تربیتی مرکز کا کام دیتی تھی۔ اس کے کھنڈرات میں جو نایاب چیزیں ملی ہیں ان میں سونے اور چاندی کے سکّے، لوحیں، ہاتھی دانت اور پیتل کے برتن اور منقش کھلونے شامل ہیں۔ آثار سے مکانات کی قابل تعریف ترتیب کا پتہ چلتا ہے مکانات کو چوڑی سڑکوں اور پھر زیادہ چوڑی شاہراہوں کے ذریعے جدا کیا گیا ہے۔

دوسرا شہر سرکپ یونانی، سیتھی، کشن، پارتھیائی اور کمشکا عہد میں ہمیشہ دارالخلافہ رہا۔ اس کی دیواریں پتھر کی تھیں جن میں سے چار باقی ہیں۔ مکانوں کے بلاک بالکل ترتیب میں ہیں۔ اور اس کے اپسیدال مندر میں دو سر والی چیلوں کی خانقاہ ہے۔ جس پر آرامی زبان کی عبارتیں صاف نظر آتی ہیں۔ سرکپ کے محل میں بے شمار کمرے ہیں یہاں سے قیمتی اشیاء، جن میں قیمتی پتھر بھی شامل ہیں، دستیاب ہوئی ہیں۔ کمروں کے اندر انسان گندھارا فن تعمیر کے نمونوں کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے جن کے ڈیزائن یونانی اور ہند وطرز کے ہیں۔ پانچویں صدی عیسوی کے کچھ مجسّمے اور پتھر اور سنگ مرمر کے برتن آج بھی محفوظ ہیں۔

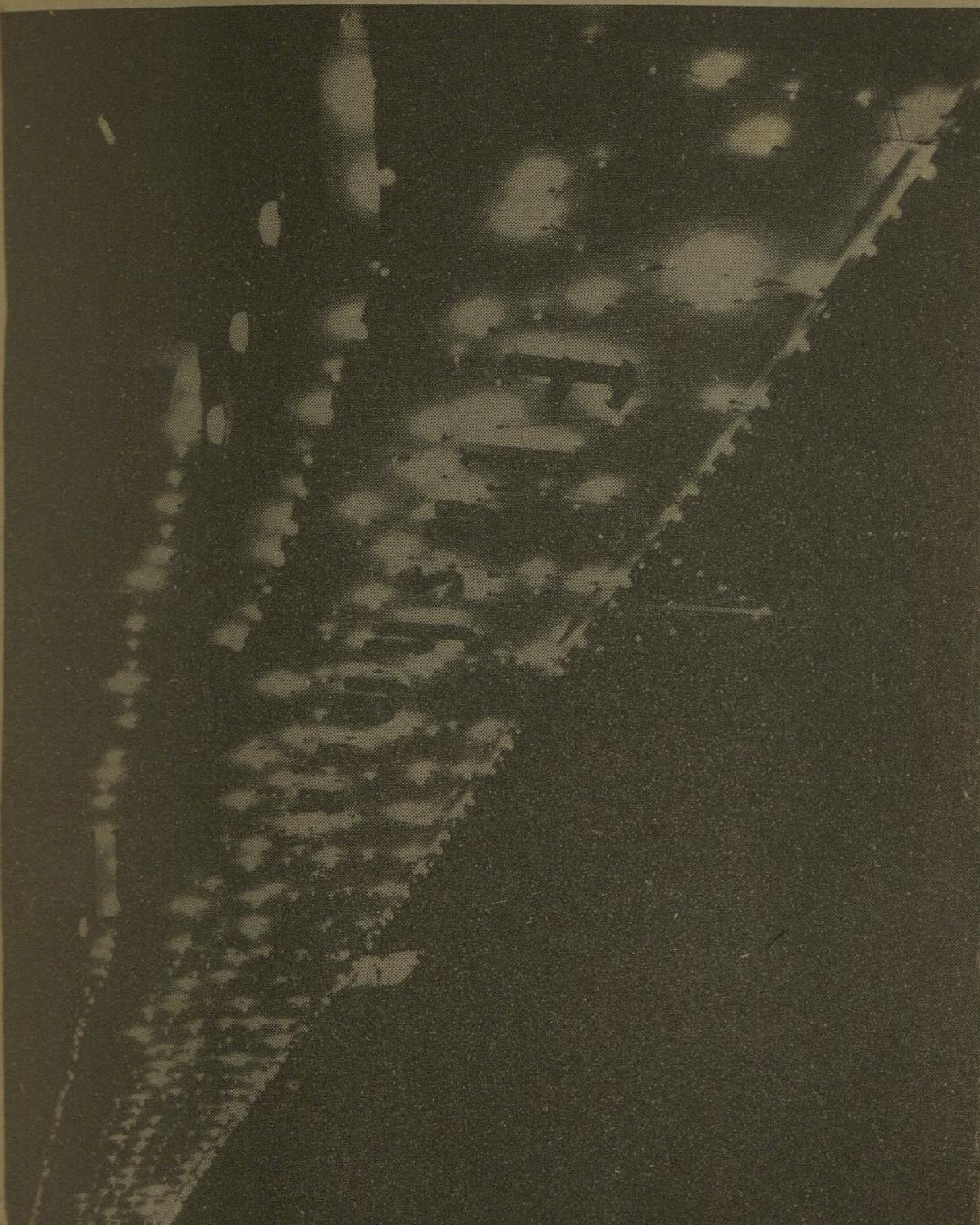
اسی دور کا تیسرا شہر سرسکھ کنشک نے آباد کیا تھا۔ اس کا بہت کم حصّہ کھودا گیا ہے لیکن اس سے اس کی چوکور شکل کا پتہ چل جاتا ہے۔ اس کی خانقاہ میں آواز گونجتی ہے خواہ کتنی دور سے کوئی آواز دے اس کی بازگشت صاف سنائی دیتی ہے۔

بازگشت اور عمارات باقی ہیں لیکن ٹیکسلا کی عظمت اسی وقت معدوم ہوگئی



ٹیکسلا پہاڑیوں کی گود میں

جب پانچویں صدی عیسوی میں سفید فام ہُن لوگوں نے اس پہ حملہ کیا اور پانچ سو سالہ کشن دور کا خاتمہ کر دیا۔ ٹیکسلا میں کھدے ہوئے کھنڈرات اور خانقاہیں اس کی عظمت اور قوت کا پتہ دیتی ہیں۔ شاید یہ بھی آنے والے وقتوں کے بارے میں فہمائش ہے۔



ہوٹل فلشمین

شاہ بلوط کا مرکز نتھیا گلی

پاکستان کی گلیاں ملکوتی مری سے اوپر ایبٹ آباد سے تقریباً بیس میل کے فاصلہ پر ہیں۔ یہ گلیاں صنوبروں کی سرزمین ہیں جن سے برف کے ڈھکے ہوتے پہاڑوں کے نیچے، بھینی بھینی خوشبو نکلتی ہے، جہاں تیز، جانفزا، تازہ، معطر اور ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور صنوبر کے درخت ہر موسم میں اپنی خوشبو پھیلاتے ہیں۔

بہت سے لوگ نتھیا گلی نہیں جاتے جو تمام گلیوں سے زیادہ مشہور اور پسندیدہ جگہ ہے۔ قدیم پہاڑی سڑک سے نہ تو راولپنڈی سے اٹھاون میل کا راستہ آسان ہے نہ ایبٹ آباد سے اکیس میل کا راستہ، لیکن جو لوگ ماحول، تفریح، اور قدرت کے مناظر میں تنوع چاہتے ہیں یہاں پہنچ ہی جاتے ہیں۔ سرسبز زمین اور پتوں سے ڈھکی ہوئی راستہ میں ہر کٹیا شہر سے آنے والے تھکے ہارے مسافروں کا خیر مقدم کرتی ہے۔ یہ گہری شاموں، صحتمند لوگوں، سردیوں میں برف اور گرمیوں میں ٹھنڈی ہوا کا علاقہ ہے۔ صنوبروں کی سرزمین نتھیا گلی میں یکم مئی سے ۲۰ ستمبر تک مسحور کن اور دلکش دنوں اور راتوں کا زمانہ ہے۔ اس سفر کا عوضانہ مادی چیزوں سے نہیں تولا جا سکتا۔ پہاڑوں کی تازہ ہوا، شہر کی دلچسپیوں کی عدم موجودگی اور سنتریوں کی مانند لمبے درختوں کی خاموش عظمت تمام چیزوں سے فرار کا جذبہ پیدا

کرتی ہیں جس سے روحانی مسرت میں اضافہ ہوتا ہے۔

یکایک یوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم نے دوبارہ جنم لیا ہو۔ معمّر، لیکن نوزائیدہ بچوں کی طرح بیماریوں سے پاک۔ لوگوں میں نئی قسم کی توانائی لئے ہوئے —— پھر ہم خود سے پوچھتے ہیں وہ کونسی چیز ہے جو ایسے محسوسات کی جگہ لے سکے — کونسی چیز؟ ہم پوچھتے ہیں جبکہ چاروں طرف سے فطرت کی رعنائیاں ہمیں ایسے سکون میں لپیٹے ہوں جو قلبی اطمینان کو اور بھی ارفع بنا دے —— ساری گلیوں میں ایسا ہی ماحول ہوتا ہے جہاں ریڈیو کے علاوہ انسان کا بنایا ہوا کوئی ذریعہ تفریح نہیں۔ سوائے ان الاؤں کے جو شام کو غروب آفتاب کے وقت سردی سے بچاؤ کے لئے جلائے جاتے ہیں لیکن اس وقت تک روشن نہیں کئے جاتے جب تک تیسرے پہر کے سورج کی آخری کرن تک رخصت نہیں ہو جاتی۔

نتھیا گلی میں غروبِ آفتاب کا منظر دیکھنے والے کو مبہوت کر دیتا ہے۔ اگست میں سورج دیر سے غروب ہوتا ہے۔ مجھے آج بھی اونچی پہاڑیوں پر اپنے ہوٹل سے ایک راستہ پر چلنا یاد ہے جو یوں محسوس ہوتا تھا گویا سیدھا آسمان کی طرف جاتا ہے۔

"وہ دیکھئے" میرے ساتھی نے کہا، "سورج کو دیکھئے۔ دن کے اس وقت بھی یہ آگ کا گولا نظر آتا ہے۔" میں نے اس طرف دیکھا... اور گلیوں نے مجھے ہمیشہ کے لئے اپنا مطیع کر لیا۔ صنوبر کے لمبے درخت شان سے دمک رہے تھے اور وادیاں چھاؤں اور روشنی سے بنائی ہوئی تھیں۔

میں دنگ رہ گیا۔ یہ موسم گرما کی شام میں فطرت کی آتشبازی تھی۔ یہ قوسِ قزح کے تمام رنگوں کا مرقع تھا جو نہایت لطیف انداز میں مدغم تھے اور ایک آرٹسٹ

کو وجد میں لا سکتے تھے، ایک ایسے شخص کو جو جمالیاتی ذوق سے بے حس ہو تصویر کشی پر مجبور کر سکتے تھے۔ ساڑھے سات بجے آگ کا گولہ پہاڑوں کے پیچھے سے بلند ہوا۔ اس کی چمک اتنی تھی کہ میں اور میرا ساتھی دم بخود رہ گئے اور خاموشی نے ہماری خوشی پر مہر لگا دی۔

مجھے یاد ہے کسی نے کہا تھا کہ گرم خطوں میں سورج مدھم پڑ جاتا ہے۔ شاید دنیا کے دوسرے حصوں کے بارے میں یہ درست ہو لیکن نتھیا گلی اور پاکستان میں نہیں۔ سورج آگ کی طرح دہکتا ہے اور پھر نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے گویا کبھی تھا ہی نہیں۔ اگست کے آخری دنوں میں میں روز شام کو یہ منظر دیکھا کرتی تھی اور اِس کا سحر مجھے آج بھی مسحور کرتا ہے۔

آٹھ ہزار دو سو فٹ کی بلندی پہ واقع، نتھیا گلی پاکستان کے تمام پہاڑی مقامات میں سب سے خوبصورت خیال کیا جاتا ہے۔ یہاں سے کوہستان اور کشمیر کی برف سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں کا حیران کن منظر بھی دکھائی دیتا ہے۔

نو ہزار سات سو ترانوے فٹ (۹،۷۹۳) کی بلندی پہ میراجانی کی سنگلاخ سبز ڈھلانیں پلیٹ فارم کا کام دیتی ہیں جہاں سے صبح کی دھند چھٹنے کے بعد ایبٹ آباد اور ناگا پربت نظر آتے ہیں۔ یہاں سے موشی پوری اور لالہ زار، جہاں بڑا خوبصورت باغ ہے، بھی جا سکتے ہیں۔ ڈونگا گلی میں، جس کا پیدل راستہ ہے، تالاب ہیں۔ سترہ قدرتی چشمے ہیں جن کا پانی اکٹھا کر کے مری کو مہیا کیا جاتا ہے۔

دنیا کی سادہ ترین مسرت نتھیا گلی میں پیدل چلنا ہے! پاکستان کے معزز لوگ یہاں ہر سال آتے ہیں۔ نتھیا گلی گرمیوں میں مغربی پاکستان کے گورنر کا صدر مقام ہونے کی وجہ

سے بھی اہمیت رکھتا ہے۔ پہلے اس کی حیثیت گرمیوں میں صدر کی سرکاری رہائش گاہ کی تھی۔ آج کل صدر اپنے گرمیوں کے کیمپ مری سے کبھی کبھار یہاں چلے آتے ہیں۔

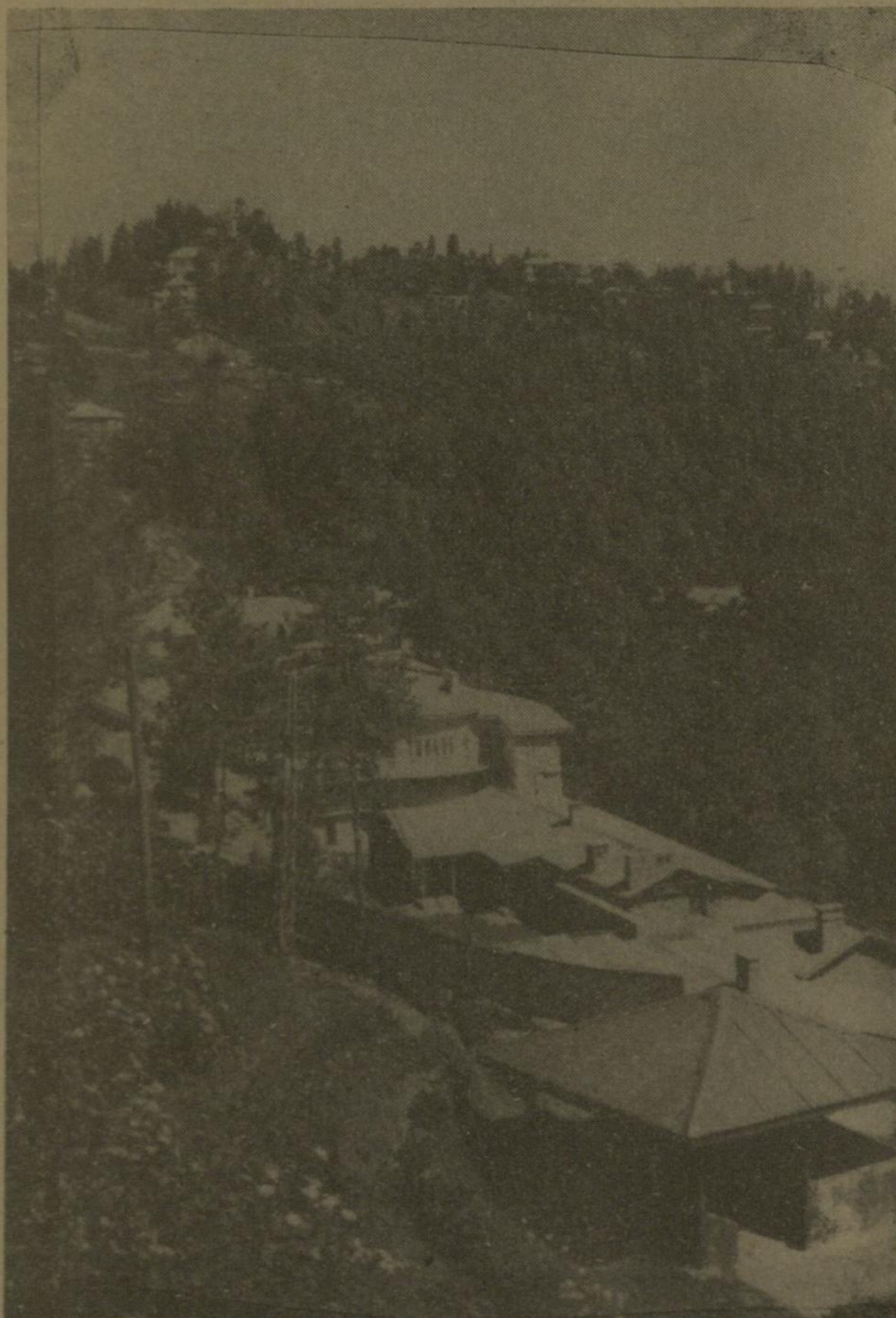
یہاں کی صحت افزا آب و ہوا اور خنکی، جب کہ کراچی اور لاہور گرمی سے بھاڑ کی طرح جھلس رہے ہوتے ہیں، ان لوگوں کو کھینچ لاتی ہے جو گلیوں کی سادہ زندگی میں مطمئن رہتے ہیں۔ نجی مکانات کے علاوہ یہاں دو ہوٹل ہیں۔ ایک پرانے طرز کا گرینیز ہوٹل ہے جہاں قیام و طعام کا کرایہ پندرہ روپے یومیہ سے شروع ہوتا ہے۔ دوسرا پائنز ہوٹل (PINES HOTAL) ہے۔ جو بہت مشہور ہے اور نتھیا گلی کا قدیم ترین ہوٹل ہے۔ حال ہی میں اس کی مویشی خانہ نما (RANCH) ہیئت کو نئی تزئین سے دوبالا کیا گیا اور تمام جدید اور ضروری سہولتیں مہیا کی گئیں۔ آپ کار، جیپ یا بس (آمد و رفت کے تمام ذرائع اس کے دروازے تک آتے ہیں) کسی بھی ذریعہ سے تھکے ماندے، گرد میں اٹے اور بھوک سے بے حال پہنچیں، پائنز میں آپ کا استقبال یوں ہوتا ہے گویا آپ اپنے گھر آئے ہیں...... گرم پانی کے غسل سے پہلے گرم چائے پیش کی جاتی ہے اگر رات ہو تو آگ جلا دی جاتی ہے کیونکہ اس وقت کافی ٹھنڈ ہو جاتی ہے۔ پھر رات کو اچھے ہم جولیوں کے ساتھ عمدہ کھانا کھاتے ہیں آپ کو تعجب ہوتا ہے کہ ہم پہلے پائنز کیوں نہ آئے۔ ان تمام آسائشوں کا معاوضہ ایک آدمی کے لئے اٹھائیس روپیہ روزانہ ہے۔ مالکان یہ کس طرح کرتے ہیں اس کا اندازہ لگانا مشکل ہے۔ اتنے مناسب خرچ پر تمام آسائشیں مہیا کرنے کے لئے یقیناً انہیں علاقہ کی محبت اور گہرا انس ہوگا۔

ہاں نتھیا گلی میں کبھی کبھی بارش بھی ہوتی ہے۔ مدھم مدھم بارش ہوتی ہے لیکن

ہوٹل کی لائبریری میں اندرون خانہ کھیل (INDOOR GAMES) اور دوسری دلچسپیاں سیاحوں کو مطمئن رکھتی ہیں۔ بارش رکنے پر گرم سنہری دھوپ ہر شے پر پھیل جاتی ہے اور نتھیا گلی میں موجودگی کی خوشی از سر نو جنم لیتی ہے۔

یہاں ہوائی ڈاک، ٹیلیفون اور تار کی سہولتیں حاصل ہیں۔ لہٰذا اگر کوئی مصروف سیاح باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرنا چاہے تو خود کو کٹا ہوا محسوس نہیں کرتا۔ یہاں ٹینس اور دوسرے کھیل مقبول ہیں۔ دوسری دلچسپیاں لمبی سیر اور اجنبیوں سے ملاقاتیں ہیں جو ہوٹل کی میزوں پر دوست بن جاتے ہیں — بعض اوقات بش شرٹوں میں ملبوس تند و تیز مزاج تجارتی لوگوں سے بھی ملنا ہو جاتا ہے۔ یہاں انوکھے طرز کی مسجدیں اور ایک پرانا اور خوبصورت گرجا بھی موجود ہے — یہ تمام روحانی اور مادی آرام ہر اس شخص کے لئے ہے جو وہ خوبصورت نتھیا گلی میں چاہتا ہے۔

نتھیا گلی میں پہاڑی راستہ پر چلنا، جو سرسبز قد آور صنوبر کے درختوں سے گھرا ہوا ہے اور جہاں سڑک قوس قزح کے رنگوں والے پھولوں کی شاخوں سے ڈھکی ہے، ہر اٹھنے والے قدم کے ساتھ ایک مہم بن جاتا ہے۔



مری کا ایک نشاط بخش منظر

کہسارِ دلفزا مری

مری، جو پاکستان کے اہم پہاڑی مقامات میں سے ایک ہے، قراقرم کی فلک بوس چوٹیوں کے دامن میں واقع ہے۔ اس کی پہاڑیاں نیچی اور چڑھنے میں آسان ہیں۔ نیم خوابیدہ یا جاگنے کی حالت میں ان پہاڑیوں پر آرام کرنا ایک انمول تجربہ ہے۔ اوپر نیلا چمکدار آسمان ہے۔ کبھی کبھار ریشم کی طرح مہین بادل اڑتے چلے آتے ہیں۔ زمین پر چھوٹے چھوٹے پھولوں کا فرش بچھا ہے جن کی خوشبو فضا کو معطر کرتی ہے اور روزمرہ کی پریشانیاں دھو ڈالتی ہے۔

یہاں چنار اور شاہ بلوط کے درخت بے شمار ہیں۔ چڑیوں کے نغموں کی آواز ندیوں کی لہروں کے مدھم شور میں مدغم ہو جاتی ہے۔ فضا میں نیاپن اور تازگی ہے جو سیاحوں میں جوش پیدا کر دیتی ہے اور انھیں یوں محسوس ہوتا ہے گویا نئی قوت کے ساتھ انھوں نے دوبارہ جنم لیا ہو۔ خواہ آپ شہر کی زندگی یا سفر سے کتنے ہی تھک گئے ہوں، دلپذیر مری میں چند ہی دن زندگی کے متعلق آپ سارا نظریہ ہی بدل ڈالیں گے۔ رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ جائے گی۔ گھنے جنگلات سے گھرا ہوا، وادیٔ کشمیر سے اوپر مری ایک خاص انفرادیت کا حامل ہے یہاں شاعر اور آرٹسٹ شعر موزوں کرنے، گانوں کی طرزیں تیار کرنے، قدرتی مناظر، تہذیب اور

سادگی کی جو مری کا خاصہ ہے، تصویر کشی کرنے آتے ہیں اور وجدان پاتے ہیں۔ اس کے دروازے ایک ایسے شہر پہ کھلتے ہیں۔ جہاں طرز زندگی دیہاتی ہے اور جہاں اطمینان ہی اطمینان ہے۔ ہر سال اپریل میں جب کراچی اور لاہور میں گرمی زور پکڑنے لگتی ہے تو مری میں زندگی کا دھارا پورے شباب پر آتا ہے۔ ان تپتے ہوئے شہروں سے آرام کی خاطر لوگ یہاں کھنچے چلے آتے ہیں۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع مری میں صنوبر کے درختوں سے ڈھکے ہوئے کشمیر پوائنٹ سے لے کر پانچ ہزار فٹ پر سنی بنک تک ٹھنڈی فضا ہے اور تیز بھینی بھینی اور تازہ ہوا چلتی ہے۔

دسمبر، جنوری اور فروری کے سرد مہینوں میں جب یہاں برفباری ہوتی ہے، جانفزا ہوائیں چلتی ہیں اور انسان کو باہر نکلنے پر اکساتی ہیں۔

سال کے باقی حصے میں مری ازلی بہار کی سرزمین بنی رہتی ہے جہاں گلاب کے پھولوں کے ساتھ ساتھ خود رو ڈیزی اور دوسرے طرح طرح کے پھولوں کی بھرمار ہوتی ہے۔ سنبل، شاہ بلوط اور چیری کے درخت اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہیں اور درختوں میں گھونسلہ بناتے ہوئے کوئل کے کوکنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ اگر آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ درحقیقت آپ مری میں ہیں تو یوں محسوس ہوگا گویا انگلستان کے کسی خوبصورت باغ میں کھڑے ہیں۔ ڈھلوان سڑکیں اور ان کے گرد پتھر کے فٹ پاتھ انگلستان کے دیہاتوں سے مشابہ ہیں۔

مری میں ہر طرح کے واقعات رونما ہو سکتے ہیں۔ اس کی فضا میں رومان بسا ہوا ہے، ہوا میں آشنائی کی مہک پھیلی ہوتی ہے اور کیوپڈ کا یہاں سارے سال بسیرا رہتا ہے چھٹیاں گذارنے کے اس خوش باش مقام کو آنے والی سڑکیں زمین اور

آسمان دونوں سے ہمکنار ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ غیر شادی شدہ لڑکے اور لڑکیاں اس کے سحر کو محسوس کرتے ہیں۔ مری میں محبت میں گرفتار ہونا نہایت آسان ہے۔

ذرائع آمد و رفت اتنے ہی متنوع ہیں جتنی خود مری کی خوشنمائیاں اور سیاح اپنے بجٹ کے مطابق کم یا زیادہ خرچ کر سکتے ہیں۔ نزدیک ترین ریلوے سٹیشن راولپنڈی ہے جو پینتیس میل نیچے مغربی پاکستان کی شاہراہ پر، جو کراچی سے پشاور تک جاتی ہے، واقع ہے۔ پنڈی کراچی سے آٹھ سو سینتیس، لاہور سے ایک سو اسّی اور پشاور سے ایک سو نو میل ہے۔ میل اور ایکسپریس ٹرینیں تیز رفتار اور قابلِ اعتماد ہیں۔ سیزن کے زمانہ میں پنڈی سے ہر آدھے گھنٹہ کے بعد ٹیکسیاں اور بسیں چلتی ہیں جو دو گھنٹے کے اندر مری پہنچا دیتی ہیں۔

پنڈی سے مری تک بس کا سفر دنیا کے دلچسپ ترین سفروں میں سے ہے یہ بسیں مقامی لوگوں اور سیاحوں سے بھری رہتی ہیں۔ جو راستے میں دوست بن جاتے ہیں۔ مری آنے کے لیے عمدہ ترین ذریعہ پی آئی اے، کے ہوائی جہاز سے پنڈی پہنچنا ہے جو کراچی سے صبح ناشتے کے وقت روانہ ہوتا ہے اور دوپہر کے کھانے کے وقت پنڈی پہنچ جاتا ہے۔ بل کھاتے ہوئے پہاڑوں کا آخری حصّہ ایک خوشنما منظر پیش کرتا ہے جو میکسیکو کی خوبصورت شاہراہ اکاپلکو کی یاد دلاتا ہے۔ سبز وردی میں ملبوس سنتریوں کی طرح درختوں سے ڈھکی ہوئی بے شمار گھاٹیاں ہیں۔ مری سے سات میل پہلے سواریاں رک جاتی ہیں، لوگ اتر پڑتے ہیں اور پہاڑ کے نیچے سے نکلنے والے قدرتی چشمے کا ٹھنڈا اور بلّور کی طرح شفّاف پانی پی کر لطف اٹھاتے ہیں یہاں کے مناظر کی خوبصورتی، پرندوں کے نغمے، ہر وقت کھلی ہوئی دھوپ اور ہوا

کی تازگی پانی کو آبِ حیات کی طرح بنا دیتی ہیں۔

مری میں پچاس ہزار لوگ آباد ہیں اور ان میں سے بیشتر مال پر مل جاتے ہیں مری کی مال تمام متوقع اور غیر متوقع لوگوں سے ملنے کی جگہ ہے۔ خواتین دن میں کئی بار اپنی ہم جولیاں بدلتی ہیں اور دوبارہ باہر نکل آتی ہیں۔ اوپر کی چوٹی سے سنی بنک تک تین میل لمبی سڑک پر سیر ایک فیشن کی نمائش کی حیثیت رکھتی ہے۔ بڑے ڈاکخانہ سے (جسے غیر سرکاری مرکزِ اطلاعات کی حیثیت حاصل ہے) مال کے ختم تک پاؤ میل کے ٹکڑے میں ہجوم کا اژدہام رہتا ہے، تحفے تحائف کی دکانیں سیاحوں سے بھری رہتی ہیں اور دو مشہور چائے خانوں سمیزا اور لنٹوٹس میں مقامی لوگوں، سیاحوں اور ماہِ عسل منانے والوں سے بھرے رہتے ہیں جو یہاں کھانے کی چیزوں کا لطف اٹھاتے ہیں اور بھولے بھالے انداز میں خوش گپیاں کرتے رہتے ہیں۔ بہت سے شادی شدہ جوڑے جو یہاں پہلی بار ایک دوسرے سے ملے تھے۔ ہمیشہ آتے ہیں۔۔۔ اور اگر آپ کسی ایسے شخص سے ملنا چاہتے ہیں جس کی یاد ڈاک خانہ بھی نہ دلا سکے تو ان چائے خانوں کے بیرے آپ کو بتا دیتے ہیں کہ وہ "کہاں ہیں، کیسے ہیں اور کس حال میں ہیں"۔ گو یہاں کھانے کی بہترین چیزیں ملتی ہیں لیکن ماحول میں خوش گپیوں کی آواز گونجتی رہتی ہے۔ ایسا منظر نیو یارک کے پلازا میں اتوار کی شام کو ہوتا ہے لیکن مری میں یہ روز کی بات ہے۔

بڑے ہوٹلوں میں محفل کا وقت تقریباً ایک ساہے سیسل میں، جو نئی دہلی کے اوبیرائے کی ملکیت ہے، پاکستانی خواتین، رسمی لباس، جس میں روایتی لہراتی شلوار اور قمیض، رنگ برنگی ریشمی ساڑھیاں اور غرارہ شامل ہیں، پہن کر اکٹھی

ہوتی ہیں۔ بیرونی ممالک سے آئی ہوئی عورتیں یورپی لباس پہنتی ہیں اور تمام مرد خواہ وہ پاکستانی ہوں یا سیّاح، سفید ڈنر جیکٹ اور کالے پتلون پہنتے ہیں۔ امریکی لب ولہجہ نمایاں طور پر برطانوی لہجہ میں مدغم ہوتے ہیں۔ دوسرے عمدہ ہوٹلوں برائٹ لنڑ اور لوک ووڈ میں بھی یہی ہنگامہ رہتا ہے لیکن وہ لوگ جو سادہ لیکن آرام دہ مقامات مثلاً برنز (BYRNS)، مسز ڈیویز، کیز اور میٹروپول میں رہتے ہیں عموماً نیلی جینز استعمال کرتے ہیں۔

مری میں تعلیمی ترقی کے بھی بہت سے مواقع ہیں۔ یہاں کی سالانہ ثقافتی محفل میں، جو اگست کے دوسرے ہفتہ میں ہوتی ہے۔ مشہور شعراء، مصنّف اور آرٹسٹ شرکت کرتے ہیں۔ پروگرام کے موسیقی کے حصّہ میں گلوکاروں کو بھی اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقع ملتا ہے۔ یہاں میلے کی سی کیفیت رہتی ہے اور ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی لگن عموماً بہت سے حصّہ لینے والوں کے لیے شاندار مستقبل کی راہیں کھول دیتی ہے۔

پُر فضا مقام ہونے کی وجہ سے مری کے گردونواح میں بہت سے سکول ہیں۔ سارے پاکستان سے مسلمان اور عیسائی بچے یہاں آکر جیزس اینڈ میری کانونٹ میں داخلہ لیتے ہیں۔ گھوڑا گلی میں لارنس کالج اپنی تعلیمی روایات کے لیے مشہور رہا ہے۔ دوسرے اداروں میں سروے ہیڈ کوارٹرز، آرمی ٹریننگ سکول، سگنل سکول اور بیجوں کی پیداوار کا سنٹر شامل ہیں۔ ملٹری ڈیری فارم جراثیم سے پاک دودھ مہیا کرتا ہے اور پینے کا پانی ہمیشہ صاف ملتا ہے۔ عمدہ جدید ہسپتال اور لائیڈز بنک کی شاخ شہری ضرورتوں کو مکمل کرتے

ہیں۔ نوجوانوں کے لیے ہوسٹل ہیں۔ غرضیکہ مری میں ہر طبقہ کی ضروریات کا انتظام ہے۔

عبوری دارالخلافہ راولپنڈی نزدیک ہونے کی وجہ سے مری میں بے شمار سفارت خانے ہیں جہاں سفراء گرمیوں میں آکر رہتے ہیں یہ کونسلٹ کی خدمات سرانجام دیتے ہیں۔ لہذا اگر آپ چھٹی پر بھی ہوں تو یہاں سے دور دراز ممالک کے لیے ویزا حاصل کرنا آسان ہے۔

مری میں پیدل چلنا دلچسپ مشغلہ ہے۔ آپ مال سے کشمیر پوائنٹ تک ایک میل لمبی سیر کر سکتے ہیں۔ لارنس کالج کے نزدیک ایک پرانے محل کے کھنڈرات ہیں۔ جہاں آج کل سکاؤٹوں کے لیے کیمپ بنا ہوا ہے۔ سیّاح پوسٹ آفس روڈ پر چھانگلا گلی کی طرف جاتے ہوتے لطف محسوس کرتے ہیں یہاں چنار کے اونچے اونچے درخت ہیں اور سڑک خوبصورت نیل وادی کو جاتی ہے۔ چھانگلا گلی کے چھوٹے سے بازار میں پھلوں کی دوکانیں اور چائے خانے ہیں۔ اور تھوڑی دیر رک کر کچھ کھانے پینے کے لیے اچھی جگہ ہے۔ یہاں سے پتھریلی سڑک کے راستے گالف کلب ہوٹل جایا جا سکتا ہے۔ اس کی ڈھلوان پر بنے ہوئے مکانات بالکل کشمیر کے مکانوں کی طرح ہیں۔ اس سے نیچے اتر کر سرسبز جنگل ہیں جہاں پرندوں کے نغموں اور ندیوں کے بہنے کی آواز کے علاوہ خاموشی چھائی رہتی ہے۔

مری ۱۸۴۹ء سے، جب انگریزوں نے پنجاب پر قبضہ کیا، مشہور ہل سٹیشن کی حیثیت رکھتا ہے۔ انگریزوں کے جنرل کمانڈنگ آفیسر نے مری

میں اپنا مکان بنایا اور فوج کے یونٹوں نے اپر اور لوئر ٹوپہ کے علاقوں کو ترقی دی۔ گرمیوں میں برطانوی فوجیں یہیں رہتی تھیں۔ آزادی کے بعد مری کی شہرت اور بڑھ گئی اور اب یہ پاکستان کا سب سے بڑا اور عمدہ ہل سٹیشن ہے۔

مری دھوئیں سے پاک ہے یہاں نہ صنعتی کارخانے ہیں اور نہ شہری زندگی رائج کرنے کا کوئی منصوبہ۔ اس کی شاہراہوں پہ کاروں کی ممانعت ہے۔ روزانہ شام کو پانچ بجے سے سات بجے تک سوائے رکشوں کے دوسرا ٹریفک بند رہتا ہے۔ رکشوں کو چار آدمی آج بھی اسی طرح کھینچتے ہیں جیسے سو سال پہلے۔ پالکی کی طرح دو آدمی آگے ہوتے ہیں اور دو پیچھے۔ سڑکوں پہ ٹریفک بند رہتا ہے تاکہ لوگ مزے مزے ٹہل سکیں۔ رکشوں کی سست رفتار بالکل مری کے دنوں کی طرح ہے۔ کسی کو جلدی نہیں ہوتی، کوئی بھاگتا دوڑتا نظر نہیں آتا۔ یہاں تو وقت ہنسنے ہنسانے، آرام اور کھیل کے لیے ہے۔ ہمالیہ کی برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں کے بالمقابل مری کو مغربی پاکستان میں چھٹیوں کے مقامات کی ملکہ کی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں زندگی میں نئی لہر دوڑ جاتی ہے۔ یہاں کا پرسکون ماحول نزدیکی دارالخلافہ سے بہت مختلف ہے۔ مری میں سردیوں کے کھیلوں میں "اس کی انگ" اور سکیٹنگ شامل ہیں۔

مری سے صرف چودہ میل دور، سطح سمندر سے آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر سلسلہ ہمالیہ کے ساتھ ایوبیہ میں رہائشی مکانات کی تعمیر جاری ہے۔ ایوبیہ کو ایک عمدہ سڑک جاتی ہے اور سیاح مستقبل کی خوبصورتی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ دو ہزار سات سو پچاس مربع فٹ کے دو علاقوں کو تفریحی مقام کی

حیثیت سے مزید ترقی کے لیے چنا گیا ہے اور بجلی، پانی اور ٹیلیفون کی سہولتیں مہیا کردی گئی ہیں۔

ایوبیہ کو مشرق کا سوئٹزرلینڈ بنانے کے منصوبے زیرِ عمل ہیں۔ اس کے علاوہ ڈھلانوں پر مبتدی اور ماہر "اسکی انگ" کرنے والے لطف اٹھا سکیں گے۔ آٹھ سو فٹ کی بلندی پر پلیٹو پر سیاحوں کو لے جانے کے لیے نئی چیئر لفٹ۔ (CHAIR LIFT) استعمال کی جائے گی۔ یہاں دم بخود کرنیوالے خوبصورت ماحول میں "اسکی انگ" سیکھنے والوں کو تربیت دی جائے گی۔ نیچے بنیادی سٹیشن (BASF STATION) جانے سے پہلے "اسکی انگ" کے ماہر اور دوسرے شوقین لوگ بھی یہاں رک کر لطف اٹھا سکیں گے۔ ماہرین تین ہزار فٹ سے زیادہ لمبا راستہ طے کریں گے اور دوسرے لوگ آرام دہ لفٹ کے ذریعے نیچے اتریں گے اس علاقہ میں مبتدیوں کے لیے تین ڈھلانیں اور بھی ہیں جن کی لمبائی تقریباً ایک ہزار دو سو فٹ ہے۔

گرمیوں میں سیاحوں کے لیے ایوبیہ میں بہت سی دلچسپیاں ہیں۔ پیدل چلنے والوں، کوہ پیماؤں اور سیر کرنے والوں کی ضروریات کے لیے ریسٹ ہاؤس موجود ہیں۔ مری آنے والے سیاحوں کے لیے ایوبیہ ایک انعام کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کا مستقبل بہت درخشاں اور امید افزا ہے۔ سیاح اس شہر میں آگ کے گرد بیٹھ کر محظوظ ہوں گے اور پاکستان کے نئے دریافت شدہ الپائن کی ڈھلوانوں کا لطف اٹھائیں گے جن پر ہر وقت دھوپ چھائی رہتی ہے اور جو دو میل تک آسمان میں اُٹھے ہوئے نظر آتے ہیں

کاغان میں چھٹی

اگر آپ فسانوں، محیر العقل کہانیوں اور قدیم مضافات میں مناظر کا لطف اٹھانے میں یقین رکھتے ہیں..... تو وادیٔ کاغان آپ کو خوش آمدید کہتی ہے پاکستان میں اپنی سیاحت کے دوران، مرمر کے اونچے طویل و عریض کمروں کے مقابلہ میں جہاں خدام اور بیش قیمت اشیاء کے درمیان میں نے اکثر شب و روز گزارے ایک دن میں آخر کار وادیٔ کاغان پہنچی جہاں نہ خدام تھے اور نہ بیش قیمت سامان۔ کسی زمانہ میں صرف باہمت سیاح ہی وادی کا سفر اختیار کرتے تھے لیکن اب پاکستانی خاندانوں، طلباء اور زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کے لیے یہ ایک ایسی پُرسکون جگہ ہے جہاں ہر ذوق کی تسکین کا سامان مہیا ہے۔ مچھلی پکڑنے، شکار، کوہ پیمائی اور پیدل چلنے کے بیشمار مواقع ہیں۔ وادی کا وسیع دامن اونچا اٹھتا چلا گیا ہے، پہاڑوں کی چوٹیوں پر جنگلات ہیں جہاں گھوڑے فاختاؤں کی طرح اڑتے چلتے ہیں اور بچے سڑک پر پڑے ہوئے اخروٹ اکٹھے کرتے ہیں۔ جدید دنیا کی شان و شوکت اور آرام یہاں ناپید ہے ٹیلیفون بہت کم ہیں، سینما کا تو ذکر ہی کیا۔ البتہ گدھوں، بیلوں، اونٹوں اور مچھلیوں کی بہتات ہے اور پرانے دور کی یاد دلانے والے لوگ ان راستوں پر

چلتے ہیں جہاں کبھی سکندرِ اعظم چلا تھا۔

یہاں پہنچتے ہی بیسویں صدی کی گھٹن کافور ہو جاتی ہے اور شاید آپ بھی اس کی سنگلاخ پہاڑیوں اور مقامی باشندوں کے طرزِ زندگی کو دیکھ کر اتنے ہی محظوظ ہوں گے جتنا لطف میں نے اٹھایا۔ طبیعت کی سستی بالکل دور ہو جاتی ہے اور اس کی گھاٹیوں کو دیکھتے ہوئے گرد و نواح کی خوبصورتی دل میں گھر کر لیتی ہے۔ میں نے کاغان کے بل کھاتے ہوئے دریائے کنہار کے چھوٹے چھوٹے ندی نالوں میں مچھلی کو اچھل کر شکاری کی بنسی سے پھنستے ہوئے بھی دیکھا۔ میں اطمینان اور سکون سے معمور تھی دور دور پھیلی ہوئی قدرتی خوبصورتی میری اُمید سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھی۔ اور ہوا ٹھنڈی اور نئی روح پھونکنے والی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ساری وادی باتیں کر رہی ہو اور پتوں کی سرسراہٹ خاموشی میں مدھم آواز کی طرح لگتی تھی۔ سنگلاخ لیکن عظیم الشان وادیٔ کاغان، جو کسی زمانے میں دور دراز سمجھی جاتی تھی اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ صرف جانوروں کے قافلوں کے ذریعے طے کیا جا سکتا تھا، اب وہاں نہایت آسانی سے جیپ کے ذریعے بھی پہنچا جا سکتا ہے۔ جیپ بالاکوٹ سے چلتی ہے جہاں سے ناران کو سیدھا راستہ جاتا ہے۔ بالاکوٹ ضلع ہزارہ میں ہے اور چھوٹے سے خوبصورت گاؤں مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے راستے یہاں پہنچ سکتے ہیں۔

کراچی سے مرکزی مقام راولپنڈی تک ہوائی جہاز کے ذریعے تین گھنٹہ یا ریل کے ذریعے رات بھر کا خوشگوار سفر ہے۔ یہاں سے خوشحال اور چھوٹے سے شہر ایبٹ آباد جانے کے لیے یہ سیاح کی مرضی پر منحصر ہے کہ وہ اس ۷۲ میل عمدہ

شاہراہ کو طے کرنے کے لیے کونسی سواری پسند کرتا ہے۔ ایبٹ آباد خوبصورت مقام ہے اور اس کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے یہاں رکنا یقیناً سود مند ہے کاکول' پاکستان کا مغربی کونہ، ایبٹ آباد سے پانچ میل کے فاصلہ پر ہے جہاں ملٹری اکادمی میں زندگی کے ہر شعبے کے لوگوں کو فوج میں داخل ہونے کے برابر مواقع حاصل ہیں اس علاقہ کا موسم سارا سال معتدل رہتا ہے۔ یہاں پیلیس ہوٹل بہت عمدہ ہے اور یومیہ کرایہ صرف بیس روپے ہے۔ ایبٹ آباد میں اور بھی بہت سے ہوٹل ہیں جنہیں گھریلو طرز پر چلایا جاتا ہے ان میں کرایہ بھی نسبتاً کم ہے۔ پنڈی ہزارہ ٹرانسپورٹ کمپنی کی بہترین اسٹیشن ویگنیں فی سواری پانچ روپے لیتی ہیں اور ان کی پانچوں سیٹیں مخصوص ہوتی ہیں۔ مسافروں سے لدی پھندی بس کا کرایہ ڈھائی روپیہ ہے یا آپ تیس روپے میں نجی کار بھی لے سکتے ہیں جو راستہ میں خوبصورت اور تاریخی مقام ٹیکسلا بھی ٹھہرتی ہے ٹیکسلا راولپنڈی سے پندرہ میل کے فاصلہ پر ہے۔

کاغان جانے کے لیے جیپ اور ٹھہرنے کے تمام انتظامات پہلے سے ہی ایبٹ آباد میں ٹورسٹ بیورو کی مدد سے کیے جا سکتے ہیں۔ جہاں ریسٹ ہاؤس اور ڈاک بنگلے میں رہائش کے لیے پاس ملتے ہیں۔ وادیٔ کاغان میں ہوٹل نہیں ہیں لیکن حکومت کی بنائی ہوئی یہ رہائش گاہیں صاف شفاف ہیں اور شام کو جب ٹھنڈ ہو جاتی ہے تو ان کے آتشدانوں میں صنوبر کی تیز خوشبو والی لکڑی جلائی جاتی ہے۔ ایک رات کا کرایہ تین سے پانچ روپے تک ہے اور بنگلوں میں فلش لگا ہوا ہے۔

مفصل معلومات بالاکوٹ پہنچ کر حاصل ہوتی ہیں، جہاں سیاح یوں محسوس کرتا ہے جیسے وہ ہزارہ کے کسی خاندان کا ایک فرد ہو؛ کیونکہ یہاں کے سٹیشن ماسٹر عبدالرحمان پدرانہ شفقت سے سب کے آرام کا خیال رکھتے ہیں ان کا جیپوں کا قافلہ، جو صوبائی ٹرانسپورٹ سروس کی ملکیت ہے، مضبوط "ویلیز" جیپوں پر مشتمل ہے جو خمدار راستوں کے لیے خاص طور پر بنائی گئی ہیں۔ ان کو تربیت یافتہ پہاڑی سڑکوں پر گاڑی چلانے کے ماہر ڈرائیور چلاتے ہیں۔ عبدالرحمان ان مقامات کا پتہ بتاتے ہیں جن کو عام سیاح نظر انداز کر جاتا ہے۔ ان کے مشاہدہ کی وجہ سے وادیِ کاغان میں قیام انتہائی پر لطف تجربہ بن جاتا ہے۔ اکثر وہ ڈرائیوروں کے ساتھ سڑک پر خود چل پڑتے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جو اگر کسی مسافر بچے کو ماں کی گود میں دودھ کے لیے بلکتا دیکھ لیں تو بھینس کا دودھ لانے کے لیے گاڑی میں سے اتر پڑیں گے۔ اپنے صدر مقام پر وہ تعلقات عامہ کے افسر کی طرح معلومات بہم پہنچاتے ہیں۔ بہت سے سیّاح بار بار واپس آتے ہیں اور عبدالرحمان کے ذاتی تجربہ سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔

کاغان کی عظمت دیکھنے کے لیے پہلا پڑاؤ کوائی ہے جو بالاکوٹ سے پندرہ میل دور ہے۔ کوائی سے شوگران کی خوبصورت مشرقی ڈھلانوں کا آدھ گھنٹہ کا راستہ ہے۔ جہاں اونچے اونچے چیڑ کے درخت بادلوں کو چھوتے نظر آتے ہیں۔ سفید سفید کہر ان کی ہری بھری شاخوں پر جم جاتی ہے۔ پہاڑیاں نازک جنگلی پھولوں سے بھری ہوئی ہیں۔ گھوڑے گھاس پر کلیلیں کرتے ہیں۔ گویا زندگی کی خوشیوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ طالب علم اور نوجوان خوشی اور

جوش میں شوگران کے درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں پر چڑھ جاتے ہیں شوگران سات ہزار آٹھ سو فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔

پہاڑی پر واقع جھونپڑی نما خوبصورت ریسٹ ہاؤس سیاحوں کو دعوت دیتا ہے جو چند دن نایاب پُرسکون ماحول میں گزارنا چاہتے ہیں جہاں جھرنوں کی آواز اور پرندوں کی چہچہاہٹ خاموشی کو توڑتی ہے۔ یہاں سرو کی خوشبو فضا کو معطر کرتی ہے۔ چولہوں سے لکڑی کا دھواں چاندی کی لڑیوں کی طرح لہراتا اٹھتا ہے اور دور دور تک دلفریب منظر پھیلا ہوا ہے۔ مشرق کی طرف سے چودہ ہزار فٹ بلند مکرہ پہاڑ نظر آتا ہے مغرب میں وادی بالاکوٹ ہے اور کندچوٹی اور داور تپ دق سینی ٹوریم نظر آتے ہیں جہاں صاف شفاف فضا میں پھیپھڑوں کی بیماریاں رفع ہو جاتی ہیں۔ شمال میں چودہ ہزار فٹ اونچا پہاڑ موسیٰ کا مصلےٰ نظر آتا ہے۔ جنوب میں ایک سپاہی کی طرح سترہ ہزار فٹ اونچا ملکہ پربت ہے۔ ملکہ پربت کی چوٹی سے کوہ نانگا پربت اور آزاد کشمیر کی خوبصورتی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ محکمہ جنگلات مکرہ تک ایک نئی جیپ کی سڑک بنا رہا ہے جس کے ذریعہ سیاح مشرق میں پہاڑ تک بآسانی پہنچ سکیں گے۔ ایک اور سڑک پارس سے شران تک بنائی جا رہی ہے۔

شوگران کے ایک ہزار باشندے کسان ہیں جن کی رنگت دھوپ میں رہ کر سنہری ہو گئی ہے۔ یہ لوگ تپلے دبلے اور لمبے ہیں اور صحت بخش آب و ہوا میں رہنے کی وجہ سے بالکل کھلاڑیوں کی طرح لگتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ سیاح ان لوگوں کا، جن پر ان کا کوئی حق نہیں، پرتپاک خیر مقدم دیکھ کر مغلوب ہو جائیں

گے۔ بچوں کا انداز نہایت دوستانہ ہے اور وہ اجنبیوں کو تحفہ کے طور پر خشک پھل اور مکئی کی روٹی پیش کرتے ہیں۔ صرف اس لیے کہ آپ وہاں آئے ہیں۔

وادیٔ کاغان کے راستہ پر واپس پہنچ کر کوائی سے پارس چار میل لمبا سفر ہے یہاں ہر شخص کو جنگلے دار دروازے سے گذرنے کے لیے رکنا پڑتا ہے۔ یہ دروازہ صبح کو سوا نو بجے اور پھر شام کو پانچ اور چھ کے درمیان کھلتا ہے۔ اس سے تمام گاڑیاں ایک ایک کر کے گذرتی ہیں تاکہ راستہ بند نہ ہو جائے۔ قدیم امریکی گھوڑا گاڑیوں کے دور کی طرح اونٹ گاڑیاں، بیل گاڑیاں، گھڑ سوار اور پیدل چلنے والے لوگ ایک دوسرے کے پیچھے لائن بنا کر چلتے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو آگے بڑھ جاتے ہیں اور کچھ شام ہونے سے پہلے دریا کے کنارے ٹھہر جاتے ہیں۔ کھانا پکانے کے لیے آگ جلائی جاتی ہے اور رات گذارنے کے لیے عورتیں خیمے کھڑے کر لیتی ہیں۔

بہت سے سیاح جو دروازہ کھلنے کے وقت سے پہلے یا بعد میں پہنچتے ہیں۔ انھیں خوش اخلاقی سے گذارنے کی اجازت دے دی جاتی ہے کیونکہ وہ وادی میں اجنبی ہیں۔ یہ نوازش ایک مسلمہ دستور العمل ہے۔

پارس میں چھوٹا سا بازار اور ایک نیا خوبصورت چائے خانہ ہے جو شاہراہ کے کنارے بنا ہے گرد و غبار سے بچنے کے لیے یہ جنت ہے۔ ہم اسے ریسٹورنٹ کہہ سکتے ہیں، کیونکہ عام چائے خانوں سے یہ بالکل مختلف ہے۔ بہت سے لوگوں کے لیے اکٹھے چائے پینے کے لیے لمبی لمبی میزیں اس کی خصوصیت ہیں۔ تمام دن یہاں سیاح اور مقامی لوگ جمع رہتے ہیں اور بھنے ہوئے مکئی کے ساتھ



وادیٔ کاغان

جو اس علاقے میں پیدا ہوتی ہے، چائے پیتے ہیں۔ تین آنے میں تیز خوشبو والی چائے کی پیالی اور چار آنہ میں مکئی مل جاتی ہے۔ ہر طرف سے انگریزی اور اردو میں ملی جلی باتوں کی آواز آتی ہے۔ کاغان میں چائے خانہ وہاں کے رہنے والوں اور نو واردوں کی ملاقات کا اڈہ ہے۔ یہ سوال ہمیشہ پوچھا جاتا ہے "کیا آپ کو یہ مقام پسند آیا؟" اگر آپ جواب اثبات میں دیں تو لوگوں کے چہرے دمک اٹھتے ہیں۔ چائے خانہ کا مالک بہت سی کارآمد باتیں بتاتا ہے کہ ریچھ کے شکار

کے لیے کون سا وقت مناسب رہے گا، جو آس پاس کے علاقے میں پائے جاتے ہیں۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ گائیڈ کہاں سے مل سکتے ہیں اور پہاڑوں کے کونسے حصے تاریک ہیں۔ چائے خانہ کا فرنیچر پارس میں گھریلو صنعتوں کی شاخ نے بڑی عمدگی سے بنایا ہے۔ یہاں کے لوگ بھیڑ کی اُون سے کپڑے بناتے ہیں۔ گائے کے چمڑے سے جوتے بناتے ہیں اور کم وبیش ہر معاملہ میں بالکل خودمختار ہیں۔

بارہ میل آگے مہاندری ہے جہاں ایک صاف ستھرا ریسٹ ہاؤس ہے یہاں چوکیدار بھی موجود ہے راستے کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت ہیں اور گو جانوروں کے چلنے کی وجہ سے سڑک پر دھول اڑتی ہے لیکن یہاں سایہ اور ٹھنڈی ہوا ہے۔ مہاندری کے لوگ چمڑے کے خوبصورت جوتے بناتے ہیں جن پر طلّے کا کام ہوتا ہے۔ ایک جوڑا آٹھ روپیہ میں مل جاتا ہے۔ کراچی میں یہی جوڑا پچیس روپیہ میں فروخت ہوتا ہے۔ سُنار زیورات بناتے ہیں اور چمکدار دھاتوں سے بٹن ڈھالتے ہیں۔ چاندی کی خوبصورت بالیاں صرف تین روپے میں فروخت ہوتی ہیں اور یہاں کے سناروں سے مل کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ مہاندری کے سیب تربوز جتنے بڑے ہوتے ہیں اور ٹماٹر ملائی کا مزہ دیتے ہیں جیسے ان کے اندر دودھ بھرا ہو۔ گاؤں کے آس پاس کا علاقہ پرانی طرز کا ہے اور مکان پہاڑوں کے دامن میں پتھروں کے بنے ہیں۔ یہاں کسی کو کسی بات کی جلدی نہیں۔ لوگ اپنا کام نہایت اطمینان سے کرتے ہیں۔ سیاحوں کو دیکھ کر ان کی تعریف کرتے ہیں اور اُن کی آمد کو اہم واقعہ سمجھتے ہیں۔

ناران سے تیس میل دور شینو مچھلیوں کی عمدہ پرورش گاہوں کے لیے مشہور ہے، سیاح چھوٹی چھوٹی اور بڑی مچھلیوں کو خاص تالابوں میں ساتھ ساتھ تیرتے دیکھ کر بہت محظوظ ہوتے ہیں۔ یہاں مچھلیوں کی نہایت احتیاط سے پرورش کی جاتی ہے تاکہ کاغان کے دریا ہر سال بھرے رہیں۔ معمولی رقم کے عوض تمام مچھیروں کو لائسنس جاری کیے جاتے ہیں۔

نو میل آگے چھوٹا سا شہر کاغان اپنی مثال آپ ہے۔ اس کی پہاڑیوں کے نیچے دریا کنہار بہتا ہے یہاں سیاح مچھلی پکڑ سکتے ہیں اور شکار کا پورا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ چکور اور ہمالیائی تیتر عام ہیں۔ کالے اور سرخ ریچھ بھی آسانی سے مل جاتے ہیں۔ کاغان کے ریسٹ ہاؤس میں اترنے سے پہلے دھاندری کی طرح یہاں بھی ایک خوبصورت ریسٹ ہاؤس ہے، سیاح اپنے ساتھ یہاں تازہ مچھلیاں اور مرغابیاں لا سکتا ہے۔ اگر کسی کی انگلی میں چوٹ آجائے یا اسپرین کی ضرورت پڑ جائے تو اس کے لیے کاغان میں ایک جدید ہسپتال موجود ہے۔ کاغان، جس کے نام پر وادی مشہور ہے، انتہائی دلکش مقام ہے جہاں دیدہ زیب مکان، ڈاکخانہ، تار گھر اور دوسری آسائشیں میسر ہیں۔ اس کے مناظر کی خوبصورتی سیاح کو مسحور کر دیتی ہے۔ ناران کو جانے والی سڑک کا ساڑھے چودہ میل کا راستہ نہایت دلفریب ہے یوں محسوس ہوتا ہے گویا آپ سوئٹزرلینڈ میں ہیں۔ پہاڑیوں میں اونچی نیچی گھاٹیاں ہیں پس منظر میں پرشکوہ پہاڑ ہیں جن کے سلسلہ نے سارے علاقہ کو اپنے حلقہ میں لے رکھا ہے۔ دیہاتی لوگ درختوں اور پھولوں کی طرح ماحول کا حصہ

معلوم ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ افغانی نسل کے قبائلی ہیں جو ناران میں بس گئے ہیں، انھوں نے مقامی عورتوں سے شادی کر لی ہے اور ان کے بڑے بڑے خاندان ہیں۔ یہ سب موسمِ بہار اور سرما میں اپنے جانوروں کے لیے چارے کی تلاش میں لمبے سفروں پر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔

یہ مضبوط اور توانا لوگ وادی کا چپہ چپہ چھان مارتے ہیں جہاں قسمت لے جاتی ہے خیمے لگا لیتے ہیں اور سردی شروع ہونے پر ٹھنڈی جگہوں سے گرم مقام پر منتقل ہو جاتے ہیں۔ اس خوبصورت پس منظر میں ناہموار راستوں پر بوڑھی عورتیں چھڑیوں سے جانوروں کو ہانکتی ہیں۔ بچے ہاتھوں میں چوزے لیے بیلوں پر سوار گھومتے رہتے ہیں۔ یہی چوزے ان کی خوراک کا سامان ہیں تمام جوان عورتیں، بغیر کسی استثناء کے، موٹے تازے بچے اٹھائے ہوتی ہیں یا حاملہ ہوتی ہیں۔ مرد سمجھدار تاجروں کی طرح تمام دن گھومتے رہتے ہیں اور شام پڑتے ہی آرام کے لیے ٹھہر جاتے ہیں۔ اپنی منزلِ مقصود گلگت تک پہنچنے میں وہ ایک مہینہ لگا دیتے ہیں۔

خالص افغانی قبیلے بھی اس علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ لوگ جو پاوندے کہلاتے ہیں اور ان جنگجوؤں کی نسلوں میں سے ہیں جنہوں نے کابل اور خیبر پاس میں لڑائیوں میں حصّہ لیا۔ ان کے قافلے لمبے چوڑے ہوتے ہیں اور اپنے لباس اور حلیے کی وجہ سے مقامی لوگوں سے بالکل الگ تھلگ لگتے ہیں۔ عورتیں رنگ برنگے بھڑکدار کپڑوں کے اوپر بھاری زیورات پہنتی ہیں مرد چغے پہنتے ہیں اور ان کے چھوٹے چھوٹے بچے، خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں، کوئی نہ

کوئی زیور ضرور پہنتے ہیں۔ ان کی طبیعت میں تجسس کوٹ کوٹ کر بھرا ہے اور جو کوئی ان کی تعریف کرنے کے لیے رک جائے اسے لازماً خریدار سمجھتے ہیں۔ چند سکوں یا چھوٹے موٹے تحفوں (کنگھا، مٹھائی یا رومال وغیرہ) کے عوض تصویریں اتارنے کی اجازت دے دیتے ہیں اگر آپ غور کریں تو یہ اچھا سودا ہے کیونکہ وادیٔ کاغان میں پاوندے سب سے خوبصورت مسافر ہیں۔ رات کو ٹھہرنے کے لیے جگہ نہایت احتیاط سے منتخب کی جاتی ہے اور جس خوبصورت انداز سے یہ لوگ خیمے لگاتے ہیں اس پر کسی بادشاہ کے محل کا گماں ہوتا ہے۔

جانوروں، اونٹوں اور نقدی کی صورت میں کافی دولت کے علاوہ انکے پاس تجارتی سامان بھی ہوتا ہے جو یہ سفر کے دوران فروخت کرتے ہیں پاوندہ عورتیں اپنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہیں۔ اور شادی کے قابل لڑکی کے لیے بہت بڑی رقم طلب کی جاتی ہے۔ پاوندے آپ کو وادیٔ کاغان کے ہر حصے میں ملیں گے۔ یہاں کے بچے شہری بچوں کی نسبت زیادہ خوش قسمت ہیں۔

سڑک کے کنارے وہ فاتحوں کی طرح اونٹ پر سواری کرتے ہیں اور اپنے اردگرد کی دنیا کو دیکھتے جاتے ہیں کیا ہمارے دور کے بچوں کو اس دور دراز اور تاریخی لحاظ سے اہم دنیا کا سفر کرنے کا موقع ملتا ہے؟ بہرحال، اونٹوں کے قافلے روزان پتھریلے اور اکثر خطرناک حد تک تنگ راستوں سے گذرتے ہیں یہ لوگ ہر مہینے بالاکوٹ اور ناران سے گلگت آتے جاتے رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ برفباری شروع ہو جاتی ہے اس زمانے میں یہ لوگ موسم بہار آنے تک کابل اور خیبر پاس کے

دیہاتوں کو واپس لوٹ جاتے ہیں۔ ایک دن میں عموماً یہ لوگ دس سے پندرہ میل تک سفر کرتے ہیں۔ بس وادی کے اندر ناران تک جاتی ہے۔ محکمہ تعمیرات کے ریسٹ ہاؤس میں تقریباً بیس سیاحوں کے لیے جگہ موجود ہے — ناران کاغان سے آدھے راستہ پر ہے۔ تمام جیپ ڈرائیور، تاجر اور قافلے پٹرول لینے، سامان اتارنے اور چڑھانے کے لیے رات کو یہاں قیام کرتے ہیں۔ پٹرول کے بڑے بڑے پیپے پہاڑیوں پر سے لڑھکتے ہیں۔ مچھیرے اپنا شکار اٹھائے خوشی خوشی آتے ہیں اور ان سیاحوں کو جن کے کانٹے سے کوئی مچھلی نہیں لگتی کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ پہاڑوں کی ٹھنڈی رات میں چیڑ کی لکڑی پر بھنی ہوئی مچھلی سے لذیذ اور کیا چیز ہو سکتی ہے؟ ناران میں ایک خوبصورت بازار ہے جہاں آنے والے اپنے اونٹوں کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں۔ بازار کو چھوڑ کر ناران ایک خاموش مقام ہے جو اونچی اونچی چوٹیوں سے گھرا ہوا ہے جن سے لمبی لمبی سڑکیں چھپ گئی ہیں اس علاقے میں بہت سے ہوسٹل ہیں اور کاغان آنے والے طالب علموں کو ہر طرح کا آرام ملتا ہے۔ علی الصبح ہر شخص شکار اور مچھلیاں پکڑنے کی تیاری کرتا ہے اور سب لالہ زار، بٹر کنڈی اور خوبصورت جھیل سیف الملوک پر اکٹھے ہوتے ہیں...... ہر شخص کا انداز جداگانہ ہوتا ہے۔ سیف الملوک جانے کے لیے صرف ایک نہایت تنگ اور دشوار گذار راستہ ہے جس پر گھوڑے یا خچر پر یا پیدل سفر کیا جا سکتا ہے۔ اس راستہ پر چلنا گویا تاریخ کے گرد آلود اوراق میں واپس لوٹنا ہے یہاں سمرقند اور سہارا کے ریگستانوں کی طرح کے میدان ہیں، ہری بھری گھاٹیاں ہیں، جھاڑیوں سے بھری

سکاٹ لینڈ کی طرح کی کھائیاں ہیں، کونوں میں اُگے ہوئے خوبصورت پھول پتھر اور شگاف ہیں اور جھیل کا کہیں پتہ نہیں چلتا۔ پھر اچانک سراب کی طرح چاندی کی مانند چمکتی جھیل نمودار ہوتی ہے...... شیشے کی رنگ برنگی چادر کی طرح جو ہر وقت رنگ تبدیل کرتی رہتی ہے اور ایک آئینہ کی طرح جسمیں آسمان کے تمام رنگ منعکس ہوتے ہیں۔ جھیل میں اچھلتی ہوئی مچھلیوں اور ارد گرد برفپوش پہاڑوں پر چڑیوں کے اڑنے کا نظارہ مسحور کن ہے اس جنت کی خوبصورتی کو دیکھ کر آپ دم بخود رہ جائیں گے...... اور جب ٹھنڈی ہوا چلتی ہے اور سورج کی کرنیں سیف الملوک کی لہروں سے مل کر اٹھکھیلیاں کرتی ہیں تو دنیا کی تمام چیزیں اوجھل ہو جاتی ہیں۔

جھیل سیف الملوک صدیوں پرانی ہے اس سے بہت سی کہانیاں اور قصے وابستہ ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں، جو اس کی گود میں پیدا ہوتے ہیں، آج بھی ایک پراسرار مشرقی کہانی باقی ہے جو الاؤ کے گرد بیٹھ کر بار بار دہرائی جاتی ہے۔ یہ ایک خوبصورت شہزادے کی کہانی ہے۔ جس نے اپنے والدین کا کہنا نہ مانا اور ممنوعہ راستوں پر ہیولائی انسانوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ وہ جھیل پر آپہنچا جو پہاڑ کے دامن میں جواہرات کی طرح چمک رہی تھی۔ اسے جھیل پر مرمریں لباس میں ملبوس، رقص کرتی تتلیوں کی طرح اٹھکھیلیاں کرتی پریاں نظر آئیں۔ پھر وہ پانی کے اندر کود یں اور تیر کر نیچے چلی گئیں۔ چٹان کے ہر سوراخ سے پریاں اس طرح نکل پڑیں گویا پتھروں کے اندر چھوٹے چھوٹے بے شمار گھر ہوں۔ شہزادہ کی تلاش بے سود نہیں رہی۔ اسے واپس آکر سیف الملوک کی پریوں کی کہانی سب

کو سنائی۔ انیسویں صدی کے شروع میں اس کہانی کو صوفی شاعر میاں محمد نے نظم اور گیتوں میں ڈھال دیا اور اسے لافانی کر دیا۔ گاؤں کے عمر رسیدہ لوگ آج بھی میاں محمد کے گیت گاتے ہیں۔ جوان عاشق مزاج لوگ، گڈریئے اور کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے کسان یہ گیت گنگناتے ہیں۔ سیاح انھیں سن کر خوش ہوتے ہیں اور رات کو آگ کے گرد بیٹھ کر کہانی ایک بار پھر دہرائی جاتی ہے اور گاؤں کے لوگ ناچتے ہیں اور میاں محمد کے گیت گاتے ہیں۔ احترام اور خوف کے ملے جلے جذبات کے ساتھ سیاح شہزادے کی مہم کو دل میں چھپائے، یہ امید کرتے ہیں کہ شاید واپس لوٹتے ہوئے وہ تتلیوں کی سی پریاں ان کو بھی نظر آ جائیں۔ نہایت افسردگی کے ساتھ اور چار و ناچار وہ یہاں سے روانہ ہوتے ہیں یہ تمنا لیے کاش وہ ہمیشہ کے لیے یہیں رہ جاتے۔

اس سے بھی زیادہ دلچسپ وقت لالہ زار میں گذارا جا سکتا ہے جو ناران سے صرف بارہ میل دور ہے۔ یہاں سورج کی چمک میں گرمی ہے لیکن آس پاس کے علاقہ میں ٹھنڈی ہوائیں چلتی ہیں۔ لالہ زار میں فنیکوان، صنوبر اور چیڑ کے جنگلات ہیں۔ جنگلات جیسے جیسے اونچے ہوتے جاتے ہیں آسمان پر لمبے لمبے سائے ابھرنے لگتے ہیں اور رجامنی اور ارغوانی جنگلی پھولوں پر سفید دھوئیں کے بادل منڈلاتے ہیں۔ ڈھیروں کی شکل میں زمین پر پڑے ہوئے صنوبر کے پھولوں کی خوشبو فضا کو معطر کرتی ہے اور نظروں سے اوجھل کونوں کھدروں سے نکلتی ہوئی آبشاریں نیچے پتھریلی ندیوں میں گر جاتی ہیں۔

چبوترہ پر بنے ہوئے چھوٹے سے ریسٹ ہاؤس میں ایک کشادہ برآمدہ

بھی ہے۔

وادی کو لوٹتے ہوئے آپ جربد گاؤں میں ٹھہر سکتے ہیں۔ جہاں کنہار کے کنارے گورنمنٹ اسپننگ ملز حال ہی میں تعمیر ہوا ہے۔ یہ فورڈ فاؤنڈیشن کا منصوبہ ہے جس سے تمام گاؤں والوں کو روزگار مل گیا ہے۔ اس چھوٹے سے قصبے کا مستقبل درخشاں ہو گیا ہے۔ یہاں کھیتوں اور باغوں میں گھرے اونچے اونچے سرخ درخت پہاڑوں پر ہر طرف اُگے ہوئے ہیں۔ ان کے سرخ پھول رنگوں سے بھرے ہوتے ہیں اور کپڑے کے کارخانے میں کام آتے ہیں۔ قدرت اس منصوبہ کو کامیاب بنانے کے لیے فیاضی سے کام لے رہی ہے۔

کاغان کی چوٹی تیرہ ہزار فٹ بلند ہے جہاں گلگت کی سرحد پر بابا زار پاس کے ذریعے پہنچا جا سکتا ہے۔ دریا کنہار اس کی تنگ گھاٹیوں میں سے بہتا ہے لیکن بابا زار پاس کی خوبصورتی نانگا پربت کے نظارہ سے دوبالا ہو جاتی ہے جس کی چوٹیاں برف کے سفید لبادے میں چمکتی رہتی ہیں۔ اس کی چمک گڈریوں کی جھونپڑیوں اور سیاحوں کے خیموں پر چھا جاتی ہے اور انھیں یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کسی غار میں سو رہے ہوں۔ وہ آسمان کی سیاہی اور جھلملاتے ستاروں کو دیکھ سکتے ہیں جو اتنے نزدیک معلوم ہوتے ہیں اور یوں لگتا ہے گویا سیاحوں کو شب بخیر کہہ رہے ہوں

میں بسیال میں جھیل لالہ زار کے کنارے کھڑی تھی۔ تیز دھوپ کے باوجود ہوا بے حد ٹھنڈی اور کاٹنے والی تھی۔ پھولوں سے ڈھکی ہوئی جھیل نیلے اور سنہری رنگوں میں جھلمل جھلمل کر رہی تھی گویا آفتاب وقت سے پہلے غروب ہونے

گے ییے زمین پر اتر آیا ہو اور پانی پر چمکدار دھاریاں ڈال رہا ہو۔

کاغان! جسے میں نے طوعاً و کرہاً چھوڑا اور جس کی یاد مجھے آج بھی تڑپاتی ہے...... ایک خوبصورت وادی جس کے باشندے، گو وہ جدید تہذیب سے بے نیاز ہیں، دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں، اپنی لوک کہانیاں سناتے ہیں، اور جب ان کے خیموں کے نزدیک اپنے خیمے نصب کریں تو وہ آپ کے انتہائی خوش اخلاق پڑوسی بن جاتے ہیں۔ کاغان ایسی چیزوں سے مالا مال ہے جو آپ کو متاثر کریں گی اور سکون بخشیں گی۔ ایک طرح سے اس گھاٹی، قدرتی مناظر اور حسن سے مالا مال اس پہاڑی مقام پر آپ کا قیام اور سیر و سیاحت آپ کے دل کو سکون اور اطمینان کی روشنی سے معمور کر دے گی۔ شہزادہ اور اس کی تلاش جیسے از سرِ نو زندہ ہو جائے گی۔ وادی میں آپ کا آخری دن پہلے دن ہی کی طرح دلکش ہوگا بلکہ خوبصورت مناظر دیکھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے کی وجہ سے اس کی ہمت دوبالا ہو جائیگی

کاغان ایک طریقِ زندگی ہے اس کی یاد آپ کے ساتھ زندہ رہے گی......

آپ...... خوش باش سیاح جو یہاں ایک بار پھر لوٹنا چاہیں گے۔

پشاور برِّصغیر کا دروازہ

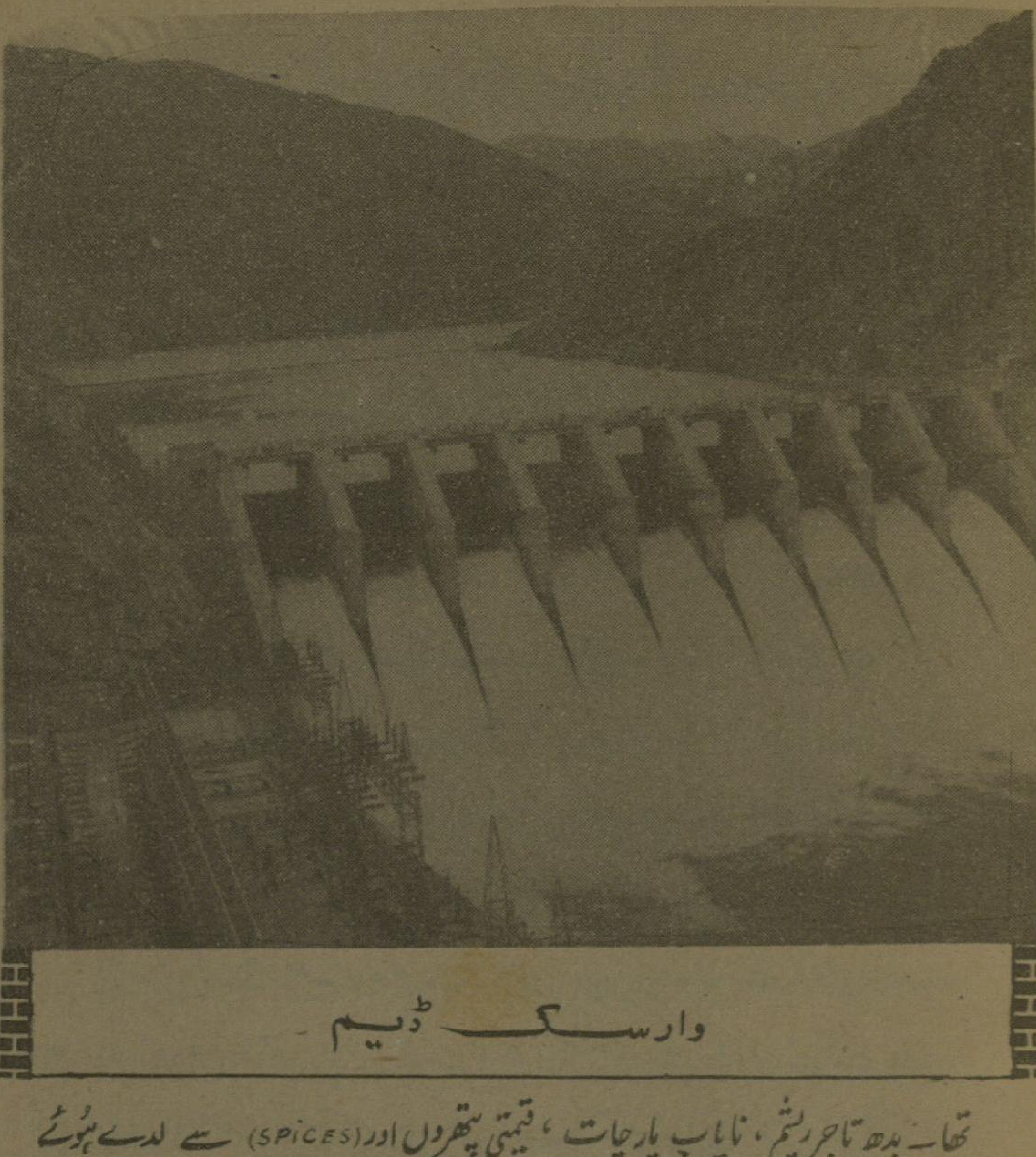
پشاور۔ ایک قدیمِ صدر مقام، جہاں شباب اور پیری باہم شیر و شکر نظر آتے ہیں جہاں پشتو بولنے والے باریش قبائلی فرزندانِ کوہستان ان طلبہ کے قابل فخر والدین ہیں جو کیمبرج کے اسلوب کی انگریزی بولتے ہیں۔ یہ تعلیم انھوں نے نو عمر، نئی اور تابندہ پشاور یونیورسٹی سے حاصل کی ہے۔ ماہر کارو باریو، اور اے سیاحو! جو یہاں ثقافت کی تلاش میں آئے ہو اس کے عشق پیچاں سے سجے طویل و عریض کمروں اور ہالوں میں سے گزرو، اس کے لیکچر کمروں سے گزر کر اس کے آثارِ قدیمہ کے شعبہ میں جاؤ، اس کے فلسفہ، معاشیات، اور لسانیات کے شعبوں سے لے کر پیٹریان کی طرز کے کنڈر گارٹن سکولوں سے گزرو، تمھیں اس کامیابی اور کارکردگی کو اپنی آنکھوں دیکھ کر ایک عجیب احساس گھیرے گا۔ وہ کامیابی جو یہاں کے طلبہ نے جو اونچے نیچے ہر طرح کے گھرانوں سے آتے ہیں، نوابوں کے بچے، مزدوروں کے بچے۔ سب کا ایک ہی نصاب ہے جو ہر ایک کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ یہ یونیورسٹی ایک خواب کی تعبیر ہے۔ آج سے ۱۵ سال پہلے پشاور کے میدانی علاقے کا یہ حصہ ایک بے آباد صحرا تھا۔ آج یہ علم کا گہوارہ ہے جس کو باغات احاطہ کئے ہوئے ہیں۔ یہ سرحد کی تہذیب و ثقافت کا منارہ ہے جو ۲۵۰ سرسبز و شاداب ایکڑوں پر پھیلے ہوئے وسیع و عریض پھولوں کا پارک معلوم ہوتا ہے۔ ایک اجنبی کو یہ کتنی گرمجوشی سے خیر مقدم کہتی ہے۔ یہ بانیٔ پاکستان کے خواب کی تعبیر ہے جو ان کے اس دنیا سے

انتقال کے بعد ظہور پذیر ہوئی۔ ان کی ایک جیتی جاگتی یادگار۔ ابدی یادگار۔ جس میں ہزارہا ہزار طلبہ جوئے رواں کی طرح اس کی دہلیز سے مشتاقانہ اور بے تابانہ حصول علم کی طلب میں داخل ہوتے ہیں وہ مسرور ہیں کہ ماضی، حال اور مستقبل کی حکمت کو حاصل کر رہے ہیں جوان کے اپنے مستقبل کے لئے اہمیت رکھتی ہے۔ ان کے اپنے شاندار علاقے میں اپنی کامیابی کے لئے اہم ہے۔ یہ درسگاہ جو والد کی طرح شفیق وائس چانسلر محمد علی کی سرکردگی میں کام کر رہی ہے، جو سب کو ایک خاندان کے افراد سمجھتے ہیں۔ یونیورسٹی کے میدانوں کی دوستانہ فضائیں، اور خیبر کے پرشکوہ پہاڑوں کے سائے میں یہ جوان نسل پھل پھول رہی ہے۔

پشاور کس لیے اہم ہے؟ بہت سی باتیں ہیں۔ پہلی تو یہ حقیقت کہ یہ شمال مغربی سرحد کے ایک شہر کی حیثیت سے مشہور ہے۔ صدیوں سے تاریخ میں اسے ناقابل تسخیر پٹھانوں کا قلعہ لکھا جا رہا ہے۔ قدیم زمانے کے کاروانوں کا راستہ، اور اب بھی بے شمار صدیاں بیت جانے کے بعد ایک باعزت تجارتی مرکز ہے — محبت، قہقہے اور تشدد، پشاور کے ماحول میں ہمیشہ اکٹھے رہے ہیں اور عسکری موسیقی اس کی ہر چھت سے سننے میں آتی ہے۔

پشاور ایک ایسی جگہ ہے، جس سے آپ یقیناً لطف اندوز ہوں گے۔ اور ایک سیاح جو کچھ نئی چیزوں کی تلاش میں ہے، اس کے لیے یہ پیرایۂ آغاز ہے کیونکہ شہر کے اردگرد مشرق کی پُراسرار اور سحر انگیز کیفیت چھائی ہوئی ہے۔ پشاور کا اپنا ایک وقار ہے۔ قدرت نے اسے زندگی کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ رومان پرور درۂ خیبر اور دلکش ریاست سوات کا دروازہ بھی ہے۔

دو ہزار برس گزرے وسطی ایشیا کو جانے والے تجارتی راستے پر ایک اہم شہر



وارسک ڈیم

تھا۔ بدھ تاجر ریشم، نایاب پارچات، قیمتی پتھروں اور (SPICES) سے لدے ہُوئے قافلے ترکستان اور ہندوستان کی طرف جاتے۔ واپسی پر وہ خطۂ مغرب سے عمدہ linens، شیشے کا سامان، سونا اور چاندی لاتے۔ وہ بحیرۂ رُوم سے گزرتے ہوئے چین جاتے۔

یہ خطّہ خوشحال تھا، شہزادوں اور وزیروں نے کہا ہُوا تھا کہ وہ اس بات کا خیال رکھیں کہ جو شخص بھی یہاں آئے، وہ دنیائے مشرق کی آسائشیں اور شان و شوکت کو پوری طرح

دیکھے۔ کشن بادشاہوں، سکھوں، مغلوں اور آخر میں انگریزوں سب نے اسے اپنا خاص مقام بنایا اور باری باری سب اسے حاصل کرنے کے لیے لڑے۔

آج کل اس کی آبادی ۱۵۵،۰۰۰ کے قریب ہے۔ جو قابلِ فخر پٹھانوں، کینیڈا کے چند باشندوں اور نوجوان امریکیوں کی ایک کثیر تعداد پر مشتمل ہے۔ اب بھی پشاور، پاکستان کا ایک قدیم ترین مشہور شہر ہونے کی حیثیت سے اپنی ایشیائی انفرادیت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ سطح سمندر سے ۱۱۳۶ فٹ کی بلندی پر واقع ہے، اس کے دو نمایاں حصوں پر تازہ اور سرد ہوائیں چلتی ہیں۔ چھاؤنی کا علاقہ پانچ مربع میل کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ سڑکوں پر دورویہ سبز پیڑ ہیں — اور ساتھ ساتھ خوبصورت مکانات — ہر ایک کا اپنا ایک باغیچہ ہے۔ شہر کے علاقہ میں دلکش مال ہے۔ سڑکوں میں بارونق دکانیں ہیں جن کے نام بھی بڑے خوبصورت ہیں — بازار بٹیر بازاں میں یا مشہور بازار قصہ خوانی میں گھومنے میں بڑا لطف آتا ہے۔ یہی کیفیت جی۔ ٹی۔ روڈ کی ہے جو پشاور میں شاہراہ کا کام دیتی ہے۔

پشاور کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ افغان سرحد پر یہ سب سے بڑا فوجی مرکز ہے۔ اور مغربی پاکستان میں پاکستان ویسٹرن ریلوے کا آخری اسٹیشن ہے۔ کراچی سے آنے والی ٹرینیں یہاں براہ راست پہنچتی ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے پاکستان کی اپنی انٹرنیشنل ایئر لائنز کی کئی پروازیں روزانہ کراچی سے صرف دو گھنٹے اور ۴۵ منٹ میں پہنچتی ہیں — اکثر لوگ کراچی سے پشاور اپنی کاروں پر بھی چلے آتے ہیں۔ راستے میں ایک رات انہیں ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اکتوبر سے اپریل تک آب و ہوا خوشگوار اور عمدہ ہوتی ہے۔ لیکن جنوری فروری میں دیہات میں پہاڑیاں برف سے ڈھک جاتی ہیں اور ہوائیں سردی کی شدید چبھن بڑی مزے دار ہوتی ہے۔

ڈینز — یہاں کا بڑا ہوٹل اور ایک عمدہ جگہ ہے۔ میں اسی ہوٹل میں ٹھہری تھی۔ بنگلوں

کے ایک سلسلے کی صورت بنے ہوئے اس ہوٹل کے فرش پر پھول بکھرے ہوئے ہیں۔ ترکی، روس اور یورپ کو آتے جاتے مہمانوں کے باعث یہاں ایک دلچسپ غیر ملکی خوشبو چھائی رہتی ہے۔ امریکہ سے آنے والے تاجروں کے ساتھ یہاں کے ڈپلومیٹ اور ٹیکنیکل ماہرین خوب مذاکرات کرتے ہیں۔ اہلِ قلم اور مہم جو مشروبات پر اکٹھے ہو بیٹھتے ہیں اور ایک دوسرے کو تجسس بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔ ہوٹل کا عملہ نہایت مہمان نواز ہے اور ایک غیر متوقع مہمان کے لیے بھی کسی نہ کسی طرح جگہ بنالی جاتی ہے خواہ ہوٹل کے کمرے بالکل پُر ہوں۔ خرچ مِل ملاکر روزانہ چالیس روپے بنتا ہے۔

محکمۂ سیاحت نے ڈینز میں اپنا چھوٹا سا دفتر کھول رکھا ہے۔ جہاں سیّاح اپنے سفر کا پروگرام بنا سکتے ہیں اور آزاد قبائلی علاقے کے لیے حکومتِ پاکستان کے محکمۂ سیاحت کی طرف سے اجازت نامے حاصل کر سکتے ہیں۔ پی آئی اے ہیڈکوارٹر بھی ڈینز میں ہی ہے۔ ہوٹل کے باہر ٹیکسیاں اور تانگے کھڑے رہتے ہیں۔ بعض چھوٹے چھوٹے ہوٹل گرینز، لالہ زار اور سرد سز میں کمرے اور بستر نہایت معمولی نرخوں پر مل جاتے ہیں۔ ہیڈ ورکس ڈیپارٹمنٹ کے سیکرٹری کی اجازت سے چھاؤنی میں واقع سرکٹ ہاؤس اور ڈاک بنگلہ میں بھی سیاحوں کے لیے رہائش کا انتظام ہو جاتا ہے۔

پشاور کلب میں زندگی کے لمحات پُر آسائش اور پُر شکوہ گزرتے ہیں۔ مہمانوں اور ملاقاتیوں کے لیے ایک بہت بڑا اور خوبصورت نہانے کا تالاب موجود ہے۔ اپنے شہر سے دُور لوگ اکثر یہاں ٹھہرتے ہیں۔ یہاں طرزِ رہائش قدیم ہے لیکن اس میں کچھ جدید سہولتوں کا اضافہ بھی ہے ریٹ پندرہ روپے روزانہ سے شروع ہوتے ہیں، جن میں گھر کے پکے ہوئے عمدہ کھانے بھی شامل ہیں۔ کلب میں ایک لائبریری ہے جہاں پڑھنے کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ چائے پینے، شام کے کھانے اور رقص کے لیے بڑے لان بھی موجود ہیں۔ اس علاقے کا ایک بہت بڑا جصّہ کلب سے

متعلق ہے ۔ شاندار رفائن ہول گاف کورس بھی اس سے وابستہ ہے ۔ کلب میں واقع ٹینس اور سکویش کورٹس قریباً سارا سال ہی استعمال میں رہتی ہیں ۔ آس پاس کے کئی جدید سینما گھروں میں دوپہر اور شام کے شو ہوتے ہیں ۔ نیو فرنٹیر ٹورسٹ کلب اب ہر آنے والے کے لیے کشادہ ہے جہاں جدید کمرے، عمدہ کھانا اور اچھی سروس سب کچھ درمیانے سے نرخوں پر مل جاتا ہے ۔

پشاور کا عجائب گھر بھی دیکھنے کی چیز ہے ۔ اس کا دامن گندھارا آرٹ سے مالا مال ہے اور مجسموں سے لے کر سونے ، چاندی کے نایاب سکوں ، ہتھیار ، عربی اور فارسی کے قدیم نسخے اور انمول جواہرات تک — ساری تاریخی اشیاء موجود ہیں مٹی کے پرانے برتن صدیوں پرانے دستکاروں کے فن کی غمازی کرتے ہیں ۔ باریک لیکن واضح خطوط اور عمدہ کام مسلم کلچر کی وسعتِ دامانی اظہار کے آئینہ دار ہیں ۔ پشاور کے عین قلب میں تاریخی ، گور گھٹڑی بدھ عہد کی ایک حسین یادگار ہے ۔ سکھوں کے عہد میں یہ اطالوی جنرل ایوی تبائل کی رہائش گاہ بن گئی تھی ۔ اندر شہر بازار کی دلکش اور سفید مسجد مہابت خان کے اونچے مینار ہر جانے والے سے کہتے ہیں کہ یہاں ٹھہرو اور دم لے کر آگے جاؤ ۔ شاہ جہاں کے زمانے میں اسے پشاور کے مغل گورنر نے تعمیر کرایا تھا ۔ اس کے میناروں کے جھروکوں سے پشاور کا بڑا خوبصورت منظر دیکھنے میں آتا ہے ۔ فرطِ جذبات سے بے قابو ہو کر میں نے تلے نظر جھکائی تو مجھے آفریدی اور شنواری قبیلوں کے عجیب لوگ دکھائی دیے — طویل قد و قامت اور پرشکوہ جسامت والے یہ باشندے لدے ہوئے اونٹوں کے قافلوں ، خچروں اور گدھوں کے ساتھ گذر رہے تھے ۔ ان سب کا رُخ منڈی کی طرف تھا ۔ میرے ذہن میں وہ قدیم دن گھومنے لگے جب قافلے ان راستوں سے گزرتے اور پھر کس طرح زمین ، زن اور طاقت کے لیے انہی سواریوں سے جنگیں لڑی جاتی تھیں ۔ میں نے ان سارے زمانوں کی جدوجہد کے بارے میں سوچا جس کا انجام یہ ہوا تھا کہ مسلمانوں کی جرأت و سطوت سرحد پر غالب آگئی ۔ اسی وقت میرے ذہن



جدید و قدیم نسل

میں قرآنِ مقدس کی آیتیں آگئیں جن کا مفہوم کچھ ایسے ہے ـــ "تم پر خدا کی رحمت ہو کہ تم نے صبر کیا، اور اب دیکھو کہ یہ آخری منزل کس قدر خوبصورت ہے" ـــ یہ تاثرات اس ماحول اور تنہائی پر منطبق ہو رہے تھے ۔ یہ نظریۂ پاکستان کے بھی عین مطابق تھے ۔ پاکستان جس نے اپنی آزادی اور ایمان کے راستے میں کسی سنگِ راہ کو نہیں رہنے دیا ۔ کچھ عرصہ بعد اپنے چند دوستوں کے ہمراہ میں نے پشاور سے ۱۹ میل دور قلعۂ جمرود بھی دیکھا ۔ یہاں درۂ خیبر پر مشہور "خیبر رائفلز" کا صدر مقام بھی ہے ـــ جواں سال کیپٹن انچارج نے ہمیں ادھر اُدھر گھمایا ۔ ادھر بہت کم لوگ جانے کی جرأت

کرتے تھے، ہمارے اچانک داخلے پر وہ بہت خوش ہوئے۔ ہم نے سپاہیوں کی ورزش دیکھی پھر ایک لیکچر میں بھی گئے جہاں فلموں سے یہ واضح کیا گیا تھا کہ زیر تربیت لوگوں کے کردار اب پُرامن سرحدوں کے محافظوں کے سے ہوں گے۔ ہر سیاح کے لیے درّہ خیبر دیکھنا ناگزیر ہے۔

پشاور سے ۵ میل باہر کینیڈا کے سب سے بڑے کولمبو پلان پروجیکٹ وارسک واقع ہے۔ افغانستان کی سرحد کے نزدیک دریائے کابل پر یہ جگہ نہایت شاندار اور قابلِ دید ہے۔ وارسک بند سے ۱۶۰،۰۰۰ کلوواٹ بجلی پیدا ہوتی ہے اور ۱۰۰،۰۰۰ ایکڑ خشک زمین سیراب ہوتی ہے۔ کینیڈا اور پاکستان دونوں کے باشندوں نے ایک دوسرے سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ کینیڈا کی نوجوان مائیں مخلص آیاؤں سے گھل مل گئیں۔ آیائیں بھی بڑے پیار سے ان کے بچّوں کی دیکھ بھال کرتی تھیں ـــــ عام پاکستانی باورچی جو پلیٹیں بھی نہیں دھوتے تھے، اب خوشی خوشی یہ کام کرتے ہیں ایک غیر ملکی مالکن کی شفقت نگرانی میں گھر کی صفائی بھی کرتے ہیں۔

بچّوں کے درمیان زبان کے فاصلے کو جلد ہی عبور کر لیا گیا۔ کینیڈا کے بچّوں کے لیے اپنے سکول تھے جہاں کینیڈا کے ٹیچر ہی پڑھاتے تھے۔ اور انہیں کبھی اجنبیت محسوس ہی نہیں ہوتی تھی۔ رسّی پھلانگنا اور گیند ایسے کھیل ہیں جن میں الفاظ کے استعمال کی بہت کم ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ بچّوں کے اشارے اور مسکراہٹیں بتا دیتیں کہ بات سمجھ میں آگئی ہے جب کہ ان کی مائیں انہیں دیکھتیں اور پھر اپنی سلائیاں یا ڈیزائن ایک دوسرے سے بدل لیتیں۔ گھریلو زندگی کی پابندیوں نے وارسک کی نجی دنیا کو وہاں ٹھہرے ہوئے ۱۵۰ خاندانوں کے لیے نہایت پُرمسرت مقام بنا دیا۔ تمام مصروف باپ، خواہ وہ انجینئر تھے، مزدور تھے، ویلڈر تھے یا بڑھئی تھے، انہیں جلد ہی احساس ہو گیا کہ ایک ساتھ کام کرنا سب سے مضبوط رشتہ ہے۔ کینیڈا کے اعلیٰ آفیسر بھی پاکستانیوں کی تیز ذہانت کی تعریف میں رطب اللسان ہو گئے۔ اس قبائلی علاقے کے ڈیم پر کام

کرنے والے کینیڈا کے انجینئروں کو اب بھی احترام سے یاد کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ خود بھی آستینیں چڑھا کر کام میں لگ جاتے۔ حالانکہ ڈیوٹی کے لحاظ سے یہ کام ان کے جونیئرز کا ہوتا —— سرنگوں کے گہرے حصوں میں انہیں پسینے میں شرابور اور ہانپتے دیکھا جاتا، اس طرح وہ ایک پائپ لائن کو مناسب مقام پر رکھنے کے لیے ناتجربہ کار مزدوروں کے گروہوں کی رہنمائی کرتے —— ہر روز جب یہ کینیڈائی پاور ہاؤس سے نکلتے تو گریز سے ان کے چہرے سیاہ ہوتے، آٹھ گھنٹے کے اس مسلسل اور عمدہ کام کے باعث ان کے فولادی خود بھی تیل گریس وغیرہ سے آلودہ چمک رہے ہوتے —— بند پر کام کرنے والے قبائلی مزدور زمین کھودتے، مٹی ڈھوتے وقت اس بات پر سخت حیران ہوتے کہ یہ تعلیم یافتہ غیر ملکی لوگ اس ناہموار زمین پر ہمارے ساتھ ہی محنت کر رہے ہیں۔

ماضی میں غیر ممالک سے لوگ آتے بھی تھے تو تلواروں کے ساتھ ان پر حکومت کرنے کے لیے۔

لیکن یوں اس دوستانہ ماحول میں ان کی مدد کرنے، انہیں تربیت دینے کے لیے کبھی کوئی اجنبی نہیں آیا تھا —— صدیوں کی بات ہے کہ حملہ آور آتے اور چلے جاتے —— ہر فاتح انہیں اپنا غلام بنانے کے لیے ہمت آزمائی کرتا —— ان پٹھانوں کو جو پیدا ہی آزاد رہنے کے لیے ہوتے ہیں —— جو بچپن سے ہی بندوق اٹھائے پھرتے ہیں —— اس بہت بڑی دنیا کے مقابلے میں اپنی حفاظت کے لیے جس دنیا پر وہ کبھی اعتبار نہیں کرتے۔ حتیٰ کہ جب برطانوی حکمرانوں نے دریائے کابل کے ساتھ ریلوے لائن بچھانا چاہی تو انہیں بھی پسپا کر دیا گیا۔ کیونکہ وہ اس زمین پر نقل و حمل کے لیے آسانی پیدا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن قبائلی ایسی ہر چیز کے مخالف تھے۔ اب بھی آمد و رفت اور باربرداری کے لیے ان کے پاس خچر ہیں، گھوڑے ہیں، اونٹ ہیں —— اور دو مضبوط پاؤں —— ان کی قسمت اسی ڈگر پر رواں رہی —— حتیٰ کہ کینیڈائی خلوص دل کی متاع لے کر آئے۔ انہوں نے ان کی زمین کو سیراب کرنے کی پیشکش کی —— اور انہیں برقی قوت کی مدد پیش کی تاکہ وہ کم محنت اور زیادہ

اعتماد کے ساتھ بہتر زندگی بسر کرسکیں۔ حکومت پاکستان نے بھی غیور پٹھانوں کے دل میں یہ بات بٹھا دی۔ اور ایک تعلیم یافتہ معزز پٹھان جو کچھ عرصہ باہر بھی رہے تھے۔ وہ اپنے ہم وطنوں کو ان کی زبان میں یہ بتانے لگے کہ مستقبل میں انہیں کیا کیا نعمتیں میسر آسکیں گی۔

شاہ نواز خان صاحب اپنے ہم وطن پٹھانوں کی مانند طویل القامت، مضبوط، جسیم اور سخت مزاج ہیں۔ انہوں نے ان کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے خاص محنت اور وقت صرف کیا ہے۔ روزانہ وہ پٹھانوں کو 'وارسک' کے لیے مجوزہ زمین دیکھنے کو بلاتے ۔۔ صرف باتیں سننے کی بھی انہیں اُجرت دی جاتی ۔۔ وہ انہیں سمجھاتے کہ جب بند مکمل ہو گیا تو دریائے کابل کا چمک دار پانی ان کی بنجر زمینوں میں بل کھائے گا۔ ان کی فصلیں نمو پائیں گی، پھلیں پھولیں گی۔ ان کے بچوں کی مفت تعلیم کے لیے سکول کھل جائیں گے۔ بجلی کی روشنی ان کے گھروں کو منور کرے گی۔ محنت میں وقار بھی ہے اور یہ کسی کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ اس محنت کا معاوضہ انہیں روپے کی شکل میں دیا جائے گا۔ جس سے وہ اپنی ضرورت کی چیزیں خرید سکیں گے۔ اپنی بیویوں کے لیے نئے کپڑے، عورتوں کیلئے زیورات اور سامان آرائش، اپنے لیے سائیکل، اچھی خوراک میسر آئے گی، بہتر رہائش گاہیں ہوں گی اور ان کی جیبوں میں ہمیشہ پیسے کھنکیں گے۔

کئی روز اس سننے سنانے اور مفت پیسے دینے کے بعد، پٹھانوں سے شاہ نواز خان نے پوچھا کہ اب ان میں سے کون کون کام کے لیے آئے گا۔ ضرورت ...، افراد کی تھی۔ صرف چند آمادہ ہوئے۔ باقی ساتھ کے گاؤں میں گھومنے پھرنے چلے گئے، ہفتے گزر گئے اور جب مزدور قبائلی کھنکتے سکوں کے ساتھ اپنے علاقے میں واپس گئے۔ انہیں کھنکاتے اِدھر اُدھر گھومے اور ایک تنہا مکان سے موسیقی کی لہریں اُبھریں۔ جہاں ایک پٹھان نے اپنی اس آمدنی سے ایک ریڈیو خرید لیا تھا۔ پھر کیا تھا جلد ہی ہزاروں پٹھان چلے آئے اور بہت سے پٹھان خاندان وارسک

کے میدان میں رہ رہے تھے۔ پٹھان بچے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ کسی سکول میں داخل ہو رہے تھے اسی لیے وہ چپ چپ سے تھے۔ کام کی جگہ سے باہر پٹھانوں کے سائیکل کھڑے ہوتے۔ ایک پٹھان بھی انسان ہی ہوتا ہے ـــــ اور اپنی خون پسینے کی کمائی سے خریدی ہوئی سواری کا اسے بہت فکر ہوتا ہے ـــ اس لیے اب بھی وہ بندوقیں لے کر کام پر آتے۔ کبھی کبھی بعض تنازعات کا انجام المیہ ہو جاتا۔ لیکن آخر کنیڈائی لوگوں کو خالی ہاتھ دیکھ دیکھ کر پٹھانوں کو بھی اس بات پر تیار کر لیا گیا کہ وہ اپنی بندوقیں گھر رکھ کر آئیں اور اب ۰۰۰، پٹھانوں میں سے کسی کے پاس بھی بندوق نہیں دیکھی جا سکتی۔ وارسک جمہوریت کی ایک صحیح مثال ہے۔ جو پٹھانوں اور کنیڈائیوں کو پانچ گھنٹے کی سخت محنت کے لیے ایک دوسرے سے منسلک رکھتی ہے۔ اگرچہ اب اسے سات آٹھ برس بیت چکے ہیں لیکن کنیڈا کی دوستی اور ملک کے اس دُور افتادہ حصے میں انسانی خدمت کے یہ نقوش اہلِ پاکستان کے دِل میں ہمیشہ تابندہ رہیں گے۔

پشاور سے ۲۵ میل جنوب میں مشہور درّہ کوہاٹ قبائلی علاقے میں واقع ہے جہاں آفریدی قبیلے کے لوگ رہتے اور کام کرتے ہیں ـــــ ان کے ہاتھ کے بنے ہوئے ریوالور اور رائفلیں مشینوں سے بنے ہوئے آلات سے زیادہ عمدہ اور خوش شکل ہوتے ہیں۔ دنیا کے ہر حصے کے سیاح انہیں وقعت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ کوہاٹ ایک چھوٹے سے جزیرے سے مشابہ ہے جہاں بالکل نایاب سامانِ تجارت نہایت ارزاں نرخوں پر دستیاب ہے۔ ذرا تصور کیجیے کہ میں نے ایک دکان پر چین کا ریشمی کپڑا اور میڈرڈ کے (laces) بکتے دیکھے۔ میں نے ایک کریم رنگ (lace wrap) وہیں پہن لیا اور اسے خرید بھی لیا ـــــ ساتھ کھڑے سرخ قبائلی مجھے یہ پہنتے دیکھ کر تحسین کے انداز میں مسکرا رہے تھے۔ بعد میں میں نے مقامی قبائلی سردار کے ساتھ بیٹھ کر ایک گائے کا تازہ اور سرخ رنگ گوشت کھایا۔ گائے

کو ابھی ابھی ذبح کر کے باہر تنور پر پکایا گیا تھا۔ کچے پیاز کے ساتھ اس کا ذائقہ بڑا عمدہ لگا۔ درّہ کوہاٹ میں لوگ بڑے دل لگا کر کھانا کھاتے ہیں، اگرچہ خوراک کچھ زیادہ تازہ نہیں ہوتی۔

ان تعلیمی اور مطالعاتی قسم کے مناظر دیکھنے کے بعد آرام کے لمحات پشاور کے الف لیلوی بازار اور مصنوعات دیکھتے ہوئے گذارے جا سکتے ہیں۔ کہیں معمولی قیمت کے سنہری جوتے آپ کی آنکھوں کے سامنے بنائے جا رہے ہیں۔ کہیں پیدائشی فنکاروں کی مصنوعات چمک رہی ہیں — آپ کے سامنے ہی زیورات بنائے جا رہے ہیں۔ آپ کے دیکھتے ہی دیکھتے چمڑے کو کوٹا اور پھر بکسوں کی شکل میں ڈھالا جاتا ہے۔ پٹھانوں کی دلکش ٹوپیاں اور پگڑیاں چمکدار ریشمی دھاگوں سے اور موتی جڑ کر بنائی جاتی ہیں۔ یہ ایک تارِ عنکبوت کی طرح نازک ہوتی ہیں — سامانِ کمہارگری اور لکڑی کی چیزوں پر پتھروں کی مدد سے رنگ کیا جاتا ہے۔ ذہین درزی ایرانی بھیڑوں اور بکریوں کی کھالوں پر بھی مشین چلا لیتے ہیں۔ پشاور کے تانبے اور کانسی کے برتنوں پر جو چمک ہوتی ہے وہ اس شمال مغربی سرحدی علاقے کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ چمکدار دھات کی بنی ہوئی بڑی گول ٹرے، کافی کا دلکش میز، کافی سیٹ، شمعدان اور مختلف شکل کی پلیٹیں تنگدست سیّاح کو مجبور کر دیتی ہیں کہ سب کچھ خریدنے کے باوجود وہ کچھ اور خریدنے کے لیے بے تاب ہو جاتا ہے۔ اس نفیس دستکاری کا راز موروثی اور روایتی ہے اور مدتوں سے یہ باپ سے بیٹے کی طرف سینہ بہ سینہ منتقل ہو رہا ہے۔ یہ فن ان کی زندگی کا اتنا ہی اہم حصہ ہے جتنا کہ وہ مذہب، جس پر وہ ایمان لے آئے ہیں۔

الف لیلوی ماحول والا قصہ خوانی بازار دل موہ لیتا ہے۔ برسوں سے یہ داستان سنانے والوں کے بازار کی حیثیت سے مشہور ہے اور اب بھی یہاں کی فضا قسمت بتانے والوں، خوانچہ فروشوں اور رقص کرتے لڑکوں سے معمور ہے۔ پشاور کی زرخیز باغوں کے



پشاور کا ایک برتن ساز

پکے ہوئے لذیذ پھلوں سے سجی دُکانوں کو دیکھ کر مُنہ میں پانی بھر آتا ہے — پھلوں کو بڑی دلکش ترتیب سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ تازہ پھلوں کا رس چار آنے فی گلاس بکتا ہے۔

سر راہ کیفوں سے لپکتی اشتہا انگیز خوشبو ایک شخص کو سیخ کباب کھانے پر مجبور کر دیتی ہے اچھی طرح سینکے ہوئے گرم گرم نانوں پر رکھ کر انہیں کھائیں تو بڑا لطف آتا ہے۔

خرید و فروخت کا بھی بڑا مزہ آتا ہے۔ میں ایک سینڈل ساز سے باتوں میں مصروف تھی کہ ایک کسان قریب آ کر رکا۔ "میم صاحب" کہنے لگا "کیا آپ ایک موٹا تازہ چوزہ نہیں

خریدیں گی۔ پیشتر اس کے کہ میں جواب دیتی اس نے اپنے تھیلے سے ٹانگیں ہلاتی، پرپھڑاتی مرغی نکالی — اور بڑے فخر سے اسے میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے شکریے کے ساتھ اس کی پیش کش قبول کرنے سے انکار کیا — کہ اگر ڈنر پر میں ایک اپنا مُرغ لے کر پہنچی تو ڈنیر والے کیا کہیں گے —؟" ان لوگوں کی سادگی بھی ان کی دلکشی کا اہم حصّہ ہے —— اچھے دام ملنے کی توقّع ہو تو وہ کسی بھی جگہ خریدار کو ڈھونڈ نکالیں گے —— وہ چاہتے ہیں کہ آپ اپنے قیام سے پوری طرح لطف اندوز ہوں۔ وہ آپ کو ہر چیز دکھائیں گے۔ ان میں مرغیوں کے چوزے بھی شامل ہیں۔

پشاور کے گرد و نواح میں ایک اور قابلِ دید مقام نوشہرہ ہے —— جو ایک خوبصورت اور وسیع شاہراہ سے صرف چند میل کے فاصلے پر پڑتا ہے۔ یہ دریائے کابل کے کنارے پر پھیلا ہوا ہے۔ نوشہرہ ایک چھوٹا سا دیہاتی قصبہ ہے جہاں فیروز سنز کی فارسٹیکل لیبارٹریز واقع ہیں —— وہی کتابیں چھاپنے والے فیروز سنز —— یہاں پانچسو کے قریب کارکن ہیں۔ سب ہنسی خوشی کام کرتے ہیں۔ انہیں روزمرہ کی ضروریات کے ساتھ ساتھ طبی سہولتیں بھی میسّر ہیں۔ نوشہرہ چھاؤنی دریائے کابل کے دائیں کنارے پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ اہم فوجی مقام سب ڈویژن کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ جی۔ ٹی۔ روڈ اسی میں سے گزرتی ہے۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے کشتیوں کا پُل بھی ہے —— اور ایک ریلوے لائن اور سڑک کا مشترکہ پُل بھی ہے۔ ایک دلکش ڈاک بنگلہ بھی —— رنگا رنگ پھولوں کے باغیچوں کے درمیان مسکراتا ہے۔ اس کے کنارے پر ایک خوش نظر آفیسرز کلب آنے والوں کے لیے آغوش کشادہ رہتا ہے۔

نوشہرہ سے چار میل دور رسالپور کئی ایک وجوہ کے باعث نہایت مقبول جگہ ہے۔ اس کی آب و ہوا نہایت صحت بخش خیال کی جاتی ہے۔ یہ پاک فضائیہ کا اہم سٹیشن ہے۔ یہاں ایک

تربیتی سکول بھی ہے۔ یہ خوبصورت مقام دریائے کابل کے بائیں کنارے آباد ہے ــــ ایک اور خوبصورت بستی ہے جہاں پشاور سے زیادہ خنکی ہے اور سطح سمندر سے خاصی بلند ہے۔

ضلع پشاور پشتو کے مشہور محبِ وطن اور کلاسیکی شاعر خوشحال خاں خٹک کی جائے پیدائش بھی ہے۔ خوشحال خاں کے والد خٹک قبیلے کے سربراہ بھی تھے۔ وہ نوشہرہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر واقع اکورہ خٹک میں پیدا ہوئے والد کا انتقال ہؤا تو خوشحال کمسنی میں ہی اپنے قبیلے کے سربراہ بن گئے اور مغل فوج کی طرف سے انہوں نے کئی فتوحات حاصل کیں۔ اورنگ زیب کے زمانے میں وہ کسی وجہ سے بادشاہ کی نظروں سے گر گئے اور انہیں ایک مغل عدالت نے پشاور میں قید کی سزا دی اور بعد میں دہلی اور جے پور میں قید خانے میں رہے۔ ۵۰ برس کی عمر میں انہیں رہا کیا گیا۔ انہوں نے قید میں ہی شاعری کی۔ اگرچہ اس میں انتقام کے جذبات کا زیادہ اظہار ہے۔ لیکن ان کا کلام پھر بھی پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مدح کے باعث نہایت مقبول ہے۔ انہوں نے صوفیانہ اور عشقیہ شاعری بھی کی۔ اپنی ذات کا وقار اور جراُت جس کی امتیازی خصوصیات ہیں۔ انہوں نے آفریدیوں میں وفات پائی، جن کے پاس انہوں نے پناہ ... لی تھی۔ ان کی آخری خواہش یہ تھی کہ انہیں کسی ایسی جگہ دفن نہ کیا جائے جہاں مغل حملہ آوروں کے قدم پہنچ سکیں۔ خوشحال خاں کی سادگی پشاور کے لوگوں کی سادہ طبیعتوں سے ہی مشابہ تھی۔

پشاور کی قریبی شاہراہوں کو اب بڑا خوبصورت بنا دیا گیا ہے۔ معزز مہمانوں کے لیے جمرود کے مقام پر ایک بڑا تقریباتی پلیٹ فارم تعمیر کیا گیا ہے۔ یہ پشاور روڈ پر خیبر کی طرف جاتے ہوئے آتا ہے۔ یہاں ممتاز مہمانوں کو قربانی کے بکرے اور دوسرے تحائف پیش کرنے کی رسم اب زیادہ وقار سے انجام پائے گی۔ ٹھیکریوں کا پس منظر ڈرامائی ماحول ہے۔ اس کے عین سامنے سکھ دور کا پرانا کچا قلعہ ہے اور نیچے پشاور کی اپنی تاریخ ساز شاہراہ پر

پشاور کا ہمیشہ ہمیشہ نیلگوں رہنے والا آسمان سایہ کیے ہوئے ہے۔ یہ پُرشکوہ محراب اور دروازہ تاریخی خیبر کے روایتی ماحول میں اور اضافہ کرتا ہے۔ یہاں ستونوں کی تعمیر قبائلی علاقوں کی چوکیوں کی طرز پر کی گئی ہے۔ اس میں مالاگوری پہاڑیوں سے نکالا ہوا سنگِ مرمر استعمال کیا گیا ہے۔ پشاور میں ان دنوں اے۔جی، مدنی کمشنر تھے، انہوں نے ساری تعمیر اپنی نگرانی میں کروائی تھی۔ اس جگہ کو خوبصورت اور دل کش بنانے کے لیے انہوں نے اپنی دلی توجہ دی تھی۔

شاہراہ کے نیچے پشاور کے مغل عہد کے باغات موجود ہیں۔ شاہ باغ اور وزیر باغ ایشیا کے اس دروازے کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔ لمبے لمبے پیڑ اور پھول بڑی تعداد میں اُگتے ہیں اور پتھر کے کٹے ہوئے ٹھنڈے بنچ ذہنی سکون کا سرچشمہ ہیں۔ پشاور میں زندگی کی ہر جگہ ایک انفرادیت ہے، ایک ادا ہے۔ یہاں ماضی کی جھلملاتی جھلکیاں بھی ہیں اور اس کے حال کے ہر لمحے میں مسرت کی قیمتی ساعتوں کا اضافہ کرتی جدتیں بھی ——

سحر انگیز خیبر

خیبر پاس : اس نام میں جادو ہے جو برسوں پرانے بہادر لوگوں اور معرکہ خیز دنوں کی یاد دلاتا ہے۔ خیبر پاس : عظیم الشان خیبر۔۔۔ جس کے گیت گائے جاتے ہیں۔ جس کے بارے میں بہت کچھ لکھا جاتا ہے۔ وہ مقام جسے اس سرزمین پر آنے والے تمام سیاح دیکھنا چاہتے ہیں۔ اس کی خوبصورتی اور حیرت انگیز ماضی کے بارے میں کم لوگوں کو واقفیت ہے۔ بہت کم لوگ اس کے باشندوں، پٹھان قوم کے بارے میں جانتے ہیں۔۔۔ غیر مفتوح لوگ جو آج بھی پوشیدہ جھونپڑیوں اور غاروں میں رہتے ہیں، اپنے اسلاف کی قائم کی ہوئی روایات پر چلتے ہیں اور بدنامی کے ساتھ زندہ رہنے کی نسبت اپنی عزت کی خاطر جان دے دیتے ہیں۔

پٹھان کس چیز سے بنے ہیں؟ ان کا پس منظر کیا ہے؟ اپنے شاندار ماضی کے علاوہ حال ہی میں انھوں نے کیا کردار ادا کیا ہے؟ بیسویں صدی کی تہذیب میں انھوں نے خود کو کس طرح ڈھالا ہے؟ نیا وارسک ڈیم بننے کے وقت سے انھوں نے نہایت شاندار کردار ادا کیا ہے۔ نہ بڑے بڑے دعوے ہوئے اور نہ بینڈ باجوں ہی کی آوازیں آئیں، لیکن یہ سب کچھ ایک حقیقت

ہے جو صرف چند سال پہلے رونما ہوئی ہے۔

گڑگڑاتی آوازیں۔ گرتی ہوئی چٹانیں، شروع میں دھیمے اور پھر شور کے ساتھ اوپر سے گرتی ہوئی مٹی یک لخت یہ سب ایک پرزور شور میں تبدیل ہو گئے اور انجنیئر شاہ نواز خاں اور ان کے تپلے دبلے ساتھی غلام کے ارد گرد مٹی کے تودے گرنے لگے چند لمحے پہلے وہ پشاور سے باہر وارسک ڈیم پر ایک خندق کے کشادہ سرے پر کھڑے تھے۔ جہاں سنہری دھوپ ہوا کی نمی کو کاٹ رہی تھی اب وہ یکلخت مٹی اور ملبے کے انبار میں پھنس گئے تھے اور دن کی روشنی غائب اور سورج آنکھوں سے اوجھل ہو گیا تھا گویا چاروں طرف سیاہ لبادہ پھیلا دیا گیا ہو۔ پھر سانس گھونٹنے والے بخارات اور بے حد دھول اڑی اور پھر خاموشی چھا گئی۔ پتھر گرنا بند ہو گئے۔ شاہ نواز نے چہرہ سے پسینہ پونچھا اور دم بخود غلام کو ملبہ سے کھینچتے ہوئے چیخا "چھپ جاؤ" "ادھر آؤ" اس نے کہا "تحمل سے کام لو۔ روشنی کی ایک کرن آ رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہم پوری طرح نہیں گھرے؟" مٹی اور پتھروں کے ڈھیر میں راستہ تلاش کرتے ہوئے انھوں نے روشنی کی راہ کو ڈھونڈ نکالا۔ ڈھکے ہوئے راستہ میں ایک سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے ایک آدمی بمشکل رینگ کر باہر نکل سکتا تھا۔

"غلام باہر نکل جاؤ اور پھر واپس آؤ۔ دیکھتے ہیں یہ راستہ کتنا محفوظ ہے سرنگ کے دوسرے سرے پر سو آدمی کام کر رہے ہیں۔ ہمیں انھیں اس سوراخ کے ذریعے فوراً باہر نکالنا چاہیئے۔" غلام رینگ کر باہر نکل گیا اور پھر واپس آیا۔ "صاحب — صاحب — یہ جگہ بہت مخدوش ہے بہر حال ہم کچھ نہ کچھ

انتظام کرلیں گے؟ پھر شاہنواز نے اپنے فورمین کو فون کیا اور کہا، "لوگوں کو فوراً سرنگ کے اس سرے پر لے آؤ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔ ہر ایک سے۔"

لوگ بغیر کسی اضطراب کے آگئے اور بچانے والوں کے آنے سے پہلے شاہ نواز نے تمام مزدوروں کو صحیح سلامت باہر نکال لیا اور تمام دن کسی نے آرام نہیں کیا۔ اس کے بجائے انھوں نے اگلے اٹھارہ گھنٹے سرنگ کو صاف کرنے میں صرف کیے اور سو آدمیوں کی اگلی شفٹ کام پر اس طرح آئی گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

یہ لوگ ان سات ہزار پٹھان مزدوروں میں سے تھے جنھوں نے منگلا ڈیم تعمیر کیا۔ پٹھان خون کے گرم اور نڈر ہوتے ہیں۔ یہی وہ اصل جنر ہے جس سے پٹھان بنے ہیں۔ خواہ وہ آفریدی، آشندی، تلاگوری، مہمند یا ملک قبائل سے تعلق رکھتے ہوں۔ ہزاروں پٹھان پاکستان کے طول و عرض میں پھیلے ہوئے ہیں لیکن ان کا خاص علاقہ شمال مغربی سرحدی صوبہ ہے جو خیبر پاس، پشاور، کوہاٹ پاس اور سوات کا علاقہ ہے۔ سب کے طور طریق اور رسم و رواج ایک ہیں۔ سب پشتو بولتے ہیں اور اپنے ساتھ بندوقیں رکھتے ہیں۔

پٹھانوں کی پیدائش، شادی، موت، محبت، جنگ اور نفرت کی بے شمار رسمیں ہیں گو یہ موجودہ دور کی اقدار سے لگا نہیں کھاتیں لیکن یہ طریق پرورش بہادر جنگجو پیدا کرتا ہے، ماں بچہ کو سخت ضابطۂ حیات پر عمل کرنا سکھاتی ہے اور اسے کھلونوں کی جگہ بندوق دیتی ہے وہ تمام آسائشیں جو عام سمجھی جاتی ہیں اس کے لیے ممنوع ہیں اور اسے سادہ کپڑے پہناتے جاتے ہیں تاکہ وہ

مغرور نہ ہو جائے۔ بُری ارواح کو دور رکھنے کے لیے بچوں کے کپڑوں کے ساتھ تعویز سی دیئے جاتے ہیں اور اکثر ایک خاص تعویز عقل بڑھانے کے لیے ماتھے پر باندھا جاتا ہے۔ اس کا باپ اسے سکھاتا ہے کہ عزت و ناموس کی خاطر جان دینا بدنامی کے ساتھ زندہ رہنے سے بہتر ہے جب وہ جوان ہوتا ہے تو موت کا خوف اس کے دل سے نکل چکا ہوتا ہے۔

پٹھان سکندر اعظم کی براہ راست پشت سے ہیں جو خیبر پاس اور یہاں کے پہاڑوں سے گزرا تھا۔ نسلی اعتبار سے بھی اور شکل و شباہت اور کردار کے لحاظ سے بھی یہ یونانی ہیں۔ اکثر دیہاتوں کے نام بھی یونانی ہیں اور وہاں یونانی رسمیں مروج ہیں۔ ان کے بیشتر جھگڑے عورتوں پر ہوتے ہیں۔ لیکن اندرونی طور پر وہ شاعر اور گوئیے ہوتے ہیں۔ خوش اخلاق اور رحمدل، گو وہ یہ ہرگز نہیں چاہتے کہ یہ بات آپ پر آشکارا ہو۔ پٹھانوں میں ان قوموں کا بھی خون ہے جو ایران منگولیا اور سلطنت عثمانیہ سے ہندوستان آئیں۔ یہ لوگ طاقت ور جنگجو ہوتے ہیں اور لڑنا پسند کرتے ہیں۔ اسلامی عقائد کا ان کی زندگی پر گہرا اثر ہے۔ پٹھان توجہ اپنی جانب کھینچ لیتے ہیں۔ ایک لمبا تڑنگا نوجوان جو خود سر، گرم جوش، غریب لیکن مغرور ہے۔ پٹھان اپنے چھوٹے سے گاؤں، بنجر خیبر یا پشاور کے گرد و نواح میں کھیتی باڑی کر کے اپنی روزی کماتے ہیں۔ کچھ کاریگر ہیں جو مٹی اور تانبے کے برتن بناتے ہیں اور مسجدوں میں پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں۔

پہاڑی راستوں اور سرنگوں کی اوٹ میں چھپے خیبر کے دیہاتوں میں جو سڑک سے نظر نہیں آتے، پٹھان پرانے انداز میں رہتے ہیں۔ کھلے چولہوں میں آگ



درّہ خیبر کا محافظ

جلتی رہتی ہے اور کیتلی میں چائے ابلتی رہتی ہے۔ توانا قبائلی درمیان میں حقّہ رکھ کر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں اور ان کے پاس سے چھوٹے بچے بکریوں کے ریوڑ لیے گزرتے رہتے ہیں۔ بچوں کو گود میں اٹھائے برقعوں میں چھپی عورتیں گاؤں کے بازار میں خرید و فروخت کرتی ہیں اور آہستہ آہستہ چلتی ہیں تاکہ مردوں کے کام میں خلل انداز نہ ہوں۔ پٹھانوں کے جاننے میں بڑا وقت لگتا ہے۔ لیکن ایک بار آپ کو دوست تسلیم کر لیا جائے تو وہ خیر مقدم کے لیے اپنا ہاتھ بڑھا دیتے ہیں۔

باتیں کرتے وقت پٹھان آپ کو اپنے کام، اپنی جدوجہد، گھوڑے، نئی بندوق اور بوڑھی بیوی کے بارے میں باتیں بتائے گا۔ گاؤں کی کہانیوں میں اس کے دل کی دھڑکن جھلکتی ہے۔ "میری سادہ کٹیا کی طرف نہیں میرے خیر مقدم کی گرم جوشی دیکھئے"۔ وہ کہتا ہے۔ وہ قصّے بیان کرنے لگے گا اور خون آشام جھگڑوں اور اپنے دشمنوں کے بیٹوں کی کبھی نہ ختم ہونے والی تلاش کا ذکر کرے گا جنہیں اس نے کبھی نہیں دیکھا۔ دشمنوں سے انتقام لینے کے لیے وہ خوشبو میں معطّر ہو کر اپنا بہترین لباس پہن کر جائے گا۔ شاید شکست کھانے اور اپنے خالق سے ملنے کے لیے..... کیونکہ اس کا عقیدہ ہے کہ اپنے ناموس کی خاطر لڑنے والا جنت میں جاتا ہے۔

شمال کے قبائلی علاقوں میں انتقام کے جذبے کو پسند نہیں کیا جاتا۔ لیکن جب ان کا انتظامی افسر اپنے ماہانہ دورے پر معائنے اور واقعات کی تفتیش کے لیے آتا ہے تو گاؤں کا سربراہ مسکرا کر اس کا استقبال کرتا ہے۔

پٹھان اپنے خاندان میں ہی شادی کرتے ہیں۔ قبیلوں میں اکثر جوان لڑکیوں کی کمی ہوتی ہے۔ اس صورت میں لڑکی کی تلاش باہر کے قبائل میں کی جاتی ہے۔

تمام معاملات والدین ہی طے کرتے ہیں۔

پٹھان عورتوں کی حفاظت ایک عظیم خزانے کی طرح ہوتی ہے۔ ماں بننے والی عورتیں خاندان کے مردوں کے علاوہ کسی کو نہیں دیکھتیں اور کسی غیر کا عورت کو مسکرا کر دیکھنا گویا موت کو دعوت دینا ہے۔ اس معاملہ میں مصالحتی کونسل کوئی مدد نہیں کرے گی۔ ایک بھائی کو ایسی آشنائی کا ذرا بھی شبہ ہو جائے تو وہ اپنی بہن یا عزیز ترین دوست کو گولی مار دے گا۔ اس کے غصّے کے سامنے کوئی پیش نہیں جاتی۔ وہ

اپنی بیوی کو مجبوراً مار دے گا اور والدین حقارت سے مسکرائیں گے۔

پیٹھان فخر کے ساتھ بخوشی پھانسی چڑھ جاتے گا اور خاندان کے لوگ اس کی تعریف کریں گے اور "ہیرو" کے نعرے لگائیں گے جب کہ منصف نے اسے قاتل قرار دیا ہے۔ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کون راستی پر ہے۔

پیٹھانوں پر آج تک کسی نے فتح حاصل نہیں کی۔گو برطانیہ نے ان پر دو سو سال حکومت کی۔ ماضی میں دوسری قومیں انہیں مغلوب کرنے کی کوشش کرتی رہیں لیکن ناکام رہیں۔ درحقیقت انگریزوں نے دوسرے قبیلوں میں امن رکھنے کے لیے انھیں ملازم رکھ لیا۔ حال ہی میں صرف ایک بار پٹھانوں نے اپنی زمین پر بندوقوں کو خیرباد کہا ہے۔کینیڈا اور کولمبو پلان کے تحت وارسک منصوبہ کی تعمیر کے وقت جب آٹھ ہزار مزدوروں کی ضرورت تھی، پیٹھان محنت کے بدلے رقم اور گاڑیوں کی پیشکش کا تمسخر اڑاتے تھے۔ وہ اس وقت بھی خچروں، اونٹوں، گھوڑوں اور اپنے پیروں پر بھروسہ رکھتے تھے۔

یہ پیٹھان انجینئر شاہ نواز خاں کی دانشمندی کا کمال ہے کہ وہ لوگ راضی ہو گئے۔ شروع میں صرف چند لوگ آگے آئے لیکن جب وہ کھنکتی ہوئی جیبوں کے ساتھ گھر لوٹے اور وارسک کی کمائی سے خریدی ہوئی سائیکلوں پر جانے لگے تو سات ہزار لوگ — اپنی بندوقیں لیے — مزدوروں میں شامل ہو گئے۔ شاہ نواز نے انھیں بتایا کہ کینیڈا کے لوگ اپنے ساتھ بندوقیں نہیں رکھتے۔ انھیں بھی کیا ضرورت ہے؟ اور جلد ہی سات ہزار مزدوروں میں سے ایک کے پاس بھی بندوق نظر نہ آتی تھی۔ بعد میں جب ایک پیٹھان نے وارسک کی رسمِ افتتاح کی تو سب فخر سے سینہ

تانے کھڑے تھے۔

جس پٹھان نے یہ افتتاح کیا وہ پاکستان کے صدر، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں تھے۔

جس طرح ان پٹھانوں نے وارسک کی بنجر زمین کو بار آور منصوبہ میں تبدیل کر دیا اسی طرح خیبر پاس نے انسانیت کے مقدر کو بدل ڈالا ہے۔ بادشاہ، شہزادے فاتحین اور ان کے سپاہی اس کے نام ہی سے مسحور ہو جایا کرتے تھے اس کی سرحدوں کے اندر نئی زمینیں ڈھونڈنا اتنا ہی زبردست چیلنج تھا۔ جتنا ایٹمی قوت والے سیاروں کی مریخ، زہرہ اور چاند پر پہنچنے کی کوشش۔

پچیس سو سال سے زاید سے خیبر پاس تاریخ کے اہم واقعات کے خاموش شاہد کی حیثیت سے کھڑا ہے۔ خیبر ان پہاڑوں کے سلسلہ کی کلید کی حیثیت رکھتا ہے جن کے دامن میں گاؤں اور کھیت چھپے ہوئے ہیں اور اندرونی حصّے میں لہلہاتی کھیتیاں اور سونے سے بھرے مندر ہیں۔

آپ کے ان راستوں پر، جن پر صدیوں پہلے مشہور لوگ چلے تھے، کار چلانے کا جذبہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بابر، اس کا لڑکا ہمایوں، سکندر اعظم اور بہت سے دوسرے لوگ خچروں، گھوڑوں، اونٹوں اور بیلوں کے قافلوں سے نجات پانے کے لیے ان راستوں پر چلے ہوں گے۔ نئے ملکوں کو فتح کرنے کے بارے میں سوچتے ہوئے انھوں نے سڑک کے کنارے پڑے بڑے بڑے پتھروں کے سہارے آرام کیا ہوگا۔ اترائی کے دوران انھوں نے ناقابلِ برداشت دن گذارے ہوں گے۔ لیکن آج کل پینتیس ۳۵ میل کا یہ ٹکڑا ہم چند گھنٹوں میں طے کر لیتے ہیں۔

پشاور سے پہلے دس میل تک اونچی ہوئی سڑک پر دوستوں کے ساتھ جیپ میں



دو ملکوں کی سرحدوں کے پاسبان

سفر کرتے ہوئے میں انہیں احساسات سے مغلوب تھی جو میں نے مشہور پرتگالی ملاح واسکوڈے گاما کے مقبرہ اور پھر امریکی صدر ابراہیم لنکن کے مجسمے کے سامنے کھڑے ہو کر محسوس کیے تھے ان لوگوں نے تاریخ پر اپنے نقوش چھوڑے تھے اور اب نئے مناظر کو ابھرتے اور مدھم پڑتے دیکھ کر تاریخ لکھی جا رہی تھی۔ گھاس کے جوتے اور ڈھیلا ڈھالا لباس پہنے اور پگڑی باندھے ایک لمبا تڑنگا پٹھان چلتے ہوئے ماضی کی جھلک معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں مردانگی سے پُر اور فخر سے مسکرا رہی تھیں جن کے

پیچھے اس کی محرومیاں، خواہشات اور جھگڑے فساد چھپے تھے۔ ہم نے چلتے ہوئے اس کی طرف ہاتھ ہلایا اور اسے سلام سے جواب دیا۔ جیسے جیسے ہم پینتیس ہزار فٹ بلند پاس' کی طرف چڑھتے گئے' وادی غائب ہوتی گئی اور اونچی اونچی چوٹیوں کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ میں نے ان بیشمار قافلوں کے بارے میں سوچا جنہوں نے یہ راستہ طے کیا ہوگا۔ تاجر، فوجیں، بیرونی حملہ آور اور بادشاہ جو مزید دولت اور طاقت کی تلاش میں نکلے تھے۔ افغانستان کی طرف جانے والی یہ چوٹیاں تشدد اور کشت وخون کی کتنی کہانیاں سنا سکتی ہیں۔ لیکن بلند پہاڑ خاموش تھے گویا اس راز کو چھپا رہے ہوں جو صرف اس دور کے فاتحین کو معلوم تھا۔

اس وقت سنگلاخ پلیٹو پر کیا منظر ہوگا۔ جب ۳۲۶ قبل مسیح میں سکندر اپنی فوجوں کے ساتھ خیبر کے راستے دریائے کابل آیا تھا...... اور بعد میں سیتھیا کے باشندے جنہیں مقامی قبائیلیوں، ہندی یونانیوں اور سقّوں نے مغلوب کر لیا تھا۔ "اس وقت کیا لگتا ہوگا"؟ میں سوچ رہی تھی، جب قریبًا دوسو سال بعد ڈیرئیس نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ اور وادیوں میں چھڑکاؤ کیا تھا اور صدیوں گذرنے کے بعد مسلمان حکمرانوں نے اپنے سپاہیوں کے ساتھ کامیاب حملے کیے اور پشاور میں جے پال کی فوجوں کو شکست دی۔ پھر بابر، جس کی رگوں میں چنگیز خاں کا خون گردش کر رہا تھا، ان پہاڑوں پر آیا اور برصغیر میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت کیسے نغمے گائے گئے ہوں گے جب خیبر بابر کے لڑکے کی رزمیہ موسیقی سے گونج رہا تھا۔ وہ اپنے ساتھ ایران کے مشہور آرٹسٹ میر سید علی اور عبدالصمد کو لایا تھا جنہوں نے تصویر کشی کے پہلے مغلیہ سکول کی بنیاد ڈالی اور جن کی اولاد نے

ثقافتی احیاء میں مغلیہ فن مصوری کو ایک روایت کی حیثیت دے دی۔

دن سخت گرم تھا اور سورج تیزی سے چمک رہا تھا لیکن خیبر کی ٹھنڈی ہوا فضا میں خنکی پیدا کر رہی تھی کبھی نہ بھولنے والا ماضی ہوا کی لہر کے ساتھ اٹھتا تھا۔۔۔ پھر یکلخت گم ہو جاتا تھا۔ جیپ سے اتر کر اپنے گائیڈ کے ہمراہ ہم پیدل راستے کے ذریعے خیبر پاس کے ایک گاؤں میں پہنچے جو سڑک سے یوں ہٹا ہوا تھا گویا اس کا وجود ہی نہ ہو۔ پرانے زمانے کے دور میں گھڑسوار بھی بغیر معلومات کے یہاں نہیں پہنچ سکتے تھے۔ غاروں میں رہنے والوں کی طرح یہ لوگ بھی مٹی کے مکانوں میں رہتے ہیں۔ چھپے ہوئے میدانوں اور ڈھلوان سڑکوں پر پہاڑیوں کے اندر ہر گاؤں ایک سا ہے جہاں مسجد محافظ کی طرح کھڑی ہے اس سارے منظر میں مسجد ہی ایک خوبصورت عمارت ہے جس کے مینار روشنی میں دور دراز دنیا کے گرجاؤں کے کلسوں کی طرح چمکتے ہیں۔

گول مٹول چہروں والے بچے کھیلتے ہمارے پاس سے گذرے وہ بے حد شرمیلے تھے اور جب ہمارے گائیڈ نے ان سے بات کی تو وہ ہنس پڑے اور والدین کی طرف مڑ گئے تاکہ تصویریں اتروانے کے لیے ان سے اجازت لے سکیں۔ ظاہر ہے کہ والدین بھی چاہتے تھے کہ ان کی تصویریں اتاری جائیں مجھے اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہیئے تھا۔ کہ میں ایک چھوٹے سے بچے کی اس کی بہنوں کے ساتھ تصویر اتار سکوں۔ اس میں ہر شخص شریک ہو گیا کیونکہ سیاحوں سے تصویریں اتروانے کا خیال بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ان کے دور دراز گاؤں میں بہت کم سیّاح آتے تھے اور یہ واقعہ ان کے لیے تاریخی حیثیت کا حامل تھا۔ ان کے شوق سے متاثر ہو کر میرے دوستوں اور میں

نے سب کی تصویریں اتاریں ــــ اور میں نے مخصوص کپڑوں میں بچوں کی (جو مجھے بے حد پسند آئے تھے) الگ سے تصویر اتار ہی لی۔ ہم نے انھیں مٹھائیاں دیں جس کی وجہ سے ہم سیاحوں کے بجائے دوست بن گئے۔ تھوڑی ہی دیر میں ہمیں دیکھنے اور دعائیں دینے کے لئے تمام لوگ اکٹھا ہو گئے۔ ہم خود کو خوش قسمت سمجھتے تھے۔ کہ انہوں نے ہمیں قبول کر لیا تھا۔ ورنہ وہ بے اعتنائی بھی برت سکتے ہیں۔

ہم مجبوراً فیاض پٹھانوں سے جدا ہوئے۔ کیونکہ ابھی خیبر پاس کا بہت سا حصہ دیکھنے کو باقی تھا۔ جو افغانستان کی سرحد تک جاتا ہے۔ جب ہم چوٹی کے نزدیک پہنچے تو لورا گا نظر آنے لگا۔ خشک پہاڑ پر لورا گا پر فضا اور خوبصورت مقام ہے جہاں ہرے بھرے کھیتوں میں جھلمل جھلمل کرتے ندی نالے بہتے ہیں۔ ہم نے سڑک کے کنارے گھاس پر بیٹھ کر کھانا کھایا جہاں سے ہم جدید دور کے قافلوں کو دیکھتے رہے۔ جو اجناس، جوتے اور دوسری تمام اشیاء لے کر کابل جا رہے تھے۔ گو آج کل فاتحین خیبر پاس سے نہیں گذرتے، لیکن سرحد پر دونوں طرف سے آنے جانے والے تاجروں کی وجہ سے رونق رہتی ہے پاس کے سرے پر لنڈی کوتل کا قلعہ اس علامت کا مظہر ہے کہ پاکستان اپنے عوام کی قوت اور آزادی کے لیے ایک فصیل کی حیثیت رکھتا ہے۔ قلعے پر لگا ہوا جھنڈا فخر سے فضا میں اڑتا ہے۔ پاس کے دہانے پر خیبر رائفلز قلعۂ جمرود ہے۔ یہ دونوں قلعے دنیا کے مشہور ترین پاس کی حفاظت کے پر امن مقصد پر کمربستہ ہیں۔۔۔۔۔ عظیم خیبر ۔۔۔۔۔ ان تمام لوگوں کا راستہ جو دوستی کا ہاتھ بڑھائے آتے ہیں۔

سوات

جہاں تاجدار اور آپ بھی جا سکتے ہیں

ریاست سوات سیاحوں کو دوبارہ آنے پر اکساتی ہے۔ گذشتہ قیام کی خوش کن یادیں ہمیشہ ذہن میں تازہ رہتی ہیں۔ بڑے عرصہ بعد میں سوات دوبارہ گئی "خوابیدہ اور پرسکون ریاست میں اب زندگی کی نئی لہر دوڑ رہی تھی۔ اس کی وجہ سیاسی ہو سکتی ہے۔" میں نے سوچا...... پرانا نظام بدل گیا ہے۔ پھر میں نے محسوس کیا کہ یہاں انسانی دلچسپی کا عنصر بھی ہے جو دنیا کی تاریخ میں لکھا جا رہا ہے

یہ بات بالکل پریوں کی کہانی کی طرح معلوم ہوتی ہے لیکن یہ ایک سچی کہانی ہے ایک رات ایک حسین و نوجوان شہزادی درخت پر ایک گھونسلے کی طرح بنی چھوٹی سی کٹیا میں داخل ہوئی اور صبح ملکہ بن کر نکلی...... یہ برطانیہ کی موجودہ ملکہ الزبتھ تھی جس کی زندگی افریقہ کے جنگلوں میں سفر کرتے ہوئے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ چند سال پہلے اسی طرح سوات کے شہزادہ کی جوان بیوی رات کو ایک عظیم جنرل کی سیدھی سادی لڑکی کی حیثیت سے آرام کے لیے لیٹی۔ اگلی صبح جب وہ اٹھی تو وہ ملک کے نئے صدر کی مشہور لڑکی بن چکی تھی۔ میلوں دور کراچی میں، اس کے باپ نے جو اس وقت جنرل محمد ایوب خاں تھے، عنانِ حکومت سنبھال لی تھی اور پو پھٹنے سے پہلے

منتشر قوم کے لیے نشانِ راہ بن گئے تھے۔

اسی لحاظ سے شروع سے سوات کی تاریخ بار بار بدلی ہے۔ ابتدائی بُدھ دَور سے، جب سوات 'باغ' کے نام سے مشہور تھا، ہر حکومت نے اس کے خزانوں میں اضافہ ہی کیا ہے اور مغربی پاکستان کے مقبول تفریحی مقامات میں شمال مغربی پاکستان کے خوبصورت علاقوں میں، سوئٹزرلینڈ کے الپس پہاڑوں کے پس منظر کے ساتھ سوات آثارِ قدیمہ کے لحاظ سے سب سے زیادہ مالا مال ہے۔ اب سیاحوں کو پشاور سے نجی گاڑی کرایہ پر نہیں لینی پڑتی نہ دوستوں کی خوشامد کرنی پڑتی ہے کہ وہاں لے جائیں۔ پلک جھپکنے کی دیر ہے اور جادوئی چراغ کے جن کی طرح ایک نئی سٹیشن ویگن سو میل لمبے پہاڑی راستے پر دوڑنے لگتی ہے اور چھ بالکل اجنبی مسافر راستے میں دوست بن جاتے ہیں۔ مستند ٹریول ایجنسی "صحرائی ٹریول سروس" جو پشاور میں اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے، کے زیرِ انتظام روزانہ پشاور اور سوات کے درمیان سٹیشن ویگن آتی جاتی ہے۔ یہ بہت عمدہ ہے اور کرایہ نہایت کم۔ صرف پندرہ روپے میں گرد وغبار سے محفوظ آپ نہایت آرام کے ساتھ اپنی منزل مقصود کے دارالحکومت سیدو شریف جا سکتے ہیں۔ کراچی کی ٹریول ایجنسی ایر ایڈز (Air-Aids) کی گاڑیاں بھی یہاں چلتی ہیں۔ سارے مسافر سیاح نہیں ہوتے۔ سفر کے دوران میری ملاقات جہاں زیب کالج کے پرخلوص پرنسپل اور ان کے نائب سے ہوئی۔ ایک ٹیکسٹائل مِل کے ڈائریکٹر اور سوات ہوٹل کے پرجوش قائمقام مینیجر میجر گیٹلی بھی شریکِ سفر تھے۔ میں واحد سیاح تھی۔ سارا راستہ نہایت پرلطف گزرا۔


سوات کی دوشیزئی

اکیلی عورت ہونے کی وجہ سے ہر سیاح مختلف مقامات پر میری چائے کے پیسے ادا کرنا چاہتا تھا۔ اس میں سڑک کے کنارے بکتے ہوئے تازہ اُبلے ہوئے انڈے اور گرم گرم نان بھی شامل تھے۔

راستے میں سرخ گالوں والے سواتی بچے آپ کے ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں اور ایسے تکتے ہیں گویا آپ شاہی خاندان سے تعلق رکھتے ہوں۔ راستے میں ہم نے ہر شہر میں تعمیر ہوتے ہوئے نئے سکول بھی دیکھے۔

مجھے اپنا پچھلا سفر اب تک کتنا اچھی طرح یاد ہے ہم ایک پہاڑی کے دامن میں چھوٹی سی ندی کے کنارے ٹھہر گئے تھے کیونکہ میرا ساتھی کار کے سفر سے بیمار ہو گیا تھا۔ میں نے چلّو بھر کر دوست کے لیے پانی نکالا۔ ہمیں مشکل میں گرفتار دیکھ کر کچھ بچے نیچے اترے اور ہماری پیاس بجھانے کے لیے صاف شفاف پانی کی گھڑیا بھر کر لے آئے پھر بچوں کے ماں باپ آ گئے اور ہم سے اپنے سادہ گھروں میں آرام کرنے اور چائے پینے پر اصرار کرنے لگے۔ سوات کے یہ لوگ معمولی کسان تھے لیکن مہمان نوازی کا جذبہ تو دل میں پیدا ہوتا ہے۔ یہی مہمان نوازی آج بھی پائی جاتی ہے۔ سکولوں کے بچے گزرتی کاروں پہ پھولوں کی پتیاں پھینکتے ہیں اور آنے والوں کو دیکھ کر جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں۔ جب سیاح سڑک کے کنارے اُگے ہوئے خوبصورت پھولوں کو دیکھنے کے لیے رکتے ہیں تو بچے شرماتے ہوئے ان سے کہتے ہیں کہ وہ راستہ تو پوچھنا نہیں چاہتے۔

سیدو کو راستہ مالاکنڈ پاس کے ذریعے جاتا ہے۔ نیلے آسمان کو منعکس کرتی ہوئی خوبصورت سڑک ہے۔ راستے کے کنارے مکئی اور گیہوں کے ہرے بھرے

کھیت ہیں۔ چاروں طرف ندی نالے اور جھرنے پھیلے ہوئے ہیں اور درختوں سے ڈھکے ہوئے پہاڑوں کا عکس آبشاروں پر پڑتا ہے۔

سیدو شریف میں دو ہوٹل ہیں۔ مریان سیدھا سادا لیکن آرام دہ ہوٹل ہے اور ایک دِن کا کرایہ کھانے سمیت سولہ روپے ہے۔ سوات ہوٹل، جہاں سو آدمیوں کے ٹھہرنے کی جگہ ہے، بہت عمدہ ہے اور پرانی عظمت کے ساتھ جدید ترین آسائشیں مہیا ہیں۔ تمام چیزوں کو ملا کر یومیہ کرایہ بائیس روپے سے شروع ہوتا ہے۔ کھانے کے ساتھ سوات میں پیدا ہونے والے پھل دیئے جاتے ہیں۔ رس سے بھرے ہوئے انگور، ناشپاتیاں اور سیب بے حد لذیذ ہیں اور ان کا جام بنا کر فروخت کیا جاتا ہے۔ سوات کا شہد مشہور ہے اور ہر کھانے کی میز پر موجود ہوتا ہے۔ سیّاح ان کے مرتبان بھر کر ساتھ لے جاتے ہیں (شہد کی مکھیوں کے فارم دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں) ہوٹل کے دالان آرام دہ فرنیچر سے آراستہ ہیں اور سیاحوں کے بچوں کے کھیلنے کے لیے وسیع میدان ہیں۔ شام کی چائے درختوں کے نیچے دی جاتی ہے جس پر کسی میلے کا گماں ہوتا ہے۔ آپ اجنبیوں کے ساتھ گپیں اڑاتے ہیں جو آپ کے دوست بن جاتے ہیں۔ سوات رومان اور ماہِ عسل منانے والوں کے لیے بہترین جگہ ہے۔ سواری کے لیے گھوڑے اور سیر کے لیے عمدہ سڑکیں ہیں۔ اگر آپ سردیوں میں جائیں تو ہر کمرے میں چمنیوں میں چیڑ کی لکڑی جلتی ہے۔ دھوئیں کی خوشبو اور شام کے وقت آگ کے سامنے بیٹھ کر بالکل ذاتی گھر کا سا لطف آتا ہے۔ رات کا کھانا آپ کمرہ میں بھی کھا سکتے ہیں۔ یہاں مغربی اور پاکستانی

دونوں طرز کے بہترین کھانے ملتے ہیں۔ ہوٹل کی انتظامیہ ایک کلب بھی چلاتی ہے جہاں بیڈمنٹن، سکوئش، ٹینس اور گالف کھیلا جاتا ہے۔ لمبے چوڑے میدان ہیں جہاں آرام کرنے سے سکون ملتا ہے۔ آس پاس کے دریاؤں میں تیراکی اور مچھلی پکڑنے کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے۔ سوات ہوٹل کی کامیابی کا راز اس کے بورڈ کے سربراہ ریاست سوات کے پرجوش حکمران ہیں جو والی کہلاتے ہیں۔ اپنے لڑکے شہزادہ اورنگ زیب (ریاست سوات کے ولیعہد) کے ساتھ دونوں مل کر ہوٹل کے انتظام میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں۔ سوات میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل کرنا عام بات ہے۔ ان کے دفتروں کے دروازے غریب ترین باشندوں اور سیاحوں کے لیے ہر وقت کھلے ہیں۔ جو بغیر کسی اطلاع کے ملاقات کر سکتے ہیں۔ آنے والے کا پرتپاک استقبال کیا جاتا ہے اور مہمان کی چائے اور بسکٹ سے تواضع کی جاتی ہے۔

والی جن کا نام جنرل میاں گل عبدالحق جہاں زیب ہے۔ بڑے منکسر المزاج انسان ہیں۔ ریاست کے لوگ ان کے انصاف اور تنظیم کی بڑی قدر کرتے ہیں۔ شہزادہ اورنگ زیب انتظامیہ میں ان کی مدد کرتے ہیں۔ سوات کی موجودہ حکومت والی کے والد نے قائم کی تھی جو بادشاہ صاحب کہلاتے تھے۔ بادشاہ صاحب نے اپنی جوانی میں تمام قبائل کو اکٹھا کر کے ان جنگجو دشمنوں کے ساتھ جنگ لڑی جو ذاتی مفاد کی خاطر سوات پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ سوات کے عوام نے ۱۹۱۷ء میں انہیں اپنا حکمران تسلیم کر لیا۔ برطانوی حکومت نے انھیں ۱۹۲۶ء میں تسلیم کیا۔ بادشاہ صاحب نے خود کو عوام کی تعلیم، ہسپتال اور دوسری

آج کا پاکستان



سوات ـــــــ فطرت اور انسان

ضرورتوں کے لیے وقف کر دیا۔ پہاڑوں پر نئی سڑکیں اور شاہراہیں بنائی گئیں، صنعتیں قائم کی گئیں۔ جن سے ان لوگوں کو روزگار ملا۔ جنکا میلان زراعت کی طرف نہیں تھا۔ انھوں نے لوگوں میں نئی روح پھونک دی اور ان کے دورِ حکومت میں تجارت نے بڑی ترقی کی۔ سنہ ۱۹۴۹ء میں بادشاہ صاحب اپنے لڑکے (جو والی بن گئے)، کے حق میں دستبردار ہو گئے۔ آج کل وہ دارالحکومت کے بالکل نزدیک مرغزار میں سنگِ مرمر کے محل میں اپنا وقت گذارتے ہیں، سیاح یہ سمجھنے

ہوئے کہ وہ کسی پارک میں ہیں اکثر ان کے باغ میں چلے جاتے ہیں۔ اگر بادشاہ صاحب انھیں دیکھ لیں تو بلا لیتے ہیں۔ چائے کے ساتھ دوستانہ باتیں ہوتی ہیں اور اس غیر رسمی ماحول میں فرحت ملتی ہے۔

یہی وہ جگہ ہے جو ۱۹۶۱ء میں اپنے بھارت و پاکستان کے دورے کے دوران ملکہ الزبتھ اور پرنس فلپ نے چار روز آرام اور سکون کے لیے پسند کی تھی۔ ملکہ سواتیوں کی گرمجوشی دیکھ کر فرطِ جذبات سے مغلوب ہو گئیں۔ وہ جہاں بھی گئیں لوگوں نے ان کی کار کو گھیر لیا اور پھول برساتے ہوئے خوش آمدید کے نعرے لگاتے۔ ملکہ کے میزبان، والیٔ سوات، اپنی رعایا کو دیکھ کر ایک مشفق باپ کی طرح دمک رہے تھے۔ تکلّف کو بالائے طاق رکھ دیا گیا تھا اور ملکہ کا مختصر دورہ ایک گھریلو محفل کی طرح لگتا تھا۔

سوات کے پانچ لاکھ باشندے پٹھان نسل سے ہیں۔ انھیں اسلام سے والہانہ وابستگی ہے اور انھوں نے اپنی سادہ طرزِ زندگی کو نہیں بدلا۔ نئی چھوٹی چھوٹی ٹیکسیوں نے گھوڑا گاڑی اور بگھی کے ذرائع آمد و رفت کو نیا رنگ دے دیا ہے۔ یہ بگھیاں آج بھی سوات کی سڑکوں پر چلتی نظر آتی ہیں۔ موٹر سکوٹر، سائیکلیں اور ٹرانسسٹر ریڈیو اس بات کا ثبوت ہیں کہ کارخانوں اور ملوں نے سوات کی معیشت کو فروغ دیا ہے۔ سوات ہوٹل سے آگے بڑھ کر جہاں زیب کالج علم کا مرکز ہے جہاں عربی، اردو ادب اور اسلامیات اتنے ہی مقبول مضامین ہیں جتنے کیمسٹری، سائنس اور بائیولوجی۔ تقریباً چار سو طالب علم پاکستان کے کونے کونے سے اور زندگی کے ہر شعبہ سے یہاں آتے ہیں۔ تعلیم مفت ہے۔

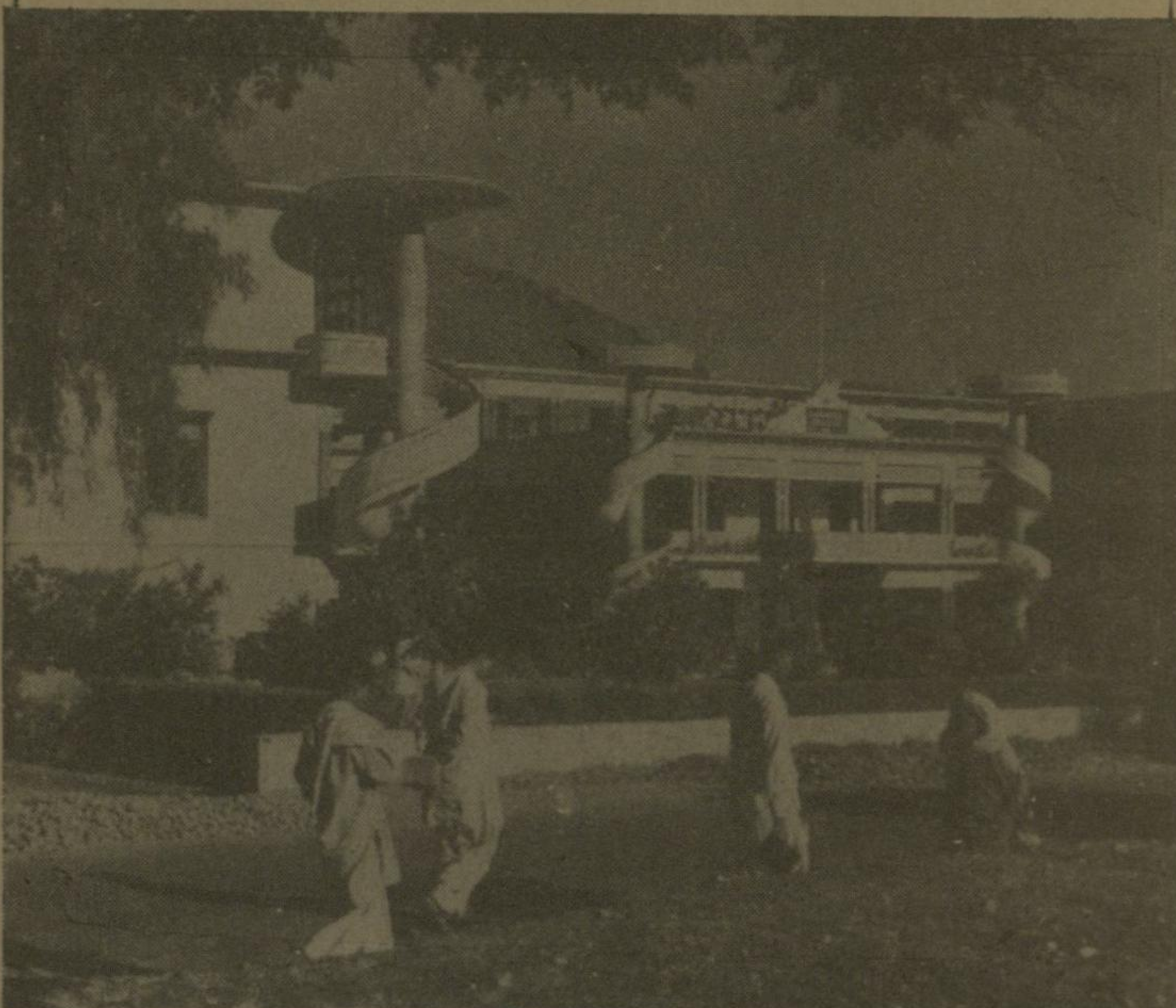
والی نے یہ کالج اسی مقصد کے لیے تعمیر کرایا تھا کہ مستحق نوجوان اعلیٰ تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں۔ کالج کے ہوسٹل میں کھانے اور رہنے کا خرچ صرف ایک روپیہ روزانہ ہے۔ سوات کے پھولوں سے بھرے ہوئے باغات میں بیلوں سے ڈھکے ہوئے ہال شہری ترقی کا پتہ دیتے ہیں۔ کالج کے پرنسپل خواجہ محمد اشرف سرحد کے منکسر المزاج آدمی ہیں جو ہر طالب علم میں ذاتی دلچسپی لیتے ہیں۔ بہت سے سیاح جو کالج دیکھنے آتے ہیں یہ کہتے سنے گئے ہیں "کاش میں بھی سوات میں ایک بار پھر طالب علم بن جاتا۔"

ارد گرد کے علاقہ میں اسلام پور بھی آتا ہے جہاں گاؤں کے لوگ کھڈیوں پر رنگ برنگ کپڑے اور پردے بنتے ہیں۔ سوات میں سینکڑوں پنجابی رہتے ہیں جو سیدو شریف میں منگورہ ٹیکسٹائل انڈسٹریز میں کام کرتے ہیں۔ مِل میں معقول آمدنی کی وجہ سے سواتی اور پنجابی باہم مِل جل کر رہتے ہیں۔ سوات میں بڑے بڑے کارخانے دیکھ کر پاکستانی اور غیر ملکی سیاح دنگ رہ جاتے ہیں۔ منگورہ مل میں پانچ سو سے اوپر لوگ ملازم ہیں۔ شیشہ چڑھی کھڑکیوں کے ساتھ بجلی کے کر گھے چلتے ہیں۔ جاپانی طرز کی مشینوں سے ریشمی کپڑے کے تھان کے تھان نکلتے ہیں۔ شفٹیں دن رات کام کرتی ہیں اور یہاں ہر اس شخص کے لیے کام موجود ہے جو کام کی تلاش میں ہے۔ منگورہ مل کے ڈائرکٹر غفور صاحب، جن سے سوات کے سفر کے دوران میری ملاقات ہوئی، اپنا کارخانہ دکھاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں ابتدا میں یہ کارخانہ لاہور میں تھا لیکن اچھی آب وہوا اور والی کی اچھی پیشکش نے غفور خاندان اور دوسرے سندھیوں اور پنجابیوں کو معہ سازوسامان کے خوبصورت

سوات آنے پر مجبور کر دیا جہاں ٹھنڈی ہوا اور خوشگوار دھوپ میں کام با سانی ہو جاتا ہے۔ سوات کی آب و ہوا تقریباً بے عیب ہے اور دور دور سے لوگ چھٹی منانے یہاں آتے ہیں۔ مون سون ہوائیں سوات نہیں پہنچتیں۔ کوہ پیماؤں کے لیے یہ جنت ہے اور جلد ہی یہاں اسکی انگ کے ڈھلان بھی بن جائینگے۔ حال ہی میں آسٹریا سے "اسکی انگ" کے ماہر پاکستان میں آسٹریا کے سفیر ڈاکٹر کولب کے زیر سرپرستی یہاں آئے تھے اور انھوں نے اس ملک کو ایشیا کے لیے سرمائی کھیلوں کا صدر مقام بنانے کے امکانات کا جائزہ لیا۔

ان ماہرین نے سوات میں جلام بابا میں (جسے ڈاکٹر کولب نے پہلے ہی سے منتخب کر رکھا تھا)، میں کافی روز گزارے۔ جہاں برف سے ڈھکی ڈھلانیں سخت تھیں اور چمکتی دھوپ میں "اسکی انگ" کرنے کا لطف آتا ہے آسٹریا کے یہ "اسکی انگ" کرنے والے اتنے پرجوش تھے کہ پاکستان میں سرمائی کھیلوں کا منصوبہ مناسب ساز و سامان کے ساتھ آسٹریائی طرز پہ شروع ہو چکا ہے "اسکی انگ" کرنے والوں کے لیے جلام بابا میں ایک ہوٹل ہوگا، اسکائی لفٹ (SKi LiFT) ہوگی اور آسٹریا کے تربیت دینے والے ہوں گے۔ پاکستان کے ہمالیائی علاقہ کے لیے بھی اسی قسم کا منصوبہ زیر غور ہے۔ دور دور سے آنے والے سیاح امریکی اور یورپی تفریح گاہوں کی طرح خطیر رقم خرچ کئے بغیر ایشیائی اور مشرقی میزبانی کا لطف اٹھائیں گے۔ ایک مسلم ملک میں "اسکی انگ" کی تفریح گاہ نسبتاً نہایت کم خرچ ہوگی۔

اس ملک کے خوبصورت پہاڑ اس مقام پر اتنے ہی کار آمد بن جائیں گے جتنے



جہاں زیب کالج، سوات

کسان کے لیے زرخیز زمین ہے۔ ہزاروں سال سے برف سے ڈھکی ہوئی ان چوٹیوں کو خوف سے دیکھا گیا ہے۔ کوہ پیما آہستہ آہستہ چوٹیوں پر پہنچتے تھے۔ پہاڑی جانوروں کا شکار ہوتا تھا......... اب یہ اس کی اننگ ای کی ڈھلانوں کا کام دیں گی اور سرمائی کھیلوں کے میدان کی حیثیت سے لطف اور اچھی صحت کا ذریعہ بنیں گی۔

والئ سوات کے تعاون کے ساتھ ریاست سوات میں سرمائی کھیلوں کا یہ

نیا مرکز کافی عرصہ گفتگو کا موضوع بنا رہے گا ——— اس علاقہ میں رلیسٹ ہاؤس بڑھ جائیں گے۔ یوں بھی سوات کے ہر گاؤں میں رلیسٹ ہاؤس موجود ہے۔ مدیان جو سیدو سے تقریباً تیس میل دور ہے کا منظر نہایت دلفریب ہے۔ پانچ میل آگے بڑھ کر بحرین ہے جو چوٹیوں پر واقع ہے۔ یہاں سے وادی میں بڑی بڑی آبشاروں سے برف کے گالوں کی طرح صاف شفاف پانی کے دھارے بہتے ہیں۔ یہاں ٹھہرنے کے لیے بے شمار جگہیں ہیں اور ایک رات کے لیے پانچ روپے دیکر آدمی ایسے ماحول میں سو سکتا ہے جو میٹر ہورن کی یاد دلاتا ہے۔ بدھ عمارات کے کھنڈرات ان لوگوں کو لبھانے کے لیے اب بھی کافی ہیں۔ جنہیں آثارِ قدیمہ سے دلچسپی ہے پرانے زمانہ کی تہذیب کا کھوج لگانے کے لیے سوات میں اب بھی اکثر مہمات آتی رہتی ہیں۔ اکثر سونے کے زیورات اور قیمتی پتھر دستیاب ہوتے ہیں۔ حال میں آنے والی اٹلی کی مہم نے قدیم دور کے قیمتی مجسمے اور ساٹھ سے زیادہ سٹوپوں کی کی کھدائی کی ہے۔

تازہ ترین دریافت پروفیسر سیوسپ توسی کی ہے گو پروفیسر کی مہم گذشتہ سات سال سے اس علاقہ میں کام کر رہی ہے لیکن پچھلا سال سب سے زیادہ سود مند ثابت ہوا ہے۔ یہ دریافت ان لوگوں کے بارہ میں بہت سی مزید معلومات بہم پہنچائے گی جو ہزاروں سال قبل وسطی ہند کے علاقہ میں رہتے تھے۔

محتاط اور سلسلہ دار کھدائیوں سے اُن قبرستانوں کے کھنڈرات کا پتہ چلا ہے جو ہزاروں سال قبل مسیح سے پہلے کے خیال کیے جاتے ہیں۔ اور اس دور سے پانچ سو سال پہلے کے ہیں جب ہندی یونانی گندھارا آرٹ

عروج پہ تھا۔

یہ نظریات ان برتنوں اور دوسری چیزوں کی دریافت پہ مبنی ہیں جو سو سے اوپر اچھی حالت میں مقبروں سے نکلی تھیں رٹبکارہ کا مقدس علاقہ جہاں مقبرے اور قبرستان پائے گئے ہیں، یہاں کے لوگوں اور ان کے رسم و رواج کے ارتقاء کا پتہ دیتا ہے۔ پروفیسر توسی نے اس بات کی مکمل تصدیق کی ہے۔

یہاں بہت سی ایسی چیزوں کے نشانات ہیں جنہیں دوسری تہذیبوں سے اختیار کیا گیا تھا یہ تہذیبیں اس دور سے قبل اور بعد میں موجود تھیں جو اب آثارِ قدیمہ کی تحقیقات کا موضوع ہے۔ یہ بات تقریباً یقینی ہے کہ اس علاقہ میں قدیم لوگ آباد تھے۔ اس بات کی شہادت ان چیزوں کے نقش و نگار سے بھی ملتی ہے جو آس پاس کے علاقہ اور مقبروں سے ملی ہیں۔ بہت سے مقبروں سے جنہیں حال ہی میں کھودا گیا ہے۔ عورتوں اور مردوں کی ہڈیاں برآمد ہوئی ہیں جس سے اس امر پہ روشنی پڑتی ہے کہ عورت مرد دونوں کو اکٹھا دفن کیا جاتا تھا۔ ایک اور مقبرے سے دو گھوڑوں کے ڈھانچے برآمد ہوئے ہیں۔

غالباً سب سے زیادہ دلچسپ دریافت وہ ایک جیسی بدھ عمارات ہیں جو ایک دوسرے کے اوپر بنائی جاتی تھیں۔

سوات کے شمال مشرق میں دریائے سندھ کی خوبصورت پہاڑی گھاٹی ہے نیچے کھیت سبز مخمل کی طرح چمکتے ہیں۔ لبادٔ پاس، کنڈائی کہ مانگ اور ڈوبہ کی وادیاں ساڑھے چودہ ہزار فٹ بلند ہیں اور دھوپ اور سایوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ سیر کرنے والوں کے لیے یہ دلچسپ جگہ ہے اور سوات کی مقامی بس پہ



سوات ہوٹل

دہاں جانے کا لطف آتا ہے ۔ اس علاقہ کے متجسس اور خوش باش سواتیوں کو دوست بنا کر خوشی ہوتی ہے ۔

سوات میں کسی بھی دن دریا کے کنارے سیر کرتے ہوئے آپ راستہ میں برات دیکھ سکتے ہیں ۔ اجنبیوں کو خوش کرنے کے لیے براتی رک جائیں گے اور آپ کو تصویریں اتارنے اور پردے میں ڈھکی ہوئی دلہن کو ایک نظر دیکھنے کی اجازت دے دیں گے وہ آپ کو معزز مہمان کی حیثیت سے اپنی

خوشیوں میں شریک کرنے پر اصرار کریں گے۔ اگر آپ ان کی دعوت قبول کر لیں تو چاروں طرف سے واہ واہ ہو گی۔ اور ان کی آوازوں کا شور اتنا ہی لطیف ہو گا۔ جتنا چودھویں کی رات کو ایک محبت بھرا گیت۔ قدیم زائچوں کے مطابق کسی اجنبی کی شادی میں شرکت کرنا نہ صرف خوش بختی لاتا ہے بلکہ اس بات کا بھی امکان ہے کہ کسی کنوارے مرد یا کنواری دوشیزہ کو مستقبل کا ساتھی مل جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تفریح کی سرزمین سوات میں یہ بھی ممکن ہے۔

دلفریب گلگت

کوہ پیماؤں کا محبوب اور دنیا بھر میں سب سے زیادہ وسیع و عریض پہاڑی علاقہ پاکستان کے نقشہ میں بائیں ہاتھ اوپر کونے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

اس کے وسط میں گلگت ایجنسی ہے۔ ندی نالوں میں گھرا یہ ایک بڑا سا گاؤں ہے جہاں تازہ مچھلی ملتی ہے اور ہر بچہ مچھیرا ہے۔ چڑیاں تمام دن (بلکہ رات گئے تک) چہچہاتی رہتی ہیں اور اوپر سیر کرنے والوں اور مقامی لوگوں کے شکار کے لیے پرندے اُڑتے رہتے ہیں۔ کوہ پیما عموماً مہمات کے ساتھ گلگت آتے ہیں۔ نوجوان، پرجوش، عرق ریزی کرنے، سردی سے ٹھٹھرنے اور میلوں چل کر پہاڑوں پر چڑھنے کے لیے تیار۔ یہ ایسا جذبہ ہے جو سخت کوشش کوہ پیماؤں کو مغلوب کر لیتا ہے اور جب وہ کوہ قراقرم کی چوٹیوں پر پہنچتا ہے تو اس زمین کا باشندہ معلوم نہیں ہوتا۔

راولپنڈی سے ہوائی جہاز کے ذریعہ گلگت کا اسّی منٹ کا راستہ ہے۔

پی آئی اے (PIA) کے جہاز ہوا میں بلند پرواز کرتے ہیں اور مسافر خوبصورت نظاروں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مجھے بھی ان میں شامل ہونے کے لیے کئی روز انتظار کرنا پڑا کیونکہ اس سفر کے لیے موسم بالکل صاف ہونا چاہیے۔ رفتہ رفتہ اونچے ہوتے ہوتے ہم سیدھے بلند پہاڑوں کی طرف جا رہے تھے۔ جہاز کی کھڑکیوں سے مری کھلونا نما

مکانوں کا چھوٹا سا شہر معلوم ہوتا تھا، ایبٹ آباد اور مظفر آباد دھوپ میں چمک رہے تھے۔ پچیس منٹ کے اندر ہم بارہ ہزار فٹ سے زیادہ چڑھ چکے تھے اور برف سے ڈھکے ہوئے اُس سلسلہ کی طرف جا رہے تھے جس کی چوٹیاں مہیب دانتوں کی طرح دکھائی پڑتی تھیں جن کا سایہ زمین پر پڑ رہا تھا۔ راستے ہی میں کہیں الگ تھلگ دُھند سے گھرا ہوا نانگا پربت ایک ناقابلِ تسخیر جنگجو کی طرح کھڑا تھا جو ازل سے پہرہ دے رہا ہو۔

نیچے زرخیز وادیِ کاغان پھیلی ہوئی تھی۔ بابوسار کو جانے والا جیپ کا راستہ صاف نظر آ رہا تھا جو گرمیوں میں گلگت کو بیرونی دُنیا سے ملاتا ہے۔ تھوڑے فاصلہ پر پگھلتی ہوئی برف سے چمکتا ہوا سلسلہ قراقرم نظر آ رہا تھا۔ اب جیپ کا راستہ تاریکی میں کھونے لگا۔ یہ نظارہ کسی حد تک پُرخوف تھا لیکن جلد ہی اس پر نانگا پربت غالب آگیا جو دھوپ میں نہایا ہوا چمک رہا تھا۔ پھر فوراً ہی ہماری منزلِ مقصود، گلگت نظر آنے لگا اور بادلوں میں ہمارا مختصر سفر ختم ہوگیا۔

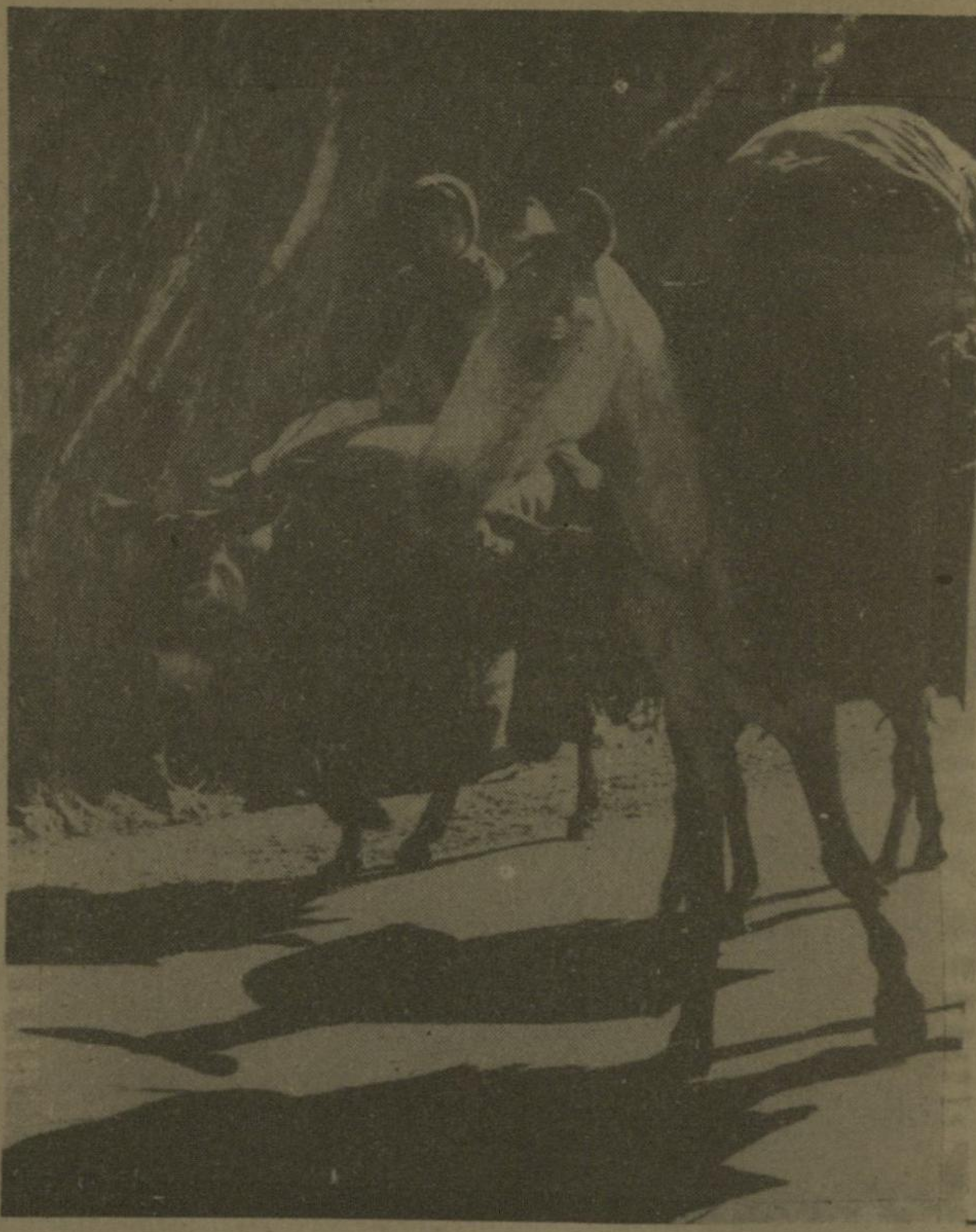
کسی زمانے میں گلگت کا سفر بڑا جان جوکھوں کا کام تھا۔ اُونچے درّوں میں صرف تجارتی راستوں کے ذریعے کاروانوں کی صُورت میں جایا جا سکتا تھا اور منزل تک پہنچنے میں مہینوں لگ جاتے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ یہ کتنی خوش کن بات ہے کہ گلگت نے خود اپنا انقلاب برپا کیا اور ۱۹۴۷ء میں مہاراجہ کشمیر سے الحاق کا جُوا اتار پھینکا اور کس طرح پاکستان کی مدد سے سڑکیں تعمیر کی گئیں اور موسم کے مطابق روزانہ جہاز پرواز کرنے لگے۔ گلگت کتنی خوب صورت اور دلفریب جگہ ثابت ہوئی۔

چاروں طرف سے عظیم ہمالیہ سے محیط، اس کے ہوائی مستقر کی دیواریں

بلند برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ہیں۔ سمندر سے ڈھکی ہوئی کھاڑی کی طرح اس کا راستہ گھاس سے چھپا ہوا ہے اور نیلگوں آسمان کے مقابلے میں خوب صورت تضاد پیش کرتا ہے۔ اس کو دیکھ کر مجھے کیلیفورنیا کا پام اسپرنگز (PALM SPRINGS) یاد آ گیا جس کا راستہ ریگستان سے گزرتا ہے۔ دھوپ میں چلتے ہوئے مجھے وہ نخلستان یاد آ رہا تھا جہاں کھجور کے درخت، جنگلی پھول اور چھوٹے چھوٹے جھرنے پھیلے ہوتے ہیں اور گھڑ سوار ریتیلے راستوں پر جمع ہوتے ہیں

وزارت امور کشمیر سے اجازت نامہ حاصل کرنے والوں کی، جو محکمہ سیاحت کی وساطت سے بآسانی مل جاتے ہیں، عموماً پولٹیکل ایجنٹ کی رہائش گاہ پر خاطر تواضع کی جاتی ہے۔

ان کا خوب صورت بنگلہ وسیع میدانوں کے درمیان بنا ہوا ہے۔ اب سیاحوں کو نئے ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کے لیے بھی عمدہ جگہ مل سکتی ہے۔ پہاڑیوں کے ارد گرد "چکر" کاٹتا ہوا مچھلیوں کا تالاب ہے، اور شاہ بلوط اور صنوبر کے درختوں سے گھری ہوئی صاف شفاف پانی کی نہر ہے۔ خوبانی، سیب اور انجیر کے درختوں کے درمیان گیندے اور سرخ گلاب کے پھول خوب صورتی میں اضافہ کرتے ہیں۔ موٹے تازے چوزے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے ہیں اور درختوں سے گھرا ہوا سرسبز وسیع میدان دھوپ کھانے اور شام کو خنک ہوا میں چائے پینے کا لطف اٹھانے کی دعوت دیتا ہے۔ گھر کے مالک، جو پولٹیکل ایجنٹ ہیں، مصروف زندگی گزارتے ہیں۔ اپنے فرائض کے ساتھ جو ایک مقامی گورنر کے برابر ہیں، وہ اپنا فالتو وقت گلگتیوں کی زندگی بہتر بنانے کے بارے میں سوچ بچار میں



صدیوں کی داستانیں سناتے پہاڑ

گزارتے ہیں۔ اپنے پرائیویٹ سیکرٹری اور اسٹینوگرافر کے ساتھ مل کر وہ بے اندازہ کام کرتے ہیں۔ آنے والے مہمانوں اور مہمات کی میزبانی اس کے علاوہ ہے۔ وہ بڑے گرم جوش اور مخلص آدمی ہیں اور گاؤں کے لوگ اُسے اسی طرح محبت کرتے ہیں جیسے کوئی اپنے باپ سے کرتا ہے۔ علاقہ کا جج اور مجسٹریٹ ہونے کے علاوہ لوگ اپنے ذاتی مسائل بھی لے کر ان کے پاس آتے ہیں جنہیں وہ کسی نہ کسی طرح حل کر دیتے ہیں۔ ان کی موجودگی سے گلگت کی دلچسپیوں میں اضافہ ہوگیا ہے، کیونکہ

اُن کی دوستانہ طبیعت ہمہ گیر ہے۔

بازار کو جانے والے خم دار راستے پتھر کی منڈیروں پر گھرے ہوئے ہیں اور ندیاں گندم کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہیں۔ گاؤں کے لوگ پر خلوص ہیں اور اجنبیوں کے ساتھ ہمدردانہ برتاؤ کرتے ہیں۔ بازار میں لومڑی کی کھالیں چار سے آٹھ روپے تک فروخت ہوتی ہیں۔ مجھے اس پر یقین نہیں آتا تھا لیکن یہاں شکار عام کھیلا جاتا ہے اور شکار میں جانوروں کی کھالیں شامل ہیں۔ ایک اور عجیب و غریب چیز یہاں کا بازار ہے۔ میں سوچ کر حیران تھی کہ خوب صورت گھڑیاں اور تصویروں کے فریم کون خریدتا ہوگا جو ریشمی کپڑوں کے ساتھ اونچے اونچے ڈھیروں کی شکل میں رکھے رہتے ہیں۔ ایک چینی تاجر مشرقِ بعید کے بنے ہوئے کمخواب بیچتا ہے۔ درزی ایک دن کے اندر اندر کپڑے سی دیتے ہیں۔ یہ لوگ سیاحوں سے معزز ترین شہریوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور اُجرت بھی بڑی معمولی ہے۔

چونکہ پولو کو قومی کھیل کی حیثیت حاصل ہے (پولو کی ابتدا اسی علاقہ سے ہوئی تھی) اس لیے آپ کے پاس ایک جوڑا جودھ پوری کا بھی ہونا چاہیئے جو عموماً عجلت میں سیا جاتا ہے۔ درزی قصے کہانیوں کے کردار معلوم ہوتے ہیں لیکن اُن کے سلے ہوتے کپڑوں سے برطانوی اور بونڈ اسٹریٹ کا قدیم رنگ جھلکتا ہے۔ برطانوی دور کی کچھ چیزیں یہاں ابھی باقی ہیں۔ عیسائیوں کا قبرستان ہے جس کی نگہداشت کی جاتی ہے اور کائی سے ڈھکے ہوتے کتبوں کے ساتھ یہ پھولوں کی سیج معلوم ہوتا ہے۔

گلگت کی لائبریری کے دروازوں کے گرد گلاب کے پھول اُگے ہوتے ہیں۔ ایک میدان کے وسط میں جہاں ہر شام ٹینس اور کرکٹ کھیلی جاتی ہے۔ یہ لائبریری

پُرانے انداز کے برآمدے کی طرح ہے جہاں گدّے دار کرسیاں پڑی ہیں اور میزیں لوگوں سے بھری رہتی ہیں۔ آپ کوئی کتاب لینے جاتے ہیں لیکن انتخاب کرتے ہوئے عہدِ رفتہ میں کھو جاتے ہیں یہ بڑا خوش کن تجربہ ہے۔ لوگ یہاں گھنٹوں بیٹھے رہتے ہیں اور خوش الحانی کے ذریعہ زمانۂ حال سے وابستہ تاریخ پڑھ کر لطف اندوز ہوتے ہیں۔

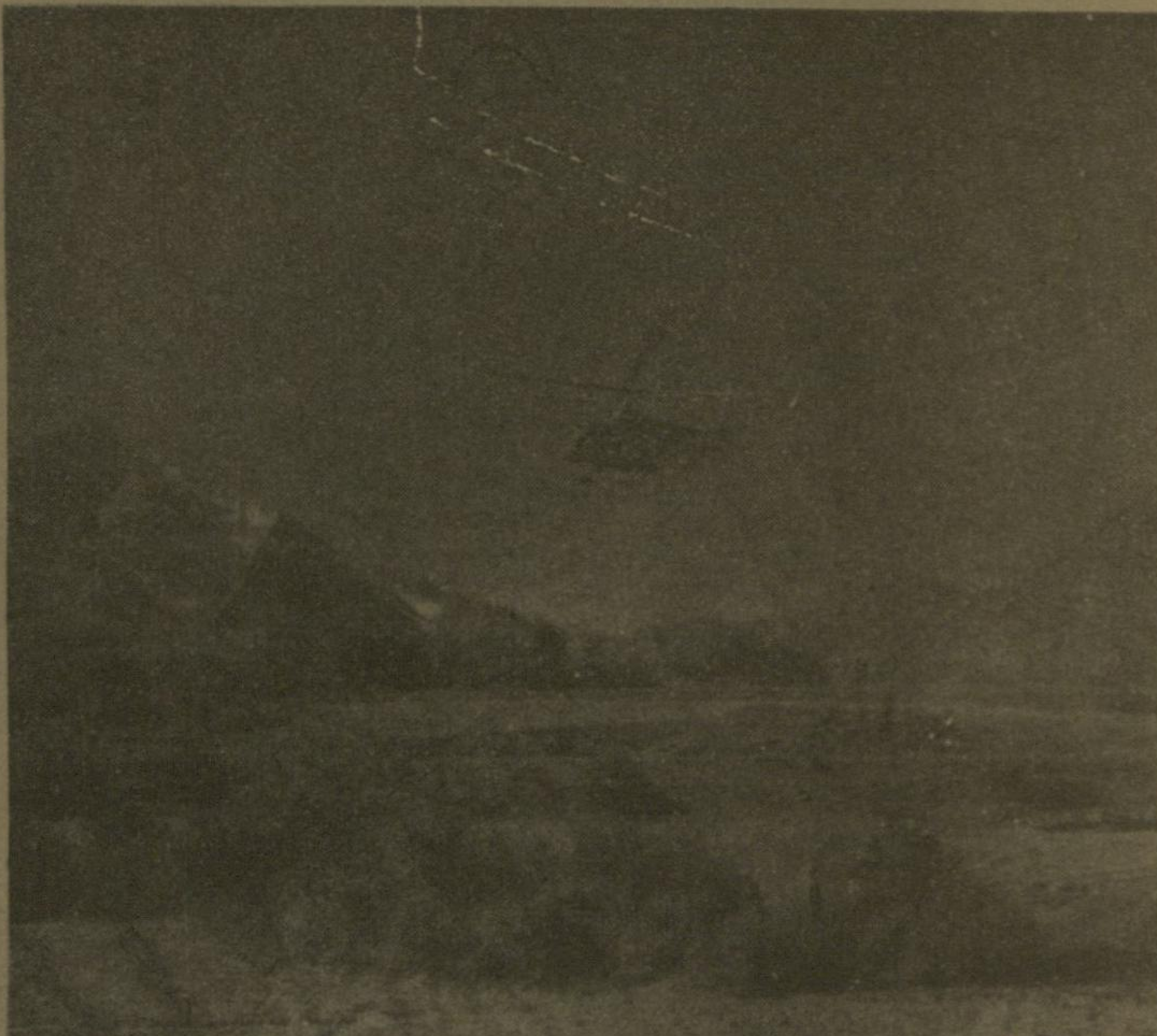
گھڑ سواری یہاں بے حد مقبول ہے۔ ہوائی اڈے کو جاتے ہوئے گرد آلود سڑکیں اور بے شمار ندی نالے پڑتے ہیں۔ خنک شام میں سیّاح اور مقامی لوگ میلوں لمبی سیر کو نکل پڑتے ہیں۔ راستے کے دونوں طرف اونچے اونچے درخت ہیں اور گھوڑے دُلکی چلتے ہیں۔ نیلگوں دریا میں مچھیرے رہو پکڑنے کے لیے جال ڈالتے ہیں جو گلگت میں بہت مشہور ہیں۔ شام ہونے پر موذن کی آواز سنائی دیتی ہے اور لوگوں کو عبادت کی طرف بلاتی ہے۔ روشنیاں مدھم ہو جاتی ہیں اور دکانیں بند ہو جاتی ہیں۔ گلگت کے لوگ سویرے سونے اور پو پھٹے اُٹھنے کے عادی ہیں یہاں زندگی بالکل سادہ ہے...... لوگ اسی طرح رہنا پسند کرتے ہیں۔

اس کے باوجود گلگت میں آجکل زندگی کی نئی لہر دوڑتی ہے....... پنیال، گوپیز، نگر اور ہنزہ کو جانے والے راستوں پر سمتوں کے نشانات لگائے گئے ہیں اس کے علاوہ چنار باغ ریسٹ ہاؤس جانے والی سمت میں بھی خوشنما نشانات لگائے گئے ہیں۔ یہاں سیاح پانچ روپیہ یومیہ دے کر قیام کر سکتے ہیں۔ چنار پارک ایک وسیع پارک کی طرح ہے جہاں تیرنے کا تالاب، سرسبز میدان اور چاروں طرف درخت اور پھول ہی پھول ہیں۔ اس کے وسط میں ان بہادروں کی یادگار تعمیر کی گئی ہے جنہوں نے گلگت کو بیرونی حملہ آوروں سے بچانے کے لیے اپنی جانیں قربان کیں یہ علاقہ گلگت کے سکاؤٹس (Gilgit Scouts) کے تصرف میں ہے

اور وہ اس کے وسیع میدانوں میں اکثر میلے منعقد کرتے ہیں جن میں تمام سیاحوں کو شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ چنار باغ کے قریب ایک جدید ریسٹ ہاؤس حال ہی میں تعمیر کیا گیا ہے اس صاف ستھرے ریسٹ ہاؤس میں خوبصورت برآمدے اور الگ الگ غسلخانے ہیں۔ تمام سہولتوں کے باوجود کرایہ صرف بارہ روپیہ یومیہ ہے اور نہایت ارزاں نرخ پر بڑا لذیذ کھانا ملتا ہے، سیاح یہاں بے فکری سے دن گذار سکتے ہیں اگر کہیں جانے کو دل نہ چاہے تو سارا دن سرسبز میدانوں میں بیٹھے رہیں یا شام کو پولو دیکھیں جو اس علاقے کا محبوب ترین کھیل ہے بچوں کے سکول بھی قابل دید ہیں اگر آپ کے دانت میں درد ہو یا گلے میں خراش، تو گلگت ہیلتھ ایجنسی سے استفادہ کیجیے یہاں طبی امداد مفت دی جاتی ہے اور بالکل خاندان کے فرد کی طرح نگہداشت ہوتی ہے۔ گلگت کے لوگوں کو ہر طرح کی طبی سہولتیں میسر ہیں۔ خوشنما ہسپتال میں بڑے بڑے ہوادار برآمدے بنائے گئے ہیں۔

باغبانی، کھیتی باڑی، جانوروں کا شکار، مچھلی کا شکار، شہد کی مکھیاں پالنا اور کپڑا بُننا گلگت کے لوگوں کے ذریعہ روزگار ہیں۔ حال ہی میں دیہی ترقیاتی پروگرام نے گلگت میں شاندار نتائج پیدا کیے ہیں۔ سنگِ مرمر اور بھورا پتھر یہاں بے اندازہ پایا جاتا ہے۔ پہاڑوں میں پائے جانے والی چند معدنیات نے بھی دیہاتی ترقی میں مدد دی ہے۔ سڑکوں اور عمارات کی تعمیر مکمل ہو چکی ہے۔ ایک زراعتی افسر سات بڑے فارموں اور پھلوں کی نئی نرسری کا نگران ہے۔ یہاں ریشم کے کیڑوں کی پرورش بھی شروع کر دی گئی ہے اور زیادہ سے زیادہ زمین کو زیر کاشت لانے کے لیے نئی نہریں بنائی گئی ہیں تاکہ یہ علاقہ اناج کے معاملے میں خود کفیل ہو سکے۔

اس علاقہ میں پہلی بار حال ہی میں مرغیوں کا فارم قائم کیا گیا ہے جہاں لوگوں کی تمام



گلگت میں پی آئی اے کے ہیلی کاپٹر کی پرواز

ضروریات پوری کی جائیں گی۔ اور انہیں انڈے اور سرخ روڈ آئیلنڈ، سفید لیگ ہارن اور دوسری اعلیٰ قسم کی مرغیوں کے چوزے فراہم کئے جائیں گے۔ دُور کے علاقوں میں رہو مچھلیوں کی پرورش گاہیں دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہر چیز کو دیکھ کر گلگت کی ترقی کا احساس ہوتا ہے۔ دیہی ترقیاتی پروگرام کا بنیادی مقصد لوگوں میں اپنی مدد آپ کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ اس کے نتائج حیران کن ہیں۔ مثال کے طور پر دریائے گلگت پر بارگو پل، معماروں کی اُجرت کو چھوڑ

کر، بارگو کے لوگوں نے نہایت کم وقت میں خود ہی تعمیر کیا ہے۔ گلگت کے وسط میں واقع یہ عظیم پل گلگت کو ہنزہ اور نگر ریاستوں کو جانے والی سڑک سے ملاتا ہے۔ اس سادہ گھاٹی میں یہ ایک جدید سہولت ہے۔ گوپیز، اشکومان، یاسین اور استور کے علاقے (جہاں گلگت سے چند گھنٹوں میں پہنچ سکتے ہیں) شکاریوں کے لیے جنّت ہیں۔ تعلق اور مارخر ہر طرف پھرتے ہیں، چیتے اور ریچھ دبے پاؤں چلتے ہیں اور دُنیا کے کونے کونے سے شکاری یہاں شکار کے لیے آتے ہیں۔

چونکہ اسکردو کی طرح گلگت بھی اُونچے پہاڑوں اور خطرناک دّروں سے گھرا ہوا ہے۔ اس لیے ڈاک کی تقسیم یہاں ہمیشہ سے سُست رہی ہے۔ بلکہ ملک کے دوسرے حصّوں سے یہاں ڈاک پہنچنے میں دس بارہ دن لگ جاتے تھے اور اگر برفباری ہو جائے تو اور بھی زیادہ عرصہ لگتا۔ پچھلے چند سالوں سے محکمہ ڈاک نے ایک خاص طیارہ کا انتظام کیا ہے جو روزانہ ڈاک لاتا اور لے جاتا ہے۔ اس علاقہ کے کونے کونے میں کس طرح ڈاک بھیجی جاتی ہے یہ تقریباً ایک معجزہ ہے اور ہمّت و استقلال کی کہانی ہے۔

راہداری کا عرصہ اب دنوں کے بجائے چند گھنٹے رہ گیا ہے۔ ڈاک کے خرچ میں اضافہ کے بغیر جب سے یہ خاص طیارے چلنے شروع ہوئے ہیں علاقہ میں اور زیادہ طمانیت آگئی ہے۔ دوستوں یا عزیزوں کی طرف سے آیا ہوا خط ایسی خوشی بخشتا ہے گویا وہ آپ کے پاس موجود ہوں۔ اس سہولت کو بہت سراہا گیا ہے۔

اس علاقہ کے قدیم خطرناک درّوں میں ڈاکیہ نہایت اہم کردار ادا کرتا ہے۔ اس کا کام بے حد مشکل ہے۔ مضبوط توانا اور محتاط ڈاکیہ پہاڑوں اور گھاٹیوں پر چڑھتا ہے۔ درّوں میں سے گزرتا ہے، پانی میں چلتا ہے اور وقت پر اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔ اس کا

کام قوتِ برداشت، ہمت اور ذاتی دلچسپی کا مظہر ہے۔ وہ تمام اسکردو اور گلگت ایجنسی کو پا پیادہ طے کرتا ہے۔ اکثر وہ چائے پینے اور لوگوں سے بات چیت کے لیے ٹھہر جاتا ہے اور انہیں پہاڑ کے دُوسری طرف رہنے والے ان کے عزیزوں کی خیریت سے آگاہ کرتا ہے۔ ڈاکیہ کا ہمیشہ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

مقامی لوگ سیاحوں کی خوب آؤ بھگت کرتے ہیں اور وہ کہیں بھی ہوں ٹیلیفون کال کی اطلاع انہیں مل جاتی ہے خواہ انھوں نے کسی سے ذکر بھی نہ کیا ہو۔ لیکن سارے شہر کو علم ہوتا ہے کہ وہ کس کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ گو یہ بات عجیب سی لگتی ہے لیکن گلگت میں یہ بالکل قدرتی ہے۔ غروبِ آفتاب کے وقت گلگت کی چوٹیاں آگ کی دیوار معلوم ہوتی ہیں اور جب وادی میں رات لبیرا ڈالتی ہے تو ایک ازلی سکون پہاڑیوں کو اپنے دامن میں لپیٹ لیتا ہے۔ تارے ایک ایک کر کے نمودار ہوتے ہیں اور قمقموں کی طرح آسمان پہ جھلملانے لگتے ہیں۔ گلگت میں مسرّت و انبساط ایسی چمک کا لبادہ اوڑھ لیتے ہیں جو تاروں بھری رات میں ہر مکان میں پہنچتی ہے۔

پنیال پریوں کا دیس

پنیال اور گوپیز کے راج آپس میں قرابت دار ہیں اور چچا اور بھتیجوں کی حیثیت سے ایک دوسرے کے اتنے ہی نزدیک ہیں جتنے جڑواں بچے جو ایک دوسرے کی جدائی گوارا نہ کر سکیں۔ لیکن ذاتی برتری کی خاطر وہ شکاریوں کی طرح ایک دوسرے کے حریف بن جاتے ہیں۔ ہر ایک اپنے آپ کو دوسرے سے بہتر میزبان سمجھتا ہے۔ میری ذاتی رائے میں دونوں یکساں طور پر خوش اخلاق ہیں اور اپنی پہاڑی ریاستوں میں ایسی میزبانی کرتے ہیں کہ ان پُرفضا علاقوں کو 'پریوں کی سرزمین' کہا جا سکتا ہے۔

چونکہ گلگت سے جاتے ہوئے ان خوبصورت علاقوں میں سے پنیال پہلے پڑتا ہے اس لیے 'پریوں کی سرزمین' کے نام پر اس کا پورا پورا حق ہے۔ پیٹر پین بھی اس کی پوری تائید کرے گا۔ سچ پوچھئے تو یہ دیو مالائی چھوٹا بچہ (جو جہازوں سے بھی پہلے اڑتا تھا)...... پنیال میں گھر کا سا سکون محسوس کرے گا۔ پنیال دنیا کی چھت پر قدرت کے لگائے ہوئے باغیچے کی طرح ہے۔ پھلدار درختوں سے ڈھکی ہوئی پہاڑیوں پر سورج چمکتا رہتا ہے اور یہ چمک آپ پر غالب آ جاتی ہے۔ اگر آپ وہاں موجود ہوں تو بھی آپ کو بمشکل یقین

آئے گا کہ یہ سب کچھ حقیقی ہے۔ یہ تو ایک واہمہ ہے جس نے زندگی کا روپ دھار لیا ہے، گویا کسی جادوگر نے اپنی چھڑی ہلائی ہو اور انسانوں کو اس اجنبی کائنات میں لا ڈالا ہو۔ اور پھر ہمالیہ کے وسط میں اپنی ٹوپی سے نکال کر اس دنیا کو ایک پہاڑی سلسلہ میں چوٹیوں کے درمیان ٹانگ دیا ہو۔ یہ ساحر خدا ہے جس نے مغربی پاکستان کو سلسلۂ قراقرم کی صورت میں چوٹیوں اور برف کے تودوں کا عظیم ترین تحفہ بخشا ہے جس نے انسانی آنکھ کو متحیر کر رکھا ہے۔ مقامی لوگ پرخلوص اور سیدھے سادے ہیں اور قدیم لیکن خوبصورت ماحول میں عام پتھروں اور مرمر کے بنے ہوئے مکانوں میں رہتے ہیں۔ یہ پتھر پہاڑوں سے کاٹ کر لایا جاتا ہے۔ راجہ جان عالم یہاں کے حکمراں اور گورنر ہیں اور رحمدلی سے ایسی تہذیب میں عدل و انصاف کرتے ہیں جو بالکل ان کی اپنی ہے، جہاں لوگوں کو روٹی مرغوب نہیں اور پولو ان کا پسندیدہ ترین کھیل ہے۔

گلگت میں مجھ سے ملنے والے وہ سفیر اور سیاح جو یہ سمجھتے تھے کہ انھوں نے ہر چیز دیکھ رکھی ہے وہ بھی ریاست ہنیال کی خوبصورتی دیکھ کر دم بخود رہ گئے۔ ہر ایک نے اقرار کیا کہ اس زرخیز زمین پر قدم رکھنے سے پہلے وہ اس قدر دلچسپ اور حیران کن تجربہ کی ہرگز توقع نہیں رکھتے تھے۔

میرا ہنیال جانا بالکل اتفاقی تھا۔ گلگت میں سفر کرتے ہوئے جہاں سے ہنیال کو راستہ جاتا ہے، میری ملاقات راجہ حسین علی خاں سے ہوئی جو گوپیز کے حکمراں ہیں۔ ہم دونوں گلگت کا خوبصورت ہسپتال دیکھ رہے تھے۔ جہاں بیماروں سے معزز مہمانوں کا سا سلوک کیا جاتا ہے اور طبی امداد بالکل مفت ہے۔ انھوں نے میری

سگرٹ سلگانے کے لیے ماچس جلائی جو تیز ہوا میں فوراً بجھ گئی۔ میں نے اپنے ہاتھوں کو پیالے کی شکل دے کر ان کے ہاتھوں پر رکھ لیا۔ یہ ترکیب کامیاب رہی! وہ حیران رہ گئے، گھبرا کر تھوڑے سے ہکلائے اور سر کو خم دیتے ہوئے مسکرا کر کہا "مادام، میں دوائیاں لینے کے لیے پنیال روانہ ہونے والا ہوں جو یہاں سے صرف پینتیس میل کے فاصلہ پر ہے۔ پنیال کا حکمران راجہ جان، جو میرا عزیز بھتیجہ ہے، امریکی سیاحوں کی صحبت سے بہت لطف اندوز ہوتا ہے۔ میری جیپ میں جگہ ہے — کیا آپ میرے ہمراہ تشریف لے چلیں گی؟" میں سوچ میں ڈوب گئی۔ پتلا دبلا راجہ پچاس کے پیٹے میں تھا اور ہنری ہشتم سے بھی زیادہ خوبصورت تھا تقریباً دو گھنٹہ بعد میں جیپ میں بالکل راجہ سے لگی۔ بکسوں، ڈبوں، راجہ کے محافظ اور یونانی نسل کے قبائلی ڈرائیور سے گھری بیٹھی تھی۔ اگلے چار گھنٹوں میں سلسلۂ قراقرم میں ہمیں جس خطرناک راستہ پر سفر کرنا تھا اس کے بارے میں نہ کچھ راجہ نے بات کی نہ ڈرائیور نے۔ گفتگو کا رخ عہد رفتہ کے گھڑسواروں اور آجکل کے گھوڑوں، خچروں اور پیدل چلنے والے قافلوں کی طرف بدل گیا۔

شام کی دھند میں برف پوش چوٹیاں چھپ گئیں جو عموماً گلگت روڈ پر وادی سے نظر آتی ہیں۔ آندھیوں میں گرے ہوئے بڑے بڑے پتھر تند رو دریائے گلگت کو پار کرتے ہوئے ہمارے راستہ میں پڑے تھے۔ وادی میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے پانچ میل گذر گئے، ہم عظیم پہاڑوں سے گھرے ہوئے تھے۔ دیوہیکل محافظوں کی طرح ایک ایک چوٹی سامنے آتی تھی۔ یہ دوسرے پہاڑی سلسلوں سے بالکل مختلف تھا۔ کیونکہ قراقرم میں بیس ہزار فٹ بلند پہاڑ تو کوئی معنی ہی

نہیں رکھتے۔ یہاں بہت سی چوٹیاں ہیں جو اس سے کہیں اونچی ہیں ہیں۔ راستہ کے دونوں طرف پتھروں کے ڈھیر تھے۔ پھر نخلستان کی طرح ہمارے سامنے اچانک جنگلی پھول، اونچے اونچے درخت اور جھلمل جھلمل کرتی ندیاں آگئیں جیسے جیسے ہم خمدار راستوں پر چڑھتے اترتے گئے یہ ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے گئے۔ اگلے دس میل میں نے زیرِلب دعا مانگتے ہوئے گذارے کیونکہ ہم کھائیوں کے اوپر چل رہے تھے۔ جن کے کنارے بالکل سیدھے کٹے ہوئے تھے اور نیچے سینکڑوں فٹ گہرے کھڈ تھے۔ ہمارا ماہر ڈرائیور گاڑی کو رستے پہ چلنے والے آدمی کی طرح سنبھالے ہوئے تھا۔ راستہ کی خوبصورتی نے میرے نامعلوم جذبۂ خوف کو کسی قدر معدوم کر دیا تھا ان سماواتی راستوں پر چلنے کی خوشی میں دنیا کے سارے جھگڑے معدوم ہو گئے تھے۔ رفتہ رفتہ راستہ ہموار ہوتا گیا اور بے شمار جھلمل جھلمل کرتی آبشاریں یوں لگتی تھیں گویا پہاڑوں کی دیواروں پر تصویریں بنا دی گئی ہوں۔ زمین کی کونسی چیز ہم تک پہنچ سکتی تھی؟ جب پیاس لگی تو ہم نیچے اتر گئے جہاں چمکتے ہوئے پتھروں پر ایک ندی بہہ رہی تھی ہم نے جی بھر کر برف جیسا ٹھنڈا پانی پیا جو سونے سے بھی زیادہ بیش قیمت تھا۔ تازہ دم ہو کر ہم چل پڑے اور ہمارا سفر تین گھنٹے بعد ایک دریا کے کنارے ختم ہوا جو سورج کی روشنی میں چمک رہا تھا۔ دریا کو عبور کرنے کے لیے ہمارے لیے دو طریقے تھے۔ بالسوں کے بیڑے پر بیٹھ کر یا پھر رسیوں کے پل کے ذریعے۔ دونوں طرح ہم دوسری طرف پنیال کے صدر مقام شیر قیلا پہنچ سکتے تھے۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا ایک دن ایسا بھی آئے گا کہ مجھے تین فرلانگ لمبے رسیوں کے پل پر رینگ کر دریا پار کرنا پڑے

گا۔ یہ کام پر لطف لیکن ساتھ ساتھ خطرناک بھی تھا۔ اور مجھ جیسے شہری کے لیے بہت ہمت کا کام۔

راجہ ہمارا انتظار کر رہے تھے وہ طویل قامت، گورے چٹے، دبلے پتلے اور سکندر اعظم کی نسل سے ہیں۔ انھوں نے گوپنیر کے راجہ سے بغلگیر ہو کر اور مجھے کندھے پہ تھپتھپا کر ہمارا خیر مقدم کیا ہم کسی جاگیردارانہ ریاست میں تھے۔ کیونکہ ہمارے پہنچنے پر لوگ سڑک کے دونوں طرف جمع ہو گئے اور دونوں راجاؤں کے سامنے کورنش بجالائے اور ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیا پھر میرے سامنے تعظیم سے جھکے۔ تمام آنے والوں کا اسی طرح استقبال کیا جاتا ہے۔ نیلی آنکھوں والے لمبے تڑنگے لوگوں کی مسلم ریاست میں یہ استقبال پرانے طریقوں کے عین مطابق تھا۔ دوسرا استقبال اور بھی حیران کن تھا۔ ایک پہاڑی پہ چڑھ کر ہم میدان میں پہنچ گئے جس کے راستہ میں قبرستان پڑتا تھا آنے والوں کے لیے یہ اچھا خاصا تکلیف دہ نظارہ تھا لیکن پہاڑی علاقوں میں زندگی اور موت کو بھی عام چیزوں کی طرح لیا جاتا ہے۔ ہر قبر کے اوپر ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی تاکہ کوئی گھومتا پھرتا فقیر بیٹھ کر آرام کر سکے، قبروں پر پھول تھے نہ ان کے سرہانے کتبے۔ قبرستان سے چمکتا دریا نظر آتا تھا یہ شاید اس نظریہ کا مظہر ہے کہ اس جہاں سے رخصت ہونے والے ان دریاؤں کا شور سن سکیں جہاں کبھی وہ مچھلیاں پکڑا کرتے تھے۔

ایک صحن کے پار ہمیں مہمان خانے میں لیجایا گیا میں ہنفر کے ایک عظیم الشان بنگلہ میں تھی جو خوبصورت باغ کے وسط میں تھا۔ یہ بنگلہ ایک بیڈ روم



پنیال میں دشوار گزار پہاڑی سفر

جہاں دیوان پڑے ہوئے تھے۔ برآمدے اور غسل خانے پر مشتمل تھا اور چاروں طرف پھول ہی پھول تھے۔ کرسیوں کی پشت اور کارنس پھولوں سے ڈھکی ہوئی تھی دیوار بھی پھولوں سے سجی تھیں۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ پنیال کے لوگ مردوں کی نسبت زندہ لوگوں کے لیئے پھول لازمی سمجھتے ہیں۔ آتشدان میں لکڑیوں کا ڈھیر لگا تھا تاکہ شام کو سردی دور کرنے کیلئے آگ جلائی جاسکے۔ کھڑکیوں میں سے درختوں سے ڈھکے ہوتے پہاڑ نظر آتے تھے۔ یہ منظر اتنا حیران کن تھا کہ وقت بے معنی ہو کر رہ گیا تھا۔ شام ہونے سے

پہلے غسل اور گرم چائے زیادہ ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ پنیال میں بجلی نہیں ہے۔ لیکن آتشدان اور لیمپ کی روشنی دل کو بھاتی ہے۔ کھانے کی گھنٹی بجنے پر ہم سب راجہ کے سادگی سے سجے ہوئے محل میں جمع ہوئے۔ کھانا دیکھ کر میں حیران رہ گئی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے کبھی مصالحوں سے تلی ہوئی اتنی عمدہ مچھلی، گوشت اور چاول کھائے ہوں۔ پتوں اور سرخ ٹماٹروں کا عمدہ سلاد تھا۔ پنیال کے لوگ روٹی کی جگہ مکئی کے موٹے موٹے کیک بناتے ہیں جو بے حد لذیذ ہوتے ہیں۔ اور کئی اقسام کا سالن ہوتا ہے دودھ بجید گاڑھا ملتا ہے کیونکہ پنیال میں گائیں بے شمار ہیں۔ تمام اجناسِ خوردنی یہاں پیدا ہوتی ہیں اور دھوپ اور سرسبز چراگاہوں میں پلنے والی گائیں بھینسیں خوب ہٹی کٹی ہوتی ہیں۔ کافی پیتے ہوئے راجہ کی بجید خوبصورت، سرخ و سفید گھنگھریالے بالوں والی بیٹی کو، جس کی حال ہی میں اپنے چچا زاد بھائی سے شادی ہوئی تھی، ہمارے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ صرف اُردو اور کشمیری زبان جانتی تھی لیکن لفاظ اس کے حسن کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ وہ بہت کم عمر معلوم ہوتی تھی...... اس کی عمر صرف پندرہ سال تھی۔ پنیال میں کم عمری میں ہی شادی کرنے کا رواج ہے۔ شادی کے وقت بیشتر دلہنوں کی عمر بارہ سال ہوتی ہے اور دولہا اٹھارہ بیس کے لگ بھگ ہوتے ہیں۔ پنیال میں دلہنوں کو جہیز نہیں دیا جاتا۔ جیسا کہ پاکستان کے دوسرے علاقوں کا رواج ہے۔ اس کے برعکس دولہا گھر والوں کو برتن اور کپڑے پیش کرتا ہے۔ راجہ کی لڑکی اپنے دور کی نمائندہ تھی۔ شادی کرنا اور بچے پیدا کرنا ان کی زندگی میں اہم ترین کام ہے۔ شادی کی رسم ادا ہونے سے پہلے دولہا دلہن ایک دوسرے سے نہیں ملتے۔ قریبی رشتہ دار ہونے کے باوجود وہ مختلف

ریاستوں میں رہتے ہیں اور انھیں آپس میں ملنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ والدین نزدیکی عزیزوں میں رشتہ کا انتخاب کرتے ہیں تاکہ زرخیز زمینیں خاندان میں ہی رہیں یہ رواج اتنا راسخ ہے کہ کوئی اور طریقہ اختیار نہیں ہو سکتا۔ حیرت انگیز طور پر بیاہتا جوڑے عموماً خوش و خرم رہتے ہیں کیونکہ دلہن ایک اہم شخصیت بن جاتی ہے اور گھر کی مالکہ ہوتی ہے۔

راجہ جان عالم جدید دور کے آدمی ہیں انھیں بیٹری سے چلنے والے ریڈیو اور ادب سے رغبت ہے اور اپنے ریڈیو ٹیلیفون سے لطف اٹھاتے ہیں۔ جس کے ذریعے علاقہ کے صدر مقام گلگت سے رابطہ قائم ہے۔ وہ صرف ایک شادی کے قائل ہیں۔ اس زمانہ میں ان کی بیوی دو تین پہاڑ پرے اپنے رشتہ داروں سے ملنے گئی ہوئی تھی۔ ان سے ملنا تو نہ ہو سکا۔ لیکن ہمیں معلوم تھا کہ وہ بالکل جوان ہے۔ راجہ نے ہمیں بتایا کہ شادی کے وقت ان کی بیوی کی عمر صرف چودہ سال تھی۔

اس رات عرصہ بعد پہلی بار میں بالکل بچوں کی طرح سوئی۔ پہاڑوں کی خنک ہوا میں شراب یا خواب آور گولیوں کے بغیر ہی نیند آجاتی ہے۔ ناشتہ کی میز پر چیزوں کا انبار ہوتا ہے۔ مہمانوں سے اُمید کی جاتی ہے کہ وہ کم از کم تین بڑے بڑے انڈے خوبانیاں، گرم گرم دلیہ اور گوشت کا ایک ٹکڑا ضرور کھائیں گے۔ راجہ صاحب چاہتے ہیں کہ لوگ خوب موٹے تازے ہو جائیں۔ ناشتہ کے دوران چند نوجوان لڑکیاں آئیں اور ہمارے سفر کے گرد آلود کپڑے لے گئیں۔ ابھی میں نے تھوڑا سا پھل اور دو انڈے ہی کھائے تھے کہ ہمارے میلے کچیلے کپڑے بالکل بے داغ اور عمدہ استری ہو کر واپس آگئے۔ میں آج تک

نہیں سمجھ سکی کہ یہ کس طرح ہوا۔ شاید مناسب یہی ہے کہ اس پر غور نہ کیا جائے اور صرف مسکرا کر شکریہ ادا کر دیا جائے۔

ناشتہ کے بعد راجہ حسین علی خاں اور میں مقامی عدالت کی کارروائی دیکھنے چلے گئے جو نزدیک ہی صحن میں ہو رہی تھی۔ بالکل غیر رسمی انداز میں ایک شخص پر پڑوسی کی بیوی پر ڈورے ڈالنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جا رہا تھا۔ وہ ان کے گھر ہمیشہ اس وقت جاتا تھا جب خاوند باہر ہوتا تھا وہ کسی دست درازی کا مرتکب نہیں ہوا کیونکہ بچوں نے بھی اس بات کی گواہی دی کہ جب بھی ان کا پڑوسی آتا تھا ان کی ماں تنہا نہیں ہوتی تھی۔ بچوں نے اتنا ضرور بتایا کہ وہ بڑے میٹھے الفاظ میں باتیں کرتا تھا جو ان کے لیے بالکل انوکھے تھے۔

راجہ جان عالم نے ملزم کا بیان سنا۔ "مجھے اپنی بھیڑوں کے بارے میں مشورہ کی ضرورت تھی۔ میں صرف عورت کے خاوند سے ملنے جاتا تھا مگر وہ ہمیشہ باہر گیا ہوا ہوتا تھا۔" راجہ نے اسے تنبیہہ کی کہ بھیڑوں کے بارے میں مشورہ وہ کھیتوں میں لے۔ اپنے پڑوسی کے باورچی خانے میں نہیں۔ اس پر بیس روپے جرمانہ کیا گیا اور پابند امن کر دیا گیا۔ ہر شخص مسکراتا ہوا رخصت ہو گیا۔

پنیال میں جیلیں نہیں ہیں۔ یہاں چور اِکّا دُکّا ہی نظر آئے گا۔ راجہ رحمدلی سے عدل و انصاف کرتے ہیں اور مجرموں کو زیادہ سے زیادہ تیس روپے جرمانہ کرتے ہیں۔ پندرہ ہزار نفوس کی آبادی میں کبھی کبھار قتل بھی ہو جاتا ہے اجو عموماً جذباتی اشتعال کا نتیجہ ہوتا ہے، لیکن شاذ و نادر، اور قاتل کو گلگت بھیجا جاتا ہے۔ جہاں پولیٹیکل ایجنٹ مقدمہ کی سماعت کرتا ہے۔

شادی کے موقعہ پر خوب جشن منایا جاتا ہے جس میں تمام لوگ شرکت کرتے ہیں۔ راجہ بھی شرکت کرتے ہیں اور انھیں ہل اور دوسرے زرعی آلات تحفے میں دیتے ہیں۔ یہ آلات ایسی سرزمین میں بڑے قیمتی سمجھے جاتے ہیں جہاں ہر چیز زمین اور محنت سے پیدا کی جاتی ہے۔

پنیال پاکستان کی ہمالیائی ریاستوں میں امیر ترین سمجھا جاتا ہے۔ یہاں سے ہنزہ، گوپیز اور دوسرے خشک پہاڑی علاقوں کو گندم بھیجی جاتی ہے بیشتر زمین حکمران اور اس کے رشتہ داروں کی ملکیت ہے۔ باقی لوگ خود مختار تاجر، درزی اور بڑھئی ہیں۔ مزارعوں اور راجہ کے ذاتی ملازموں کو کام کے عوض اجناس، کپڑا، طبی امداد اور دوسری چیزوں کے علاوہ مناسب خرچ بھی ملتا ہے۔ پنیال میں کوئی غریب نہیں ہے اور گو ہر شخص اپنے سماجی رتبہ کے مطابق رہتا ہے۔ لیکن پولو کھیلتے وقت سب برابر ہوتے ہیں۔

پولو پنیال کا قومی کھیل ہے ہر روز شام چار بجے نماز کے بعد تمام کام بند ہو جاتا ہے۔ لوگ بینڈ پر تاتاری دھنیں بجاتے ہیں اور بین اور اسکاٹ لینڈ کی موسیقی کے ساتھ کھیل شروع ہوتا ہے۔ آقا اور خادم شانہ بشانہ نہایت مہارت اور چابکدستی سے کھیلتے ہیں۔ گذشتہ پچیس سال سے کوئی بھی پنیال کے لوگوں کو شکست نہیں دے سکا۔ گلگت اور بلتستان کے علاقے میں انھوں نے چاندی کے تمام کپ جیتے ہیں۔ ان لوگوں کو ہلکی پھلکی قمیص اور پاجامہ میں دیکھ کر یقین نہیں آتا کہ ان میں سے بیشتر باورچی، خادم اور دوسرے لوگ ہیں جو کھانے کے وقت آپ کی خدمت کر رہے تھے۔ پولو کھیلتے وقت ہر طرح مساوات

ہوتی ہے اور پنشن پانے والے ملازم بھی جوانوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتے ہیں۔ مہمانوں کو بھی کھیل میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ ایشیا میں پولو سب سے پہلے سولھویں صدی میں مغل بادشاہوں نے شروع کیا۔ یہ صدیوں سے چلا آرہا ہے اور برطانوی دور میں بھی کھیلا جاتا رہا ہے۔ ہنیال میں آج بھی پولو تفریح کا بہترین مشغلہ ہے۔ گھڑ سواری بھی بے حد مقبول ہے اور چھوٹے چھوٹے لڑکے لڑکیاں بھی گھڑ سواری کے ماہر ہیں۔

ہنیال کی زندگی سادہ اور پُر اطمینان ہے اور دریا اور زرخیز زمین وسیلۂ روزگار ہیں۔ دس ہزار فٹ کی بلندی پر یہاں کی آب و ہوا صحت بخش ہے۔ زندگی ایک ہی ڈگر پر چلتی ہے۔ کسان مشینوں کی مدد کے بغیر کاشتکاری کرتے ہیں اور لوگ پیدل یا گھوڑوں پر سفر کرتے ہیں۔ یہاں ابھی سینما گھر تعمیر نہیں ہوئے۔ خوبانیاں بکثرت پیدا ہوتی ہیں اور کھانے کے طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ ہر طرف باغات پھیلے ہوئے ہیں۔ گندم کے کھیتوں میں رنگ برنگ پھول اُگے ہوتے ہیں۔ اس بات پر مجھے اس وقت یقین آیا جب میں نے خود گندم کے خوشوں کے درمیان سے پھولوں کے گچھے توڑے۔ ہنیال کے بچے سرخ و سپید اور بے حد خوبصورت ہوتے ہیں۔ سکول سے آنے کے بعد وہ کھیتوں میں بڑوں کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔ بڑے ہونے پر وہ کوئی ہنر سیکھ لیتے ہیں اور بہت عمدہ کاریگر بن جاتے ہیں۔ ہنیال کے تمام مرد، خواہ وہ چار سال کے ہوں یا چورانوے سال کے۔ گول گول ٹوپیاں پہنتے ہیں اور ان میں ماتھے کے اوپر تازہ پھولوں کا گچھا اٹکا لیتے ہیں۔ یہ بڑا بھلا معلوم ہوتا ہے،

جولائی میں کٹائی کے وقت بہت بڑی دعوت ہوتی ہے اور مرد ایک خاص رقص کرتے ہیں۔ نومبر مویشی خریدنے کا مہینہ ہے۔ سرسبز چراگاہیں بے حد ٹھنڈی ہوتی ہیں۔ مویشی گاؤں میں لائے جاتے ہیں۔ جہاں کسان اپنی اپنی پسند کے جانور خریدتے ہیں۔ اس کے بعد ایک اور دعوت منعقد ہوتی ہے۔ بیشتر تقریبات پنیال کی زراعتی زندگی کے گرد گھومتی ہیں۔ پنیال کے لوگ اپنے گھر رہنا پسند کرتے ہیں۔ گلگت میں ہنزہ اور دوسری ریاستوں کے ڈرائیور، قلی اور کلرک مل جائیں گے۔ لیکن ان میں پنیال کے باشندے نہیں ہوں گے۔ زمینیں زرخیز ہونے کی وجہ سے وہ کہیں اور کام نہیں کرتے انھیں اپنی زمین سے عشق ہے۔

علاقے کی ترقی کے لیے راجہ جان عالم نے تُند رو دریا پر ایک فولادی پل کی تعمیر شروع کرا دی ہے دریا کے کنارے پایا جانے والا پتھر پشتوں کی تعمیر میں استعمال ہو رہا ہے جو فولادی سلاخوں کو سہارا دیں گے۔ تاریخ میں پہلی بار پنیال ایک مستقل پل پر فخر کر سکے گا جس پر سے جیپیں آسانی سے گزر سکیں گی۔ گاڑیاں رکھنے کے لیے پہاڑ کے ایک طرف گیرج تعمیر ہو چکے ہیں۔

راجہ لوگوں کی صحبت پسند کرتے ہیں اور حال ہی میں انھوں نے اپنے مہمان خانے کو کاروباری ادارے میں تبدیل کر دیا ہے۔ کھانے کی تمام چیزیں راجہ کی اپنی زمینوں پر پیدا ہوتی ہیں اور گوشت ان کے ذاتی مویشیوں سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس لیے وہ نہایت کم خرچ پر بہت سی چیزیں مہیا کر سکتے ہیں۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کہ کیا ایک آدمی کے لیے پچیس روپے یومیہ کرایہ بہت زیادہ ہوگا جبکہ سات سال سے کم عمر کے بچے مفت ٹھہر سکیں گے اور چودہ سال تک

کے لڑکوں کا آدھا کرایہ ہو گا۔

انھوں نے کہا "میرے مہمانوں کا پرتپاک خیر مقدم کیا جائے گا۔ انھیں بہترین کھانا ملے گا۔ اور کرایہ میں کپڑوں کی دھلائی اور گھڑ سواری بھی شامل ہو گی۔ میں خود اپنے مہمانوں کے ساتھ گھنے جنگلوں میں جایا کروں گا جہاں چیتے گھومتے پھرتے ہیں ہمارے دریا مچھلیوں سے بھرے ہوتے ہیں اور تیراکی کا لطف ہر شخص اٹھا سکتا ہے۔ پیدل چلنے والوں کے لیے عمدہ راستے ہیں۔ لڑکوں کے لیے ہمارے پاس ٹٹو ہیں اور پانی میں کھیلنے کے لیے اتھلی ندیاں۔ چھوٹے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے بے شمار آیائیں ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے — کیا پچیس روپے بہت زیادہ ہیں؟" میں نے کہا میرے خیال میں تو یہ نہایت مناسب ہے۔ پھر میں نے ایک گھنٹہ راجہ کے ساتھ نیا بنگلہ دیکھنے میں گذارا جو سرسبز ڈھلوان پر تعمیر ہو رہا تھا۔ بڑھئی اور معمار کام کرتے ہوئے گا نا گا رہے تھے۔ ہر چوٹ کے ساتھ اُن کی ٹوپیوں میں لگے ہوئے پھول اوپر نیچے ہلتے تھے۔

چاروں طرف سے عظیم ہمالیہ سے گھرے ہوئے اس علاقہ میں ایک عجب ملکوتی احساس ہوتا ہے جو ہنیال کا خاصہ ہے۔ لوگوں میں ایک طرح کی سنجیدگی ہے جو آنے والوں کو بھی متاثر کرتی ہے۔ خمدار راستوں پر لوٹتے ہوئے ہم نے گھنٹیوں کی آواز سنی اور پھر گھوڑوں کا ایک قافلہ ہمارے سامنے آگیا۔ گلاب کی بھینی بھینی خوشبو، چنار کی مخصوص بو اور لکڑی کے دھوئیں میں مدغم ہو رہی تھی۔

میرے خیال میں دنیا بھر میں پُرسکون اور ساتھ ساتھ پُرلطف چھٹیاں گذارنے کے لیے ہنیال ایک غیر معمولی مقام ہے۔

جب میں دوسری بار پنیال گئی تو ترقی کے لیے راجہ جان عالم کا ایک خواب پورا ہو چکا تھا جو آس پاس کے علاقہ میں بیسویں صدی کی واحد علامت ہے۔ اُن کی ذاتی نگرانی میں دریا کے اوپر فولادی پل تعمیر ہو چکا ہے۔ پل کو سہارا دینے والے ستون فتح مندی کا نشان ہیں اور ماحول کا حصّہ لگتے ہیں۔ یہ ستون ٹھوس پتھر کے بنے ہوئے ہیں جو پنیال کے پہاڑوں سے نکالا گیا ہے آپ کی جیپ نہایت تیزی سے پُر خطر راستہ طے کرتی ہوئی منٹوں میں راجہ کے محل کے دروازے پر جا پہنچتی ہے۔ گو بہت سے سیاحوں کو یہ کہتے سنا گیا ہے "مجھے لکڑی کے بیڑے اور رسیوں کے پل کی کمی محسوس ہوتی ہے۔"

گوپیز ازلی سرزمین

گوپیز! آپ نے کبھی اس کے بارے میں سُنا ہے؟ ہمالیہ میں بلندی پر واقع ایک عجیب وغریب پہاڑی ریاست کوہ غزارہ کا صدر مقام گوپیز یوں لگتا ہے گویا یہ بھی پھولوں اور درختوں کے ساتھ پیدا ہوا ہو۔

یہاں دس ہزار صحت مند لوگ رہتے ہیں اور گزشتہ بارہ مہینے میں یہاں کوئی نہیں مرا۔ لہٰذا آپ اسے "ازلی سرزمین" کہہ سکتے ہیں۔ مقامی ڈاکٹر جو کسی بڑے شہر سے آیا ہے، بے کار بیٹھا مکھیاں مار رہا ہے۔ وہ روزانہ صبح اپنا کلینک کھولتا ہے لیکن ہفتے ہو گئے اس کے پاس کوئی مریض نہیں آیا۔ پہاڑ کی ہوا اتنی صحت بخش ہے کہ لوگ ہمیشہ تندرست رہتے ہیں اور بالکل اپنے آباؤ اجداد کی طرح زندگی گزارتے ہیں۔ جب میں ڈاکٹر کے پاس پہنچی تو وہ خوش ہو گیا۔ میری انگلی زخمی تھی اور گلے میں خراش پیدا ہو گئی تھی، لیکن میں اس کے اندازے سے کہیں پہلے ٹھیک ہو گئی۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ پہلے کسی نے اتنی ہمدردی اور خلوص سے میرا علاج کیا ہو۔ اس نے مشفق ماں کی طرح میری خبر گیری کی۔ یہی گوپیز کا دستور ہے۔

یہاں امیر اور غریب کا مسئلہ نہیں ہے۔ ہر شخص کے پاس اپنی زمین ہے جہاں وہ اجناس کی کاشت کرتا ہے اور اپنی بھیڑ بکریاں اور گائیں چراتا ہے۔ باغات انگور، خوبانی

سیب، ناشپاتی، آم اور سردے سے بھرے ہوتے ہیں۔ ان کی کھانے پینے کی ضروریات پیداوار کے مقابلے میں بہت کم ہیں جو بچ جاتا ہے آس پاس کے دیہاتوں میں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ یہ لوگ ابھی جام بنا کر پھلوں کو محفوظ کرنے کے طریقہ سے آشنا نہیں گو انگور کی شراب بڑی مقدار میں کشید کی جاتی ہے۔ میں نے انہیں بتانے کی کوشش کی کہ فالتو پیداوار سے بہت کچھ کیا جا سکتا ہے لیکن انھوں نے بس سر ہلا دیا۔ پھر میں نے سیبوں اور خوبانیوں سے ایک چیز تیار کی، اس پر نیبو کا عرق چھڑکا اور بیل سے تازہ توڑے ہوئے ہرے ہرے انگور ڈال دیئے یہ لذیذ چیز تھی۔ ڈاکٹر اور اس کی بیوی نے اس کی بہت تعریف کی اور تھوڑی سی اپنے بچے کو بھی کھلائی۔ وہ اور مانگتا رہا کیونکہ یہ بچے کے کھانے سے مشابہ اور اشتہا بڑھانے والی چیز تھی۔ لیکن گوپیز کے لوگوں کو یہ چنداں نہ بھائی۔ "کتنی عجیب بات ہے" انھوں نے کہا "بھلا کبھی سیبوں کو بھی ابالتے سنا ہے؛ ہم تو پھل ہمیشہ قدرتی حالت میں کھاتے ہیں" انھوں نے اسے چکھا تک نہیں۔

سیاحوں کے آنے پر بڑی خوشی منائی جاتی ہے۔ تمام لوگ اپنا کام چھوڑ چھاڑ اُن کے گرد خوش آمدید کہنے جمع ہو جاتے ہیں گوپیز کے چھوٹے سے خوبصورت بازار میں سیر کرتے ہوئے جہاں ایک نیچی سی پہاڑی پر آگے سے کھلی دکانیں بنی ہوئی ہیں، بہت سے لوگ خریدار کی تعریف اور ہمت افزائی کے لیے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ اگر قیمت زیادہ معلوم ہو تو دکاندار کا مذاق اڑاتے ہیں اور اگر وہ سمجھتا ہے کہ زیادہ پیسے ہتھیانے میں کامیاب ہو جائے گا تو پھر خدا ہی اس کا مالک ہے۔ اس کے برعکس اگر سیاح کوئی ایسی چیز خریدنا چاہے جو فروخت کے لیے نہیں اور دکاندار کی ذاتی ملکیت ہے تو پھر

جلدی سے تین چار لوگ سر جوڑ کر بیٹھتے ہیں اور وہ چیز دم بخود خریدار کو تحفۃً پیش کر دی جاتی ہے۔ یہی گوپیز کا دستور ہے۔

عوام راجہ حسین علی خاں کے نقش قدم پر چلتے ہیں جو یہاں کے گورنر اور کوہ غزار کے حکمران ہیں۔ راجہ حسین علی خوبصورت خدوخال کے مالک، بارعب اور سکندرِ اعظم کے سپاہیوں کے اصل جانشینوں میں سے ہیں۔ تنومند اور یُونانی نقوش والے گوپیز کے لوگ بھی اُسی نسل سے ہیں۔ وہ اپنے تمام مسائل لے کر راجہ کے پاس آتے ہیں اور نزدیک آکر عقیدت سے اُن کے ہاتھ کو بوسہ دیتے ہیں۔ ایک روز وہ مجھے اپنا محل دکھا رہے تھے کہ ایک بُوڑھی عورت روتی دھوتی آئی۔ اس کے لڑکے نے اپنے بھائی کے نام منی آرڈر بھیجا تھا کیونکہ اس کا خیال تھا کہ ماں عزیزوں سے ملنے دُور گئی ہُوئی ہے۔ اُس کا بھائی اس اثنا میں چلا گیا تھا اور ماں واپس آگئی تھی۔ پوسٹ ماسٹر نے عورت کو منی آرڈر دینے سے انکار کر دیا تھا کیونکہ یہ خلافِ قانون تھا۔ چنانچہ وہ اپنی التجا لے کر راجہ کے پاس چلی آئی۔ وہ قانُون کی خلاف ورزی کی اجازت تو نہیں دے سکتے تھے لیکن اُنھوں نے سسکیاں بھرتی بڑھیا کو کافی رقم قرض کے طور پر دے دی کہ وہ منی آرڈر ملنے تک اپنا کام چلا سکے! بڑے شہروں میں بھلا کون گورنر سے قرض مانگ سکتا ہے یا اس طرح کی بپتا سُنا سکتا ہے؟ یہی گوپیز کا دستُور ہے۔

ہمالیائی علاقوں کے گورنر بالکل الگ نسل سے ہیں۔ یہ لوگ بادشاہوں اور شہزادوں کی پشتوں میں سے ہیں۔ اِن کا خُون بالکل خالص ہے کیونکہ یہ ہمیشہ انتہائی قریبی رشتہ داروں میں شادیاں کرتے ہیں جن سے ان کے آباواجداد کا حسب نسب ملتا ہو۔ راجہ حسین علی کسی انگریز بادشاہ کی شبیہہ لگتے ہیں اور ان کی نیلی آنکھوں میں ایک مستقل چمک ہے۔

وہ شاہانہ وقار سے ٹیکساس کے گڈریوں (COWBOY) کی طرح گھڑ سواری کرتے ہیں۔ ان کی دو بیویاں ہیں۔ لڑکے دُور شہروں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ لڑکیاں گھر پر رہتی ہیں اور خاندان کی بڑی بوڑھیوں سے سگھڑ بیوی بننے کی تعلیم لیتی ہیں ایسے علاقہ میں جہاں عورتوں کے کام کرنے کو اچھا نہیں سمجھا جاتا یہ تعلیم دُوسری پڑھائی کی نسبت زیادہ ضروری ہے۔ شادیوں میں تمام لوگ شرکت کرتے ہیں۔ دولہا کا انتخاب والدین ہی کرتے ہیں۔ شادی شدہ جوڑے ہمیشہ خوش و خرم رہتے ہیں۔ بھرپُور زندگی اور صحت بخش ہوا طمانیت پیدا کرتی ہے۔ کھیتوں پر جانے کے لیے سویرے اُٹھنے کا معمول لازمی ہے۔ گھر میں بیوی بچّوں کے ساتھ مصروف رہتی ہے اور گھر سنبھالتی ہے جس کی وہ مالکہ ہے۔ یہ سادہ زندگی سالہا سال سے یکساں چلی آ رہی ہے۔ کوہِ غزار کے لوگ سچّے مُسلمان ہیں قرآنِ پاک کے احکامات کی تعمیل کرتے ہیں...... اور مسجد میں پنج وقتہ نماز ادا کرتے ہیں۔

یہ علاقہ گلگت ایجنسی کا حصّہ ہے اور دشوار گزار پہاڑی راستے کے ذریعہ گلگت سے ملا ہُوا ہے۔ اڑسٹھ میل کا یہ سفر جیپ، خچر یا گھوڑے پر طے کیا جا سکتا ہے۔ سارا راستہ بے حد خوبصورت اور دلکش ہے۔

گوپیز میں ریڈیو ٹیلیفون کے ذریعے (جو یہاں بیسویں صدی کی سہولتوں کی واحد نشانی ہے) راجہ آس پاس کی ریاستوں سے رابطہ قائم رکھتے ہیں۔ سال میں کئی بار راجہ حسین علی کوہِ غزار کے تمام دیہاتوں کا دَورہ کرتے ہیں اور عوام سے مل کر ان کی مشکلات دُور کرتے ہیں۔ راجہ ایک زیرک اور ہمدرد ثالث کی طرح حکومت کرتے ہیں۔ گوپیز میں راجہ کے دن کی ابتدا کونسل (جسے عوام منتخب کرتے ہیں) کے اجلاس

سے ہوتی ہے جس میں مختلف مسائل پر بحث کی جاتی ہے اور ان پر فوری توجہ دی جاتی ہے۔ کوہِ غزار کی واحد جیل گوپیز میں ہے۔ اس میں صرف تین قیدیوں کی جگہ ہے اور یہ ہمیشہ خالی پڑی رہتی ہے کیونکہ یہاں جرائم کا نام ونشان تک نہیں اگر کوئی شخص اپنے پڑوسی کی زمین ہتھیا کر استعمال میں لے آیا ہے تو یہ چوری ہے۔ اس کی سزا جیل خانہ نہیں، اُسے زمین مع سود کے واپس کرنی پڑتی ہے۔ راجہ کی بیوی (جنہیں رانی کہا جاتا ہے) عورتوں سے ملتی ہیں اور ان کی ضروریات کو پُورا کرتی ہیں۔ اگر کسی کا خاوند مر جاتے تو پڑوسی یا راجہ کی کونسل تمام ذمہ داریاں سنبھال لیتی ہے اور ہر چیز کا انتظام کرتی ہے۔ یہاں لاوارث خاندان نہیں ہیں آگ لگنے کی صورت میں اڑوس پڑوس کے لوگ پہاڑوں سے پتھر ڈھولاتے ہیں۔ اور نیا گھر تعمیر کر دیتے ہیں۔

گوپیز کی مقامی زبان شینا ہے لیکن ایک تہائی کے قریب لوگ گزارے کے لائق انگریزی بول لیتے ہیں۔ اسکولوں میں چوتھی کلاس سے انگریزی پڑھائی جاتی ہے دوسرے مضامین اُردو میں ہوتے ہیں۔ اس دُور دراز علاقے میں مخلوط تعلیم حیران کن چیز ہے۔ گو بہت سی عورتیں پردہ کرتی ہیں لیکن لڑکے اور لڑکیاں اکٹھے تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ گوپیز کے بچے بے حد خوب صورت ہوتے ہیں —— صاف کھلتا ہوا رنگ، سُبک جسم اور چمکدار آنکھیں، وہ بڑے جوش وخروش سے اپنی معلومات کا اظہار کرتے ہیں اور لوگوں کو اپنی طرف متوجہ پا کر فخر محسوس کرتے ہیں۔ اسکول ایک پہاڑی پر واقع ہے۔ دُوسری پہاڑی پر (گوپیز میں بے شمار پہاڑیاں ہیں) پھولوں کے درمیان گھرا ہوا ڈاکخانہ اور تار گھر ہے۔ یہاں ڈاک ریل اجد جیپوں کے ذریعہ آتی ہے نہ ہوائی جہاز ڈاک کے تھیلے گراتے ہیں۔ زندگی بہت پیچھے لوٹ گئی ہے۔ ہرکارہ آٹھ میل کا فاصلہ نہایت

تیزی سے طے کرتا ہے اور پھر رُک کر مہر بند تھیلے دُوسرے ہرکارہ کے حوالے کر دیتا ہے۔ یہ ہرکارہ پھر آٹھ میل چلتا ہے اور یہ سلسلہ گلگت آنے تک جاری رہتا ہے۔ یہاں پہنچ کر پھر جدید ذرائع استعمال ہوتے ہیں اور جہاز کے ذریعے ڈاک مختلف مقامات کو بھیجی جاتی ہے۔

گوپیز میں جوتے خریدنا اچھا خاصا ہمّت کا کام ہے۔ جوتے موٹے چمڑے کے بنائے جاتے ہیں اور انہیں بانس کی پتلی پتلی تیلیوں سے سجایا جاتا ہے۔ ہوا سے چمڑا سخت ہو جاتا ہے اور پہلی بار جوتا پہننا کافی جوکھوں کا کام ہے۔ دکاندار کی مدد سے میں نے بھی ایک جوڑا خریدا۔ اس کے طور طریقے سنڈریلا کی بہنوں سے ملتے جُلتے تھے۔ اس نے جُوتے کے پنجے پر ہلکے سے ہتھوڑی سے چوٹ لگائی تاکہ میرا پاؤں اندر پھسل جائے۔ اگر جوتا ٹھیک ہے پھر تو چڑھ جائے گا لیکن اگر سائز مناسب نہیں تو پھر آپ کی چیخ نکل جائے گی۔ بہرحال، دکاندار ہمیشہ اتنے بڑے سائز کا انتخاب کرتا ہے کہ تکلیف کا احساس محض خیالی ہوتا ہے۔

جب سیاح گوپیز آتے ہیں تو راجہ کے گویّے شام ڈھلے ہی وسیع میدان میں جمع ہو جاتے ہیں اور موسیقی سے مہمانوں کا سواگت کرتے ہیں جو بیگ پائپ (BAGPIPE) سے ملتی ہے۔ اس کا نام "وبانسرا موسیقی" ہے اور مقامی بنے ہُوئے سازوں پر بجائی جاتی ہے جنہیں ستار کہتے ہیں۔ یہ ساز منڈولن سے ملتا جُلتا ہے۔

گوپیز میں آرام اور تفریح کو بھی یکساں اہمیت حاصل ہے قومی کھیل پولو روزانہ کھیلا جاتا ہے جس میں آقا اور خادم شانہ بشانہ حصّہ لیتے ہیں۔

گوپیز میں سرسبز ڈھلانوں کے دامن میں پنڈر جھیل بہتی ہے جو مچھلیوں سے بھری

ہوتی ہے۔ اِن کی رنگت سُنہری ہے اور کھانے میں بے حد لذیذ ہیں۔ یہاں مچھلی پکڑنے اور کھانے کا لُطف آ تا ہے۔ گھوڑے رسل و رسائل کا اہم ذریعہ ہیں اور لوگ دُور دراز علاقوں میں گھوڑوں پر پکنک منانے جاتے ہیں۔

مَیں راجہ کے ذاتی بنگلہ میں ٹھہری تھی جو گوپیز کے پُل سے صرف پانچ میل دُور ایک چھوٹے سے گاؤں میں واقع ہے گاؤں کا نام آبِ حیات ہے۔ ہم گھوڑوں پر نشیبی پہاڑی راستوں کو طے کر کے وہاں پہنچے۔ بنگلہ ایک چوٹی پر واقع ہے۔ اس میں چار کمرے اور بڑے بڑے آتش دان ہیں اور چاروں طرف پھول کھلے ہُوتے ہیں۔ پھلوں کے تناور درختوں کا سایہ پھیلا ہُوا ہے اور پُرشکوہ پہاڑ دلفریب پس منظر پیش کرتے ہیں۔ جب شہزادہ صدالدین خاں اور شاہ ایران کے بھائی یہاں آتے تو وہ اسی بنگلے میں ٹھہرے تھے اور اس کی خوبصورتی سے مسحور ہو گئے تھے۔ سچ پُوچھیے تو یہ جگہ ازلی دلکشی کی مالک ہے۔

گوپیز میں شکار کی کُھلی اجازت ہے اور یہ لوگوں کا پسندیدہ مشغلہ ہے۔ برفپوش پہاڑوں کے درمیان بلندی پر ایبکس (IBEX) گھُومتے پھرتے ہیں جن کی اُونی کھال نہایت قیمتی ہوتی ہے۔ گوپیز کے لوگ اس سے کپڑا بُنتے ہیں جو بالکل انگورا اُون کی طرح لگتا ہے۔ ایبکس بکری سے ملتا جلتا جانور ہے جو موٹا تازہ ہوتا ہے۔ یہ ٹھنڈے علاقوں میں رہتا ہے اور کبھی میدان میں نہیں اُترتا۔ اکثر برفانی چیتے بھی مل جاتے ہیں اور انہیں علاقوں میں پکڑے جاتے ہیں۔ شکاریوں کو اپنا شکار ڈھونڈنے کے لیے پہاڑیوں پر چڑھنا پڑتا ہے۔ گوپیز میں چڑھائی کا لُطف سارا سال آتا ہے اور گرمیوں میں تیراکی کا حظ بھی اُٹھایا جا سکتا ہے۔ یہاں مارچ سے اکتوبر تک گرمی رہتی ہے اس کے بعد موسم بے حد سرد ہو جاتا ہے اور تمام لوگ ایبکس کے اُون سے بُنے ہُوتے لمبے لمبے چغے پہنتے ہیں۔ اس

لباس کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ فرغل نما ہوتا ہے۔ اس کی آستین دو گز لمبی ہوتی ہیں اور نیچے آکر صرف چار انچ رہ جاتی ہیں۔ بازو بالکل ڈھکے رہتے ہیں اور آستین کا سرا ہتھیلی کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے جس سے بے حد گرمائی ملتی ہے۔ اور انگلیاں بھی آزادانہ حرکت کر سکتی ہیں اس قدیم علاقہ میں یہ بہت بڑی نعمت ہے۔

میں نے یہاں کسی شخص کو اداس یا روتا ہوا بچہ نہیں دیکھا۔ مسرت گوپیز کی فضا میں رچی ہوئی ہے اور ہر شخص اتنا ہنستا ہے کہ یہ کھیل تماشہ کی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔ ہماری جدید تہذیب سے بہت دور، یہ لوگ اپنے آپ کو امیر کبیر سمجھتے ہیں کیونکہ پُرخلوص اسلامی جمہوریہ پاکستان کے زیرِ سایہ، کوہِ غزار کے پہاڑی علاقے میں ان کی زمین تمام ضروریات کو پورا کرتی ہے۔

تاریخی ہنزہ

بہت کم لوگوں کو علم ہے کہ سلسلہ ہمالیہ میں بلندی پر واقع پہاڑی ریاست ہنزہ جہاں کے لوگ سدا جوان معلوم ہوتے ہیں اور ماحول کسی تصوراتی مملکت کا لگتا ہے، اپنے اہم جغرافیائی وقوع کی وجہ سے آزاد دُنیا کے لیے نہایت اہم حیثیت رکھتا ہے۔

پاکستان ہنزہ ریاست کی سرحدوں پر افغانستان، رُوسی ترکستان اور چینی صوبہ سنکیانگ سے گھرا ہوا ہے۔ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ برِصغیر پاک وہند پر ہمالیہ کے انہیں حصّوں سے حملے ہوتے تھے اس طرح ہنزہ پاس پر برِصغیر کے لیے پاکستان کی حیثیت ایک حفاظتی ڈھال کی سی ہے۔

چند سال اُدھر کی بات ہے انہیں پہاڑوں میں ایک حکمران محل میں اپنے خاندان کے ساتھ رہتا تھا۔ بلندی پر واقع، بستی میں یہ محل بے حد خوبصورت تھا اور ہر کھڑکی سے برف پوش پہاڑ اور برف کے تودے نظر آتے تھے۔ یہاں اس قدر خاموشی تھی کہ محل پہنچنے سے پہلے سیّاح سوچتے تھے "یقیناً یہی وہ جگہ ہے جہاں شہزادی سوتی ہوئی ہے اور کوئی شہزادہ اُسے جگانے نہیں آیا ہے۔ یا پھر ساتوں بونوں نے سنو وائٹ کو چھپا دیا ہے کہ وہ تمام تکالیف سے محفوظ رہے۔ ان دشوار گزار پہاڑی راستوں پر کوئی انسان کس طرح آسکتا ہے؟" گو محل اور اس کے اِردگرد کی ہر چیز افسانوی اور

الف لیلےٰ کی کہانیوں کی طرح معلوم ہوتی تھی، لیکن یہ اصلیت تھی۔ جب بادشاہ اتنی بلندی پر سخت سردی میں رہتے رہتے اُکتا گیا تو وہ نیچے اُتر آیا اور آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر کریم آباد میں ایک نیا محل تعمیر کرایا اور اس پر جلی حروف میں 'خوش آمدید' لکھوا دیا۔

اصلی استقبال غازیِ ملت جنرل میر محمد جمال خاں کی طرف سے ہوتا ہے جو ہنزہ کے میر ہیں اور اس چھوٹی سی ریاست پر بادشاہ کی طرح حکمرانی کرتے ہیں۔

میر جمال خاں وجیہہ اور تنومند آدمی ہیں۔ وہ ہنزہ میں ہاتھ سے بنے ہوئے کپڑے کے سُوٹ پہنتے ہیں جس کا شمار دُنیا کی بہترین ٹوئیڈ میں ہوتا ہے۔ میر جمال کا رہن سہن اور طریق کار جدید تہذیب کے عین مطابق ہے۔ دشوار گزار راستوں کے ذریعے جو پہاڑوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں، عوام کی آسائش کی تمام چیزیں جیپوں اور خچروں پر یہاں لائی جاتی ہیں۔ میر صاحب ہنزہ میں 'نیشنل جیوگرافک' (NATIONAL GEOGRAPHIK) کے واحد خریدار ہیں جو مہینے میں ایک بار یہاں جہاز کے راستے آتا ہے وہ اپنے مہمانوں کے لیے بہت سے رسالے اور کتابیں بھی منگاتے ہیں۔ ان کی رہائش گاہ ایک شاندار قلعہ کی طرح ہے اور بیش قیمت فرنیچر سے آراستہ ہے۔ ان کی مہمان نوازی اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے۔ تمام آنے والے لوگ یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ شاہی مہمان ہیں۔ وہ موسیقی اور رقص سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور بانسری، ڈھول اور ستار پر مشتمل بینڈ دُھنیں اُڑاتا رہتا ہے۔

ہنزہ گلگت ایجنسی کا حصّہ ہے اور اس پر پاکستان کا پرچم لہراتا رہتا ہے۔ ہنزہ کی سرحدیں افغانستان، رُوسی ترکستان اور چینی ترکستان سے ملتی ہیں۔ عہدِ رفتہ میں وسطی ایشیا کا مرکز ہونے کی وجہ سے ہنزہ تجارتی شہر کی حیثیت سے مشہور تھا۔ ہمسایہ

ملکوں میں لاکھوں روپیہ کی تجارت ہوتی تھی۔ اس کی سرحدوں پر اکثر قافلے لُوٹ لیے جاتے تھے اور اسی قسم کی بہت سی مشکلات بے شمار قافلوں کے ساتھ پیش آتی تھیں یہ جنگجُو لُٹیرے بے حد وفادار تھے اور ۱۸۹۱ء میں جب برطانوی فوجوں نے ہنزہ پر حملہ کیا تو اس سے برسرِ پیکار رہے۔ یہ شمالی تجارتی راستے اَب بند ہو گئے ہیں خرید فروخت اور لُوٹ مار ختم ہو گئی ہے اور اَب ہنزہ پُرامن مقام ہے جہاں سادہ لوح اور پُرخلوص لوگ رہتے ہیں اور اپنی زرخیز زمین کی کاشت پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ یہاں فالتو پیداوار نہیں ہے اور ضرورت کی دُوسری چیزیں مثلاً نمک اور کپڑا وغیرہ گلگت کے راستے لایا جاتا ہے۔ تیز رو دریاؤں سے کافی فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے لیکن ابھی تک پانی کو صرف ایک قدیم طرز کے آٹے کی مل کے لیے کام میں لایا گیا ہے جو پتھر کے بڑے سے پہیئے سے چلتا ہے۔ ہنزہ کے لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور گندم، جَو اور خوبانیوں کی کاشت کرتے ہیں۔ ان لوگوں کا ایک اور پیشہ تیز رو ندیوں سے سونا تلاش کرنا ہے جو کافی سُود مند ثابت ہُوا ہے۔ سونا ڈھونڈنے والے لوگ گلگت اور آس پاس کی چھوٹی ریاستوں سے آتے ہیں۔

ہنزہ کی عورتیں ٹوپیوں اور کپڑے پر بڑی خوب صورت کشیدہ کاری کرتی ہیں۔ یہ چیزیں اتنی دلکش ہوتی ہیں کہ سیّاح اور باہر سے آنے والے تاجر انہیں خریدنا چاہتے ہیں لیکن وہ صرف اپنے ذاتی استعمال کے لیے سلائی کرتی ہیں۔

ہنزہ کی معیشت میں خوبانیاں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ سارا علاقہ جو تقریباً نو ہزار فٹ ہے، دریائے ہنزہ، گلگت، شیوک اور سندھ کی نہروں سے سیراب ہوتا ہے۔ خوبانی ہنزہ کی اہم فصل ہے اور آلو کے لاتعداد کھیتوں کی طرح کثیر مقدار

میں بوئی جاتی ہے۔ دوسرے پھلوں میں سیب، ناشپاتی، آڑو، شہتوت اور بیر بکثرت ہوتے ہیں۔ پھولوں سے بھرے باغ سنگلاخ پہاڑوں کے پس منظر میں بڑا دلفریب نظارہ پیش کرتے ہیں۔ گرمیوں میں درختوں سے تازہ خوبانیاں اُتار کر کھائی جاتی ہیں۔ سردیوں میں خشک کر کے استعمال کیا جاتا ہے اس کی گٹھلی کی گری بادام کا لطف دیتی ہے۔ اس کو پیس کر کیک یا روٹی بنائی جاتی ہے جو بے حد لذیذ ہوتی ہے۔ خوبانی کی گری سے تیل بھی نکالا جاتا ہے جس کے استعمال سے لوگوں کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑتا ہے وہ اپنی عمروں سے بہت کم معلوم ہوتے ہیں۔ گھنی داڑھیوں اور مضبوط ہاتھوں والے نوّے سالہ بوڑھے محض پینسٹھ سال کے دکھائی پڑتے ہیں۔ سادہ زندگی، سادہ خوراک، پھلوں کے قدرتی وٹامن اور تازہ خنک ہوا انہیں بہار کے پھُولوں کی طرح سدا جوان رکھتے ہیں۔

ہر سال جنوری میں ہنزہ کے لوگ فصل بونے کا تہوار مناتے ہیں اور بیجوں کے ساتھ سونے کی گرد ملائی جاتی ہے۔ ساتھ ساتھ لوگ اچھے موسم کے لیے دُعائیں مانگتے ہیں۔ اگر سال کے شروع میں آسمان ملگجا ہو تو قحط سالی کا خطرہ ہوتا ہے۔ مطلع صاف اور آسمان نیلگوں ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ دھوپ نکلے گی۔ پگھلتا ہُوا برف اور تیز رو ندیاں پہاڑیوں سے بہہ کر نیچے وادی میں پہنچتی ہیں اور خوبانیوں کے باغات اور کھیتوں کو سیراب کرنے والی نہروں کی آواز بڑی بھلی معلوم ہوتی ہے۔

ہنزہ کے لوگ بڑے پُرخلوص اور دوست نواز ہیں۔ گاؤں میں پھرتے ہُوئے خلوص کی گرمی، مسرت اور گہری دلچسپی کا احساس ہوتا ہے۔ لوگ سیاحوں کا پیچھا کرتے ہیں اور اپنا کھیل چھوڑ چھاڑ کر ان کے پیچھے لگ لیتے ہیں۔ پھر دوستانہ

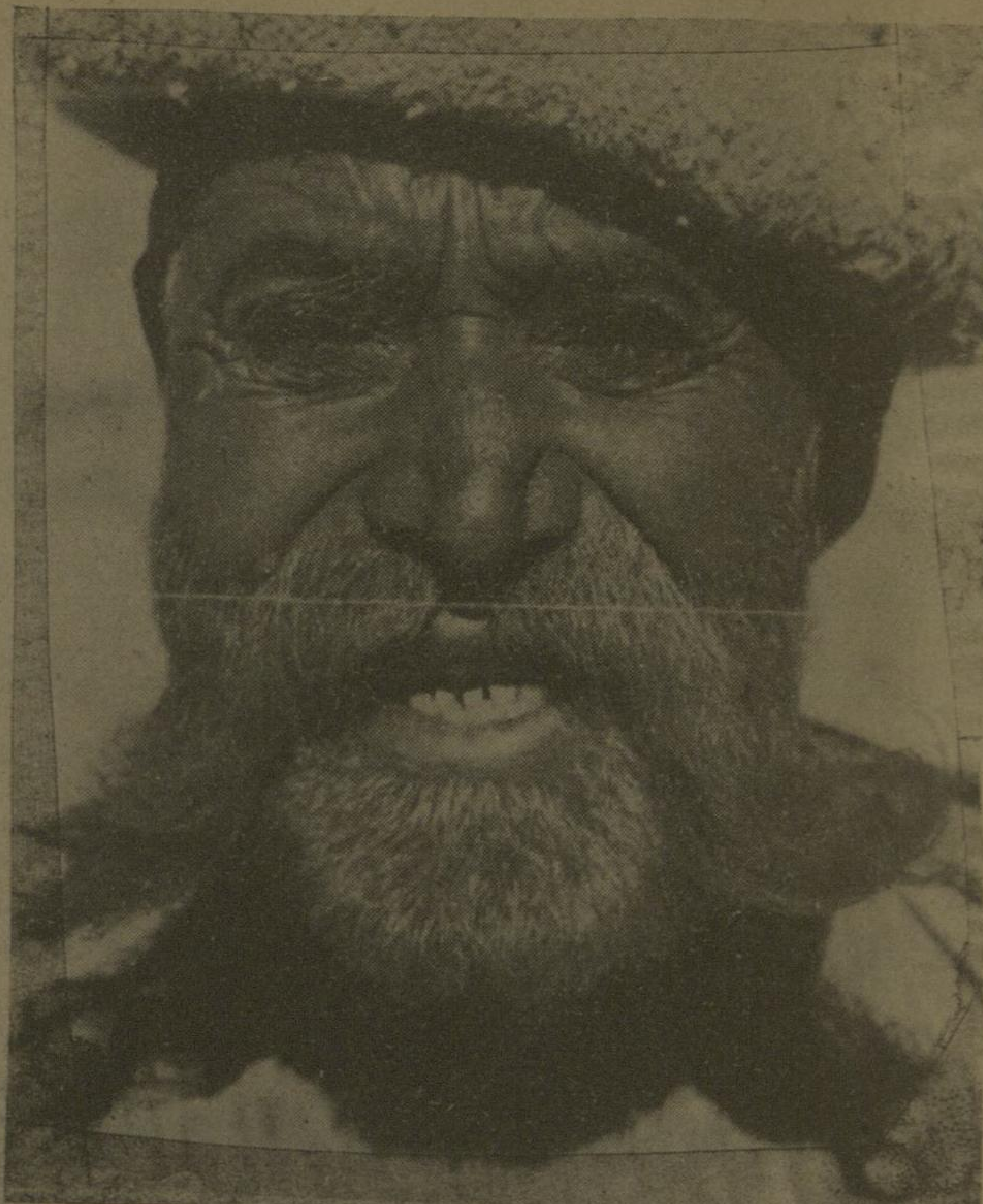
باتیں شروع ہو جاتی ہیں" آپ کہاں سے آئے ہیں؟ کیا ہم آپ کو پسند ہیں؟ آپ ہمارے ساتھ سیر کریں گے؟ آپ ہمارے ساتھ پولو کے میدان چلیں گے؟"

دُوسروں کو خُوش کرنے کا یہ جذبہ دیکھ کر آپ کا دل چاہتا ہے کہ انہیں اُٹھا کر سینے سے چمٹا لیں۔ لوگوں کی خونخوار فطرت کے بارے میں تمام باتیں جھوٹی ہیں۔ ہنزہ کے لوگ پٹھانوں سے مختلف ہیں کیونکہ یہاں کی زمین زیادہ زرخیز ہے اور کاشت کاری آسان ہے۔

یہ لوگ مضبوط، توانا اور خوبصورت ہیں۔ جرائم کا نام ونشان تک نہیں۔ ہنزہ میں پولیس نہیں ہے۔ تمام تنازعوں کا فیصلہ میر کرتے ہیں۔ جُرم کی پاداش میں مجرم کو پہاڑوں میں ایک دُور دراز جگہ شمشال بھیج دیا جاتا ہے۔ اس تنہائی کا تصوّر ہی فاسد ارادوں کو دُور کر دیتا ہے اور خاندان سے بچھڑنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔ ہنزہ والوں کی قابلِ فخر روایات پر عزتِ نفس کی چھاپ ہے۔ اگر کسی کے نام پر ذرا بھی حرف آئے تو وہ فوراً بدلہ لے لیتا ہے۔ لہٰذا زنا کاری کا یہاں نام ونشان نہیں اور اگر کبھی اس کا ارتکاب ہو تو بڑی سخت سزا ملتی ہے۔

ہنزہ کے لوگ بڑے پُرخلوص ہیں۔ اگر کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو تمام پڑوسی بچوں کی پرورش میں مدد کرتے ہیں۔ اس کی زمین کی نگہداشت ہوتی ہے اور ہر سال بہار میں نئی فصل کی کاشت ہوتی ہے۔ پھر فصل کاٹ کر جمع کی جاتی ہے۔ اس طرح ہر معاملہ میں اس عورت کی مدد کی جاتی ہے۔

ہنزہ کا حکمران خاندان چھ سو سال سے زیادہ پُرانا ہے۔ پُرانے زمانے کے حکمران وادی میں اہم مقامات پر پتھر کے بنے ہُوئے قلعوں میں رہتے تھے



جو ایشیائی قبائل کے حملے کی صورت میں حفاظت کا کام بھی دیتے تھے۔ قلعے کے دروازہ کے اوپر پتھر جمع کر دیئے جاتے تھے اور حملہ آوروں پر گرائے جاتے تھے۔ ہنزہ کے لوگ اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں اور آغا خاں کے پیرو ہیں۔

ہنزہ میں جگہ جگہ ترقی کے نشانات ملتے ہیں۔ حکومتِ پاکستان نئے سکول تعمیر کرا رہی ہے تاکہ تمام بچّوں کو تعلیم کے مساوی مواقع مل سکیں۔ حال ہی میں گلمٹ سے ہنزہ تک بیس میل لمبی شاہراہ مکمل ہوئی ہے جس کے ذریعے جیپ پر ہنزہ سے گلگت

براہِ راست جا سکتے ہیں۔ اس کا افتتاح صدرِ پاکستان نے کیا تھا۔

سالوں پہلے یہ راستہ اور بھی کٹھن تھا کیونکہ ہمسایہ ریاست نگر ہنزہ کی جانی دُشمن تھی۔ تقریباً بیس سال گزُرے ہنزہ کے میر نے نگر کے شاہی خاندان میں شادی کی اور اس طرح اُس تنازعہ کو ختم کر کے جو صدیوں سے چلا آ رہا تھا دو خاندانوں کو شیر و شکر کر دیا اس کے بعد سے نگر میں سے گزُرنے کا چھوٹا راستہ مل گیا۔ پہلے سو میل لمبے پہاڑی راستے کا چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ سیاحوں کو ہنزہ کی قدیم زندگی کے بارے میں اُس وقت علم ہُوا جب وہ سلسلہ قراقرم کے دشوار اور کٹھن راستوں سے گزُر کر یہاں پہنچے۔ برف کے تودوں سے ڈھکے ہُوئے یہاں بے شمار تنگ راستے ہیں۔ شکاری اور گائیڈ اپنے پانی کے تھیلے پگھلنے والی برف سے بھرتے ہیں۔

بلند اور سیدھی پہاڑیوں پر چڑھنا ناممکن معلوم ہوتا ہے لیکن ہنزہ کے قبائلیوں کو دیکھ کر جو اپنی کمر پر بھاری بوجھ لادے فاتح کی طرح سیدھے چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ سیاح کو اپنے اندر پوشیدہ ہمت کا احساس ہوتا ہے اور وہ جوانمردی کا پیکر بن جاتا ہے۔

سطحِ سمندر سے پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر نظارہ ناقابلِ بیان ہے۔ برفپوش پہاڑوں اور بٹورا گلیشیر سے گھری ہُوئی پہاڑیاں، بلند درخت اور چاروں طرف پھیلے ہُوئے پھُول دیکھ کر یُوں محسوس ہوتا ہے گویا ہم کسی نئی دُنیا میں آ گئے ہوں۔ یہاں قدرت کی ہر خوبصورتی موجود ہے۔ سرسبز کھیتیاں، رنگا رنگ پھُول اور وسیع میدان، جو آسمان کو چھوتے معلوم ہوتے ہیں، ایسا منظر پیش کرتے ہیں جو دل و دماغ میں سرائیت کر جاتا ہے۔

دُور فاصلے پر ایک چھوٹے سے سفید اور خوبصورت ٹیلے پر چھوٹے چھوٹے مکانوں کے درمیان گھرا ہُوا بلتی کا محل نظر آتا ہے جیپوں میں آنے والے سیاح اور قافلے علی آباد اور سرات کو جاتے ہُوئے اکثر رات گزارنے کے لیے یہاں ٹھہر جاتے ہیں کیونکہ ہنزہ کے گاؤں دُور دُور پھیلے ہُوئے ہیں۔ پہلی بار آنے والے لوگ بالکل بچّوں کی طرح گہری نیند سوتے ہیں خنک اور صحت بخش ہوا تمام تکان دُور کر دیتی ہے۔ جب آپ سو کر اُٹھتے ہیں تو برف پوش بٹیم داس کے نزدیک برف کا ایک اور قالین بچھا نظر آتا ہے۔

شکاری جانوروں کی تلاش میں نکل جاتے ہیں۔ جنگلوں میں ایبکس (IBEX) جنگلی بھیڑیں اور چیتے عام ملتے ہیں نیچے اُتریں تو برف پگھل کر چھوٹی چھوٹی ندیوں کی شکل اختیار کر لیتا ہے جن کا پانی پی کر بے حد لُطف آتا ہے۔

میر صاحب کے محل پر آمد ایک قابلِ یادگار موقعہ ہوتا ہے ان کی اہلیہ رانی اور لڑکے لڑکیاں سیاحوں کے استقبال کے لیے جمع ہو جاتے ہیں۔ آٹھ بچّوں کی پیدائش کے بعد بھی رانی اتنی خوبصورت اور جوان ہے کہ دیکھ کر حیرانی ہوتی ہے۔ لیکن اتنی زیادہ بھی نہیں کیونکہ ازلی جوانی تو ہنزہ کی فضا میں رچی بسی ہُوئی ہے۔ رانی اپنے عوام کی قابلِ رشک صحت کی علامت ہے۔ بیشتر لوگ صرف سبزیاں کھاتے ہیں۔ ہنزہ کی زرخیز زمین میں پیدا ہونے والا گیہوں وٹامن اور معدنیات سے پُر ہوتا ہے۔ ہنزہ کے لوگوں کی طویل زندگی کا راز ان کی قدرتی خوراک میں مضمر ہے۔ میر صاحب کی سب سے چھوٹی لڑکی شہزادی عذرا سُرخ گالوں والی گڑیا سے ملتی جلتی ہے۔ وہ اتنی پھرتیلی ہے کہ پہاڑیاں یُوں پھلانگتی ہے گویا رسّی کود رہی ہو...... اس کے باوجود وہ مہمانوں کے ساتھ نہایت شاہانہ وقار اور تعظیم سے پیش آتی ہے۔

اس دُور دراز علاقے میں میزبان کی مہمان نوازی فقید المثال ہے۔ مغربی لوگوں کی مغربی کھانوں سے تواضع کی جاتی ہے لیکن اگر مقامی کھانوں کی فرمائش کی جائے تو لوگ مُسکرا اُٹھتے ہیں اور چینی ذائقہ دار کھانے لاتے جاتے ہیں جن کا اثر ابھی تک میر صاحب کے گھرانے میں باقی ہے۔ ۱۹۳۵ء تک ہر سال چینی فوجی وفود سنکیانگ سے تحفے تحائف لے کر یہاں آتے تھے۔ محل کی کارنسوں پر خوبصورت گلدان، ٹرے اور بُت سجے ہوئے ہیں۔ چینی شوربہ اور دُوسرے لذیذ کھانے گرم گرم مہمانوں کو پیش کئے جاتے ہیں۔ خوش ذائقہ کھانے دیکھ کر آپ حیران رہ جاتے ہیں لیکن پاکستان کے اس دُور افتادہ مقام پر یہ تمام آسائش پاکر استعجاب اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ محل کی دیواریں پرانے حکمرانوں کی تصویروں سے سجی ہُوئی ہوتی ہیں۔ برطانوی حکمرانوں کی تصویریں بھی ہیں۔ خوابگاہوں میں لحاف اور پردے سُرخ بیش قیمت کمخواب کے ہیں۔ لیکن میر صاحب کی دلفریب شخصیّت ان کی دولت اور ساز و سامان کی حشمت سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔

بلتستان پُرعجائب سکردو

بلتستان کی اونچی پہاڑیوں میں واقع، سکردو سخت گرمیوں میں بھی بیحد ٹھنڈا اور پُرفضا مقام ہے۔ راولپنڈی سے سو میل دور شمال مشرق میں سلسلۂ قراقرم کے وسط میں اپنے مخصوص جغرافیائی وقوع کی وجہ سکردو کا موسم خنک ہے۔ پُرشکوہ برفپوش چوٹیوں کے سائے ساری وادی پر پھیلے رہتے ہیں اور دریا کے کنارے ریتلے جزیرے چڑیوں کے نغماتِ مسرت سے گونجتے رہتے ہیں۔ سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا دریائے سندھ پتھروں پر سفید جھاگ پھینکتا ہے اور ٹھنڈے پانی میں مچھلیاں اِدھر اُدھر بھاگتی نظر آتی ہیں۔

سکردو کرمس کے درختوں کی سرزمین ہے۔ کسانوں کے سُرخ سپید گول مٹول بچے سڑک کے کنارے کتّوں اور میمنوں سے کھیلتے رہتے ہیں۔ سکردو میں بے شمار جھیلیں ہیں۔ بعض تو سارا سال جمی رہتی ہیں۔ اور باقی سنہری دھوپ میں جھلمل جھلمل کرتی رہتی ہیں۔ سکردو ماہرین معدنیات کے لئے بہترین مقام ہے۔ یہاں بے شمار معدنیات، پتھر اور مرمر ملتا ہے۔ سکردو

اسس قدر سحر انگیز اور خوبصورت ہے کہ اس خاموش اور پرسکون علاقہ میں تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس کی خوبیوں کا چرچا نہیں ہوتا ۔ کیونکہ سیّاحوں کی کتابوں میں سکردو کا کہیں ذکر نہیں آتا ۔ بلند پہاڑوں سے محیط اس کے گاؤں کی سیر انوکھا لطف دیتی ہے ۔ سارے بلتستان میں جدید سہولتوں سے آراستہ خوبصورت ریسٹ ہاؤس بنائے گئے ہیں۔

وزارت امورِ کشمیر سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد راولپنڈی سے سکردو کا ہوائی سفر شروع ہوتا ہے ۔ پی ۔ آئی ۔ اے کے جہاز میں اندازہ ہوتا ہے کہ اس پُر کٹھن سفر پر مسافروں اور جہاز کے عملہ کو کسقدر باہمّت ہونا پڑتا ہے ۔ گلگت کے برعکس سکردو کا سفر زیادہ پُرخطر ہے ۔ بلند، سنگلاخ پہاڑی سلسلہ پر اُڑتے ہوئے یہ سوچ کر حیرانی ہوتی ہے کہ پی ۔ آئی ۔ اے کے پائلٹ آخر کس خمیر سے اٹھے ہیں ۔ وہ مطمئن اور پرسکون، چہرے پر آکسیجن کے نقاب چڑھائے مسکراتے ہوئے نہایت ہی مہارت سے خطرناک گزرگاہوں میں جہاز اڑاتے رہتے ہیں ۔ چوکنے اور عقاب نظر پائلٹ برف کے تودوں کی بلندی کا اندازہ کرتے ہوئے جہاز کو بلند کرتے چلے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ یہ ایک ہوائی قالین ہے جو اس خاموش دنیا میں صاف شفاف برف کی چوٹیوں پر تیر رہا ہے ۔ نیچے دھند سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں بڑی بھلی لگتی ہیں ۔ لیکن بہت سے مسافروں کے لئے یہ نظارہ کافی ہیبتناک ہے ۔ باہمت لوگوں کے لئے یہ "جنت" کا منظر ہے ۔ ۔ ۔ ۔ چاروں طرف پھیلے ہوئے برف کے گالے ۔ ۔ ۔ ۔ خوبصورت اور پُرشکوہ نظارہ ۔ نیلگوں بادلوں میں قدرت کی خوبصورتی بکھری ہوئی ہے ۔ یہ ایسا

منظر ہے جو اپنی عظمت کے ساتھ ساتھ ہیبتناک بھی ہے۔

سکردو کا چھوٹا سا شہر ہوائی اڈہ سے نو میل دور ہے۔ سڑک بیشتر جگہ پہاڑوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہے۔ علاقہ کا کچھ حصّہ بنجر ہے لیکن باقی حصّہ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ زراعت نے اس قدیم پہاڑی علاقہ کو کتنا فائدہ پہنچایا ہے۔ یہاں ایک ایک ایکڑ کے کھیت ہیں۔ جن میں ایک نوجوان زراعتی افسر کی زیرِ نگرانی اجناس کی کاشت ہوتی ہے۔ وہ سیاحوں کو کھیت دکھا کر خوشی محسوس کرتا ہے اور جن لوگوں کو زراعت سے دلچسپی بھی نہیں وہ بھی بڑی بڑی گوبھیاں، شکر قندیاں اور آلو دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں۔ یہ اس زمین کی پیداوار ہے جو پہلے بالکل بنجر تھی۔ افسر کی کامیابی عالمی امدادی ادارہ آئی۔سی۔اے (A - C - I) کی مرہونِ منت ہے جو امریکہ سے پھلوں کے بیج اور پودوں کی قلمیں بھیجتا ہے جو تمام سکردو اور اس کے اردگرد کے علاقوں میں لگائی جاتی ہیں۔

دو سال قبل ایک سابق پولیٹیکل ایجنٹ بنات گل نے، جنہیں زراعت سے دلچسپی تھی۔ زراعتی افسر سے تعاون کیا اور اجناس اور پھلوں کے باغات کے گرد پھولوں کی باڑ لگوادی۔ ان کی کوششیں بار آور ہوئی ہیں۔ اور آج بلتستان کے طول و عرض میں تمام کھیتوں کے گرد پھولوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ جو آنکھوں کو بے حد بھلا معلوم ہوتا ہے۔ موجودہ پولیٹیکل ایجنٹ نے ترقیاتی کام کو جاری رکھا ہے اور وہ تمام لوگوں کو سبزیوں کے بیج تقسیم کرتے ہیں۔ تاکہ زمین سے زیادہ سے زیادہ پیداوار حاصل کی جاسکے۔ حکومتِ پاکستان کا منتہا سکردو میں خوراک کی پیداوار بڑھانا ہے۔ جہاں اس کی اشد ضرورت

ہے۔ ہوائی جہاز اور قافلوں کے ذریعے بھی اجناس یہاں کم ہی آتی ہے۔

یہاں آنے والے تمام سیاحوں کو، خواہ وہ سرکاری مہمان ہوں یا عام مسافر، پولیٹیکل ایجنٹ تمام چیزیں دکھاتے ہیں اور منصوبوں کی وضاحت کرتے ہیں۔ سیاحوں کا دُور دراز علاقوں میں رہنے والے ترقیاتی افسروں اور مقامی راجاؤں سے بھی تعارف کرایا جاتا ہے تاکہ سکردو آنے والے ہر شخص کو معلوم ہو جائے کہ بلتستان میں کس طرح عظیم وسائل سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ وہ تمام آنے والوں کو اپنے علاقہ کی کامیابیوں سے آگاہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

سکردو کا سکول بے حد خوبصورت ہے۔ یہ طالب علموں کی خوش قسمتی ہے کہ ان کے کھیل کود اور پڑھائی کے لئے یہاں بے حد جگہ ہے۔ کمرے کشادہ اور ہوادار ہیں۔ لڑکوں کا اپنا بینڈ ہے۔ ذریعہ تعلیم اُردو اور انگریزی ہے۔ مقامی بلتی زبان بے حد مشکل ہے۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے ذاتی دلچسپی لے کر رہائشی کمرے بنوائے ہیں۔ تاکہ دور سے آنے والے طالب علموں کو رہنے کی تکلیف نہ ہو۔

تھوڑے فاصلہ پر سکردو کا بڑا ہسپتال ہے جہاں نہایت شفقت اور رحمدلی سے علاج کیا جاتا ہے۔ جب کسی بلتی عورت کے ہاں ہسپتال میں بچہ ہونے والا ہو تو دائی کو معلوم ہوتا ہے کہ ماں کے بغیر ایک سالہ عبدل اداس ہو جائے گا۔ لہٰذا وہ ایک اور چارپائی ماں کے بستر کے ساتھ لگا دیتی ہے۔ ننھا عبدل میدان میں کھیل کر دل بہلاتا ہے۔ اور رات پڑنے پر ماں کے بستر کے ساتھ لگ کر آرام سے سو جاتا ہے۔ یہ ہمدردی اُن آسائشوں کا محض ایک پہلو ہے، جو



بلتستان کے محنت کش

مریضوں کو مہیا کی جاتی ہیں۔

لوگوں کی دلچسپیاں پولو، گھڑسواری اور بہار میں فصل بونے کے گرد گھومتی ہیں۔ مرد تودک (بانسری) عوتر (بینجو سے مشابہ ساز) اور ڈھولوں کی گت پر روایتی رقص کرتے ہیں۔ موسیقی کی دھن پہاڑی ماحول سے پوری مطابقت رکھتی ہے۔ ہر رقص ان کی طرز زندگی کی علامت ہے۔ جذبات، محبّت، غم اور خوشی سب یکے بعد دیگرے پیش کئے جاتے ہیں۔ اور ہر طرف سے واہ واہ بلند

ہوتی ہے۔ ایک رقاص جہاز کا روپ دھار کر جدید زندگی کا اظہار کرتا ہے۔
اس کا کردار اتنا عمدہ ہوتا ہے کہ تماشائی آسمان کی طرف دیکھنے لگتے ہیں کہ شاید
کوئی جہاز آرہا ہو۔ جب وہ پہاڑی سڑکوں پر جیپ کے چلنے کی آواز پیدا کرتا ہے۔
تو چاروں طرف سے قہقہے پھوٹنے لگتے ہیں۔ وہ گاؤں کے لوگوں کا محبوب اداکار
ہے، گو وہ بھی عام لوگوں کی طرح کسان ہے۔

بلتی لوگ لمبے تڑنگے توانا اور کھلتی رنگت کے ہیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھا کر
مزے مزے میں چلتے ہیں۔ پہاڑی علاقوں میں تیز رفتاری کا نام و نشان نہیں۔ بلتستان
کے باہر سے آنے والے مسافروں کا جوش و خروش سے خیر مقدم کیا جاتا ہے اور
بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ ہر گاؤں میں ان کی آمد پر درختوں سے پھل توڑ کر
چائے کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔ یہاں چائے خانے بے شمار ہیں۔ بچے
بڑے مہذّب ہیں اور جلدی گھل مل جاتے ہیں۔ اجنبیوں کو دیکھ کر وہ مسکراتے
رہتے ہیں۔ اور بعض اوقات بغیر ایک حرف کہے بھاگ جاتے ہیں۔ اور ان
کے لئے پھول توڑ کر لے آتے ہیں۔

سکردو کے ہوائی اڈّے سے اٹھارہ میل دور کچورا جھیل ہے جس کو بنجر میدانوں
اور پہاڑی سڑک سے راستہ جاتا ہے۔ اس ریگستان میں یہ بڑا دلکش منظر ہے۔
برف سے ڈھکے ہوئے چنار کے درخت دھند میں بلند ہوتے چلے گئے ہیں کچورا
جھیل دھوپ میں چاندی کی چادر کی طرح چمکتی ہے۔ سیاح اس کو اپنے دورے
کی خاص چیزوں میں شمار کرتے ہیں۔

تازہ خنک ہوا میں ایک میل پہاڑی راستہ طے کر کے جھیل پر پہنچ جاتے ہیں۔

اس کے کنارے پر سُرخ گلاب پھیلے ہوتے ہیں ۔ اور مخملیں گھاس چھوٹے چھوٹے زرد پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے ۔ پہاڑوں پر چھوٹی چھوٹی ندیاں بہتی ہیں ۔ تمام لوگ ہاتھوں کے پیالے بنا کر تازہ پانی پیتے ہیں ۔ جو ٹھنڈی شمپین کا مزا دیتا ہے ۔

بلتستان میں قدرت کی صناعی کاری ، پرندوں کے نغمے اور خوبصورت تتلیوں کو اڑتے دیکھ کر انسان دم بخود رہ جاتا ہے ۔ یہاں کی فضا خواب آلود ہے اور خاموشی میں دنیا کے تمام مسائل معدوم ہو جاتے ہیں ۔ جھیل کی اپنی زندگی ہے ۔ اس کی تہہ میں مچھلیاں تیرتی پھرتی ہیں ۔ چمکتی دھوپ میں یہ مچھلیاں تیرتی ہوئی قوس قزح کے ٹکڑے معلوم ہوتی ہیں ۔ گویا پانی میں جواہرات جگمگا رہے ہیں ۔ کناروں پر چھوٹے چھوٹے مینڈک پھدکتے رہتے ہیں ۔ عظیم ہمالیہ کے دامن میں کچورا جھیل کے کنارے نخلستان کی خوبصورتی دیکھ کر روحانی مسرّت ہوتی ہے ۔

سکردو لوٹتے ہوئے راستہ میں انسانی ہاتھ کی بنائی ہوئی ایک عجیب و غریب چیز ہے ۔

پولیٹیکل ایجنٹ اپنے دوستوں اور سیّاحوں کو یہ عجوبہ دکھانے کے لئے مدعو کرتے ہیں ۔ "پہیئے دار گھر" میں چائے اور دوسری چیزیں پیش کی جاتی ہیں ۔ دریائے سندھ کے کنارے یہ پہیئے دار گھر سیدھا کھڑا ہے ۔ سامنے کے دروازے پر "اورینٹ سکائی لائینز" کا نام چمک رہا ہے ۔ نزدیک سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ ہوائی جہاز کا حصّہ ہے ۔ جسے خوبصورت بنگلے کے انداز میں رہنے کے لئے دوبارہ بنایا گیا ہے ۔

یہ یہاں کیسے پہنچ گیا ؟ یہ آیا کہاں سے ہے ؟

کئی سال پہلے اورینٹ ایئر لائنز کا طیارہ سکردو میں گر پڑا۔ اس کے ڈھانچے کو لے جانے پر خرچ کرنے کے بجائے کمپنی نے محض ایک سو پچاس روپے میں اسے ایک ہوشیار پاکستانی بریگیڈیئر کو فروخت کر دیا۔ اس نے اپنے ذاتی استعمال کے لئے جہاز کے ڈھانچے کو ایک آرام دہ مکان میں تبدیل کر دیا ہے۔ یہ مکان تمام جدید سہولتوں سے آراستہ ہے۔ یہاں ایک بار آکر واپس جانے کو دل نہیں چاہتا۔ اس جگہ ٹھہرنا کون پسند نہیں کرے گا ؟ بریگیڈیئر نے اپنے ہاتھوں سے درختوں سے گھری ہوئی ایک جگہ بنائی ہے جہاں مچھلی پکڑی جا سکتی ہے۔ تیراکی کا لطف اٹھایا جا سکتا ہے اور کشتی رانی بھی کی جا سکتی ہے۔ یہ جگہ بڑی دلفریب اور حیرت انگیز ہے۔ یہاں کوئی مسائل ہی نہیں۔

مہمات بلتستان کے سفر کا لازمی جزو ہیں۔ وادی شگار جانے کے لئے دریائے دریائے سندھ میں کشتی کا سفر پہاڑی راستوں میں جیپ کے ذریعے شروع ہوتا ہے۔ دریا کے دہانے پر ایک کشتی کھڑی ہے جو مسافروں کو مفت لاتی لے جاتی ہے۔ کشتی کو ملاح چلاتے ہیں۔ بعض مقامات پر دریائے سندھ بے حد اتھلا ہے۔ اور کشتی کو موٹے موٹے رسّوں کی مدد سے کھینچنا پڑتا ہے۔ ملاح دریا کے خشک حصّوں پر چلتے ہیں۔ چند میل آگے مسافروں کو کشتی سے اتر کر چھوٹے چھوٹے ریتیلے ٹیلے طے کرنے پڑتے ہیں۔ ماہر معدنیات ان بے شمار پتھروں کو دیکھ کر خوشی سے دیوانہ ہو جائے گا۔ جن میں سنگ مرمر اور دھاتوں کے عناصر شامل ہیں۔ سارا راستہ بالکل بنجر ہے۔ نیلگوں آسمان تلے اس قدیم دنیا کی پہاڑیاں دیوہیکل پہرہ

داروں کی طرح کھڑی ہیں ۔

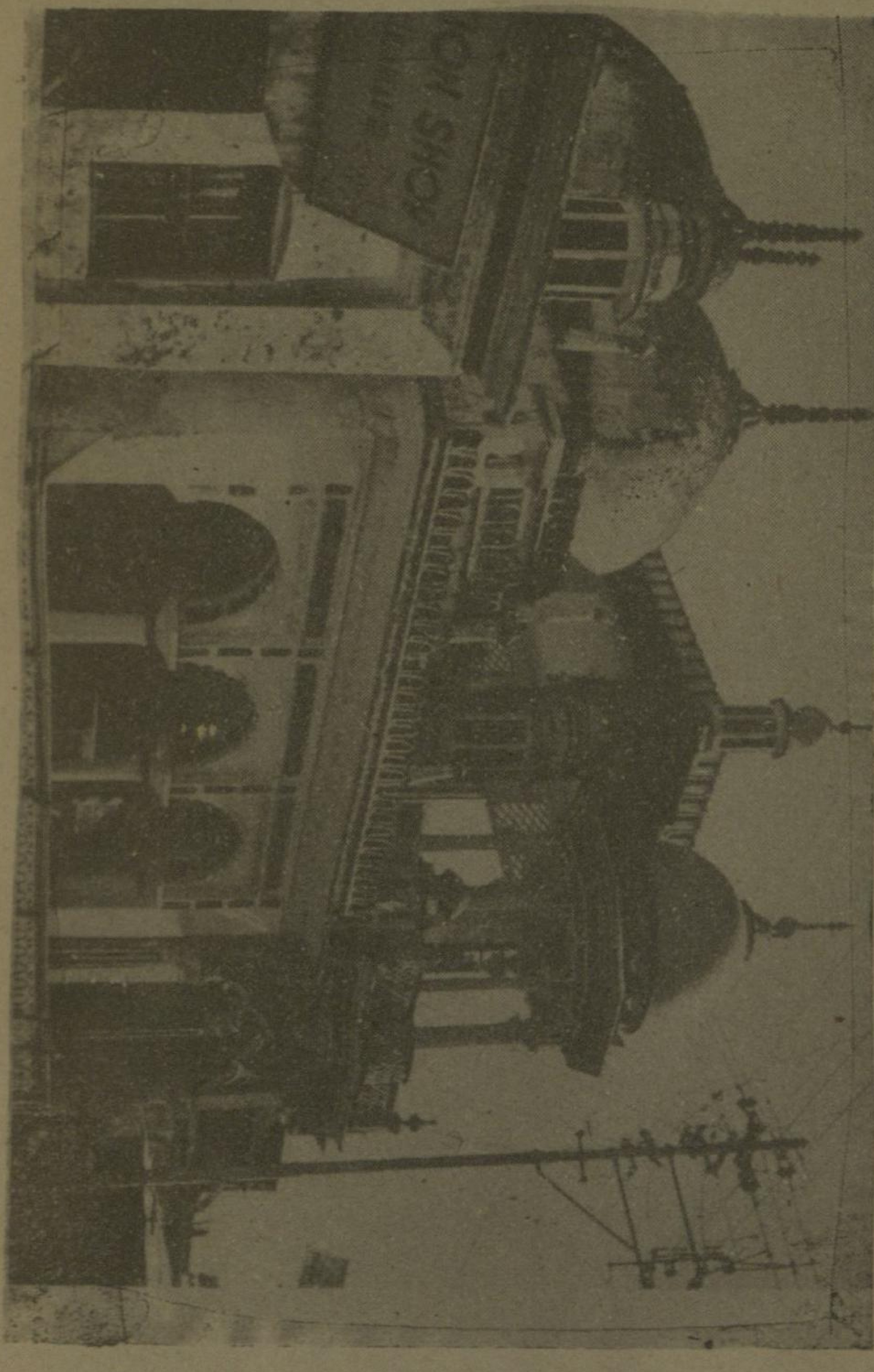
پھر اچانک زرخیز گاؤں شگار سامنے آجاتا ہے ۔ پھولوں سے گھرے ہوئے شہہ نشین والے دو منزلہ سہ منزلہ خوبصورت مکان ہوا میں پھڑپھڑاتے گھر والوں کے دھلے ہوئے کپڑے اور سوتے ہوئے چھوٹے چھوٹے بچے بڑے بھلے لگتے ہیں۔ پتھریلے اور دشوار گزار راستے کے بعد یہ خوبصورت مکانات آجاتے ہیں۔ ان کے گرد وسیع میدان پھیلے ہوئے ہیں ۔ جو قومی کھیل پولو اور دوسرے کھیلوں کے لئے استعمال ہوتے ہیں ۔ شگار ، جہاں نوجوان راجہ علی شاہ حکومت کرتے ہیں ، بڑی خوشگوار جگہ ہے ۔ آبادی ۲۳۰۰۰ تئیس ہزار ہے سکردو کے باشندوں کی طرح یہاں کے لوگ بھی اسماعیلی فرقے سے تعلق رکھتے ہیں ۔ اور آغاخاں کے پیرو ہیں ۔ یہ لوگ زراعت پیشہ ہیں ۔ اور کھیتی باڑی کر کے گزارہ کرتے ہیں ۔ یہ چینی اور منگول نسل سے ہیں ۔ جنہوں نے بعد میں اسلام قبول کر لیا تھا ۔ ان کے چہروں سے کردار اور قوت ٹپکتی ہے ۔ گو ان کی زندگی بڑی کٹھن اور قدیم طرز کی ہے ، لیکن یہ ہر لحظے سے لطف اٹھاتے ہیں ۔ شگار میں ہر شخص آسودہ حال ہے ۔ کثیر مقدار میں اجناس کی پیداوار کی وجہ بلتستان کی دوسری وادیوں میں جہاں زمین اتنی زرخیز نہیں شگار سے چیزیں بھیجی جاتی ہیں ۔

سارے بلتستان میں دیہی ترقیاتی پروگرام پر عمل ہو رہا ہے ۔ خشک اور بنجر زمین کو کاشت کے قابل بنایا گیا ہے ۔ لاہور ۔ کراچی اور دوسرے بڑے شہروں سے زرعی ماہر یہاں آنے شروع ہو گئے ہیں ۔ اور بلتیوں کو جدید طریقے سکھا رہے ہیں ۔
محکمہ زراعت اور جنگلات کے لوگ ، طبی افسر اور پولیٹیکل ایجنٹ کے ملازمین

ایک بڑے خاندان کیطرح مل جل کر کام کرتے ہیں۔ بڑے شہروں کی نسبت ان لوگوں کو اپنی روایات برقرار رکھنے اور صبر و استقلال کا صلہ کہیں زیادہ ملتا ہے۔ اپنی محنت اور عزم سے یہ ملک کی عزت بڑھاتے ہیں۔ یہ لوگ دوسروں میں بڑی جلد گھل مل جاتے ہیں۔ پردے میں ہونیوالی محفلیں بڑی دلچسپ ہوتی ہیں۔ اور بڑا اچھا وقت گزرتا ہے مرد اور عورتیں الگ الگ کمروں میں بیٹھتے ہیں۔ عورتیں بڑے جوش وخروش سے اپنے خاوندوں کی باتیں کرتی ہیں۔ برقعہ اوڑھنے سے ان کی روشن دماغی پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اور عورتیں آپس میں ملکر خوش گپیاں کرتی ہیں۔ یہ محفلیں پولیٹکل ایجنٹ کے کشادہ مکان میں منعقد ہوتی ہیں۔ سب لوگ بے حد لطف اٹھاتے ہیں اور یہاں مستقبل کی شادیاں بھی طے ہوتی ہیں۔ جس میں ہر شخص کو اپنی بات کہنے کا حق حاصل ہے۔

راولپنڈی کو واپسی کبھی وقت پر نہیں ہوتی سکردو کا ہوائی سفر موسم پر منحصر ہے لہٰذا جہاز عموماً وقت پر نہیں پہنچتے۔ اکثر سیاحوں کو اپنے اندازہ سے زیادہ رکنا پڑتا ہے۔ یہ کوئی پریشان کن بات نہیں بلکہ خوش قسمتی ہے اس دُور دراز، یکساں مختلف اور خاموش دنیا میں ایک دو اور زیادہ دن گزار لینا بڑی خوشی کی بات ہے۔ آپ بڑے خوش خوش ریسٹ ہاؤس واپس آئیں گے۔ اس غیر متوقعہ چھٹی کی خوشی کا موقعہ آپ کو موسم اور خدا نے عطا کیا ہے۔

مشرقی پاکستان



ڈھاکہ کی ایک خوبصورت مسجد

ڈھاکہ   سات سو مسجدوں کا شہر

کون سوچ سکتا ہے کہ خوبصورت ڈھاکہ ایک زمانہ میں گھڑ دوڑ کا بہت بڑا مرکز تھا اور ان گھوڑوں نے آغا خاں اور ملکہ وکٹوریہ کے لیے انعامات جیتے تھے۔ جی ہاں، یہ بالکل درست ہے۔ کچھ عرصہ سے یہاں گھڑ دوڑ پھر شروع ہو گئی ہے۔ لہٰذا کھیلوں کے شوقین اور مضبوط گھوڑوں سے عشق کرنے والی خواتین اب نہ صرف دوڑ کا لطف اٹھا سکتے ہیں بلکہ اس قدیم کھیل میں شرکت کر کے اپنے سفر خرچ میں اضافہ کے لیے پیسے بھی بنا سکتے ہیں۔

ڈھاکہ میں اتنی بے شمار خوبصورت چیزیں ہیں کہ دور دور سے آنے والے سیاح رعایتی بادشاہوں کی طرح خوش ہو جاتے ہیں۔ درحقیقت ڈھاکہ انفرادیت، دلکشی اور برگد کے درختوں کا شہر ہے۔ ڈھاکہ مسکراتا ہوا شہر ہے۔ یہاں پہنچتے ہی آپ کے اندر جذبات پھوٹ پڑتے ہیں۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ ہے اور پھولوں کی جھاڑیاں باغات کی خوبصورتی میں اضافہ کرتی ہیں۔

مسلم اکثریت کے اس شہر پر مخصوص اسلامی تہذیب کی چھاپ ہے۔ جس کا لوگوں کے رسم و رواج، زبان اور لباس پر گہرا اثر پڑا ہے۔ بزرگ لوگ جو محلے کے سردار کہلاتے ہیں اپنے تفنّنِ طبع اور حاضر جوابی کے لیے مشہور ہیں اور

قدیم قصہ خوانوں کی طرح انھیں بھی نزدیکی رشتہ داروں، دوستوں اور محلہ داروں پر وسیع اختیارات حاصل ہیں۔ دراصل ڈھاکہ کی بنیاد رکھنے والے مغل وائسرائے کی نسل سے ہونے کی وجہ سے محسوس کرتے ہیں کہ جنت میں ان کے حکمران کی روح بہت خوش ہو گی۔ کیونکہ اس کے محبوب شہر کا مشرقی ماحول اور مسحور کن حُسن آج بھی برقرار ہے اور یہی وہ چیز ہے جو نئی چیزوں کی نسبت زیادہ دلچسپی کا باعث ہے۔

مغربی پاکستان یا باہر سے آنے والا کون سیاح ایسا ہے جو یہ نہ سوچتا ہو کہ یہ شہر کیسا ہو گا؟ رات کو وہ پی۔آئی۔ اے کے جہاز پر سوار ہوتے ہیں اور صبح ہوتے ہوتے ڈھاکہ پہنچ جاتے ہیں۔ چھوٹا سا ہوائی اڈہ مختلف قسم کے لوگوں سے بھرا ہوتا ہے۔ جن میں ننگے پاؤں اور ننگے سر والے بسنتی قبائیں پہنے راہب اور اناناس بیچنے والے بچے سبھی شامل ہوتے ہیں آپ کو کسٹم اور پاسپورٹ دیکھنے والوں سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ لیکن ماحول اتنا دوستانہ ہے کہ آپ کو محسوس ہوتا ہے گویا آپ یہیں کے رہنے والے ہیں۔ اس ہزار میل کے سفر میں ایک دن بھی ضائع نہیں ہوتا۔ تھکے ہوتے مسافروں اور تاجروں کے لیے" جو چھٹی منانے کے ساتھ ساتھ کام بھی کرنا چاہتے ہیں۔ مشرقی پاکستان جانے کے لیئے بڑے عمدہ پانی کے جہاز ہیں۔ جن میں بالکل نیا جہاز "رستم آف پاک لائن" (ROSTOM OF PAK LINE) بھی شامل ہے۔ کراچی سے چٹاگانگ جانے کے لیے مسافروں کو جو سہولتیں دی جاتی ہیں وہ کم از کم اس دنیا کی معلوم نہیں ہوتیں۔ سب سے پہلی چیز تو یہ ہے کہ اس میں صرف دو درجے

ہیں۔ ایک بالائی درجہ جس کا کرایہ چار سو پچاس روپے ہے اور زیریں درجہ کا صرف پچاسی روپے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بالائی درجہ کے کمروں کا کرایہ دوسرے جہازوں کی نسبت پچاس روپے کم ہے۔ آپ تالاب میں تیر سکتے ہیں اور کھلے آسمان کے نیچے گدّہ دار کرسیوں پر آرام کر سکتے ہیں۔ اپنے ساتھ بچوں اور پالتو کتے کو بھی لے آئیے، خوبصورت کمروں میں جدید آرٹ کا لطف اٹھائیے اور آرام سے بیٹھ کر سر کی مالش کرائیے۔

آپ جہاز پر تجارتی معاملات بھی طے کر سکتے ہیں۔ اگر آپ جہاز راں (معہ قزاقوں کے)، عالم، طالب علم، آرٹسٹ، سابقہ فوجی (کسی بھی قومیت کے) یا ادیب ہیں۔ تو آپ کو کٹوتی بھی دی جاتی ہے اور کولمبو میں خریداری کے الگ سے پیسے بھی نہیں لیئے جاتے۔ رات کو آپ موسیقی کی دھنوں پر جی بھر کر رقص کر سکتے ہیں یا تاش اور شطرنج (جہاز پر ماہر کھلاڑی موجود ہوتے ہیں) سے جی بہلا سکتے ہیں۔ اور زیریں درجے کے تو کیا کہنے ہیں...... یہ تو کسی خیالاتی دنیا کی چیز معلوم ہوتی ہے کیونکہ اتنے کم خرچ میں آپ کو نیچے نہیں سونا پڑتا۔ آپ ایک صاف ستھرے کمرے میں عرشہ پر ہوتے ہیں۔ دن میں تین بار کھانا ملتا ہے اور آپ کی ملاقات طالب علموں، آوارہ گردوں اور مغربی پاکستان سے لوٹنے والے مشرقی پاکستان کے لوگوں اور بیشمار دلچسپ مسافروں سے ہوتی ہے۔

دوسری مشہور کمپنیوں میں جو عرصہ سے اس راستہ پر چل رہی ہیں پان اسلامک ہے جس کا جہاز سفینۂ عرب آپ کو بڑے آرام سے چٹاگانگ پہنچاتا

ہے۔ کریسنٹ اسٹیم شپ کمپنی کا آرام دہ جہاز شمس ہے جو مہینے میں ایک بار کولمبو کے راستے مشرقی پاکستان جاتا ہے۔ لہٰذا سیاح مہینے میں دو بار روانہ ہو سکتے ہیں۔ اوّل درجہ کا کرایہ پانچ سو روپیہ ہے اور دوسرے درجہ کا بہت ہی کم۔ دونوں جگہ آپ کو ڈھاکہ کے لوگوں سے ملنے کا موقعہ ملتا ہے جو بڑے فخر سے دیکھنے والی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں۔ چاٹگام کی بندرگاہ پہ پہنچ کر ریل یا جہاز کے ذریعے ڈھاکہ جانا پڑتا ہے۔ سارا راستہ بے حد خوشگوار ہے۔

ڈھاکہ مشرقی پاکستان کا صوبائی دارالحکومت ہے۔ گورنر ہاؤس چھوٹا سا محل معلوم ہوتا ہے۔ اس کے گرد وسیع باغات ہیں اور فرانس کی یاد دلاتے ہیں۔ چھتوں میں بڑے بڑے بلوریں شمع دان لٹکے ہوئے ہیں۔ گورنر عبدالمنعم خاں ہر وقت مشرقی پاکستان کی فلاح کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں۔ ان تک ہر ایک کی رسائی ہے اور وہ کیا مقامی کیا اجنبی سب کی مدد کو تیار رہتے ہیں ایسے ماحول میں مسافر بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔

پہلی بار میں ڈھاکہ میں ۱۹۵۸ء میں مارشل لاء کی حکومت سے صرف چوبیس گھنٹے پہلی پہنچی۔ دوسرے سیاحوں کی طرح میں بھی پریشان تھی کہ میں نے جو پروگرام بنایا ہے وہ پورا بھی ہوتا ہے یا نہیں۔ کیونکہ بیشتر دفاتر بند تھے جن کے منیجر نئی حکومت کے اثرات کا انتظار کر رہے تھے۔ نئے مہتمم سے ملاقات کے بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے "ہماری زندگی رکی نہیں ہے۔" انھوں نے کہا، "بلکہ پہلے سے بھی بہتر چل رہی ہے۔ جہاں آپ کا دل چاہتا ہے سفر کیجئے۔ ہمارے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔" میں نے بڑا سکون محسوس کیا۔ ان لوگوں کے درمیان اجنبی ہوتے



مشرقی پاکستان کے قبائلی علاقے کی ایک خاتون

ہوئے بھی مجھے ہر طرف خلوص ہی خلوص اور ایک غیر ملکی سیاح کے آرام کا جذبہ نظر آیا۔

زندگی کا یہ نیا رخ ناقابلِ بیان حد تک بدلا ہوا ہے۔ پھر مجھے قرآن پاک کی آیات یاد آئیں جن میں عالم گیر بھائی چارہ پر زور دیا گیا ہے۔ اب میری سمجھ میں پوری طرح وہ نظریہ آنے لگا جس پر پاکستان قائم کیا گیا اور وجود میں آیا۔۔۔۔۔ یہ نظریہ قوموں میں مساوات کا ہے جس میں رنگ و نسل کا کوئی تعصب نہیں۔ اسی جہاز سے اترنے

والے دوسرے مسافروں نے گھر واپس بھاگنے کا خیال ترک کر دیا اور ہم ڈھاکہ کی انفرادیت اور اہمیت سے لطف اندوز ہونے لگے۔ جب میں دوبارہ ڈھاکہ گئی تو مارشل لا ختم ہو چکا تھا اور پاکستان کا نیا آئین نافذ ہو گیا تھا۔ حالات دائمی امن کی طرف گامزن ہیں اور زندگی ان اصولوں پر چل رہی ہے جو اس کے لیے مقرر کیے گئے ہیں

ڈھاکہ کا عظیم ماضی اس کی قدیم عمارات کی خوبصورتی میں محفوظ ہے۔ یہاں لال باغ قلعہ ہے جس میں پری بی بی کا مقبرہ ہے۔ پیچیدہ ڈیزائن اور صناع کاری مغل دور کے فن کی گواہی دیتے ہیں شاہ جہان کے بیٹوں کی بنائی ہوئی عمارتیں اور مسجدیں بے حد خوبصورت ہیں۔ پری بی بی کے مقبرہ کے نزدیک بڑا کٹہرہ ہے۔ یہ عظیم عمارت مغل بادشاہ شاہجہاں کے لڑکے شاہ شجاع کے لیے بنوائی گئی تھی۔ نزدیک ہی شاہجہاں کا بنوایا ہوا چھوٹا کٹہرہ بھی نہایت شاندار عمارت ہے۔ شاہ شجاع نے حسینی دالان بنوایا اور اسے امام حسینؓ کے نام معنون کیا جو رسولِ پاک کے نواسے تھے۔ شاہ شجاع کی بنوائی ہوئی چوری ہٹہ مسجد اپنے مغل انداز کے لیے مشہور ہے۔

ڈھاکہ کی سات سو مساجد کو دیکھنے کے لیے مہینہ بھر چاہیے لیکن جن کا ذکر میں نے کیا ہے وہ قابل دید ہیں۔ سات گنبد بھی قابل ذکر مسجد ہے۔ اسے گورنر شائستہ خاں نے تعمیر کرایا تھا۔ اس مسجد میں سات خوبصورت گنبد ہیں۔ نیات بینی مسجد، جو شہر کی سب سے پرانی عمارت ہے ۱۴۵۶ء میں تعمیر ہوئی تھی دوسری خوبصورت مسجدیں ڈھاکہ میں دریا کے کنارے ہیں۔ ان کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں اور آنے والوں کو دعوتِ نظارہ دیتے ہیں۔ نزدیک ہی ہندوؤں کے مندر خوبصورتی میں

اضافہ کرتے ہیں۔ سیر کرتے ہوئے آپ کی ملاقات مقامی لوگوں سے ہوتی ہے جو اپنی وضع قطع اور چال ڈھال میں بالکل مختلف ہیں۔ شیو کیے ہوئے مغربی لوگ خوبصورت ڈاڑھیوں والے لوگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔ جن کی ڈاڑھیاں ایک کان سے دوسرے کان تک پھیلی ہوتی ہیں۔ تپتی دھوپ میں ننگے سر، رنگدار قباؤں میں لپٹے بدھ بھی گھومتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہر شخص بارش اور دھوپ سے بچنے کے لیے چھتری ضرور ساتھ رکھتا ہے۔ یہ دستور انگریزوں کے زمانے سے چلا آرہا ہے۔

مسجدوں اور گرجاؤں کے آس پاس برمی طرز کے پگوڈے اور بیاہی فنکاروں کی بنائی ہوئی خانقاہیں دیکھ کر ایشیائی پس منظر کا احساس ہوتا ہے۔ ان مقامات کو دیکھنے کے لیے کچھ دینا نہیں پڑتا۔ البتہ دروازوں میں ڈبے رکھے ہوتے ہیں جن میں ڈالے ہوئے عطیات قبول کر لیے جاتے ہیں۔ ہر طرف سے اُردو اور بنگالی میں ملی جلی آوازیں آتی ہیں اور پرانے لوگ روانی سے انگریزی بولتے ہیں۔ اگر کوئی مشترکہ زبان نہ ہو تو مسکراہٹ اور اشاروں سے ہی کام چل جاتا ہے۔ بنگالی، جیسا کہ مشرقی پاکستان کے لوگ کہلاتے ہیں، بڑے پیارے لوگ ہیں۔ اور سیاحوں کے آرام کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔

ایک گائیڈ کے ساتھ ڈھاکہ کے پرانے علاقہ میں گھومتے ہوتے مجھے لوگوں کی سیاحوں میں دلچسپی دیکھنے کا خوب موقع ملا۔ میرے تھیلے کے لوہے کے تار ڈھیلے ہو گئے تھے اور ہر چیز خراب ہو گئی تھی۔ میں تھیلا لیکر اس دکان پر گئی جہاں چیزوں کی مرمت کی جاتی ہے۔ انہوں نے ہفتہ بھر میں دینے کا وعدہ کیا۔ چونکہ مجھے آگے جانا

تھا اس لیے میں انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ ہم ایک ٹھٹھیرے کی دکان میں گھس گئے جہاں پرانے ٹین کے ڈبوں سے خوبصورت شمعدان بنائے جا رہے تھے۔ میں نے ٹھٹھیرے کو اپنا تھیلا دکھایا اور مرمّت کے لیے کہا اس نے سر ہلاتے ہوئے مجھے سمجھایا کہ اگر تاروں کو شعلہ سے جوڑا تو تھیلے کا پلاسٹک پگل جائے گا۔ میں ہنس پڑی اور ٹین کا ٹکڑا اٹھا کر اسے مشورہ دیا کہ وہ شعلہ سے کام کرتے وقت اس ٹکڑے کو احتیاط کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ بات اس کی سمجھ میں آ گئی اور اس نے جھٹ پٹ سارے کونے جوڑ دیئے اور مجھ سے کہا کہ گھنٹہ بھر بعد تھیلا لے جاؤں تاکہ جوڑ ٹھیک طور پر بیٹھ جائیں۔ گائیڈ کے ساتھ لوٹتے ہوتے میں تھیلا لینے کے لیے گئی لیکن وہاں پہنچ کر ایک عجیب بحث میں گرفتار ہو گئی جس میں گائیڈ اور ٹھٹھیرا بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہے تھے "عجب مصیبت ہے" میں نے کہا، "آخر بات کیا ہے۔ آؤ پیسے دے کر واپس چلیں" گائیڈ سنجیدہ ہو گیا اور اس نے کہا "یہ آدمی بہت زیادہ پیسے مانگ رہا ہے جو میں ہرگز نہیں دوں گا"۔ "بات سنئے"، میں نے گائیڈ سے کہا" اس نے کام بہت اچھا کیا ہے۔ یہ دوسرے آدمی سے تو زیادہ نہیں مانگ رہا ہو گا۔ وہ تو پانچ روپے کہتا تھا۔ خدا کے لیے اسے پیسے دو اور چلو" وہ ناراض ہو کر الگ ہو گیا۔" مجھے نہیں معلوم وہ کتنے پیسے مانگتا تھا۔ یہ ایک معمولی ٹھٹھیرا ہے اور اتنے زیادہ پیسے مانگتا ہے"۔

"بیوقوفی کی باتیں مت کیجئے" میں نے جواب دیا، "یہ اس سے تو برا نہیں ہو سکتا۔ آخر یہ چاہتا کیا ہے؟"

"دیکھیے محترمہ، میں یہیں رہتا ہوں، اسی کی طرح بنگالی ہوں اور مجھے ساری اجرتیں معلوم ہیں۔ آپ کا کام صرف پانچ منٹ کا تھا، وہ سیاحوں سے اجرت ایک روپیہ طلب کر



ڈھاکہ کا ایک لوک ناچ

رہا ہے جبکہ اس کام کے زیادہ سے زیادہ آٹھ آنے ہونے چاہئیں۔ آپ کو اتنے پیسے نہیں دینے چاہئیں۔" میں غصہ سے چلّا اٹھی۔ میں نے ٹھٹیرے کو ایک روپیہ دیا اور اس نے مجھے بے شمار دعائیں دیں "آپ تو پاگل پن کی باتیں کرتے ہیں۔" میں نے بگڑ کر گائیڈ سے کہا: "میرے لیے یہ کہیں زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ ٹھٹیرے نے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر میرا کام کیا میں بہت خوش ہوں۔ آؤ اب چلیں . . . . ."

میری ملاقات نیوجرسی کی بہت سی امریکی عورتوں سے ہوئی جو ڈھاکہ کا کپڑا

دیکھ کر خوش ہو رہی تھیں۔ عنکبوت کی طرح بنی ہوئی ململ ریشم کی طرح نرم اور اس قدر مہین ہوتی ہے کہ انگوٹھی سے گزاری جاسکتی ہے۔ چھ گز کا ٹکڑا تہ ہو کر ماچس کی ڈبیا میں آجاتا ہے کہا جاتا ہے کہ اسے پریوں نے ہوا کے دھاگوں سے بُنا ہے۔ ان کے نام بڑے رومانی ہیں۔ مثلاً "شام کی شبنم" اور "جنت کی گھاس" عورتوں نے بے اندازہ کپڑا خرید ڈالا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ ڑینٹین میں بہت سے لوگ ڈھاکہ کے گاؤن پہن کر اتراتے پھریں گے۔ ٹانگائل بھی بہت خوبصورت کپڑا ہے۔ یہ عمدہ سوت سے سونے اور چاندی کے تاروں کے ساتھ بنا جاتا ہے۔ ایک ساڑھی کے لیے چھ گز کا ٹکڑا صرف پچیس روپے میں ملتا ہے۔ موتیوں کے ہار اور زیورات بھی گھر لے جانے کے لیے خریدے جاسکتے ہیں۔

مشرقی پاکستان میں موتیوں کا کاروبار بہت پھیل رہا ہے۔ ڈھاکہ کے کارخانوں میں چوڑیاں، کنگن اور ہار بنتے ہیں آپ کو اپنے پیسے کا نعم البدل مل جائے گا کیونکہ قیمتیں زیادہ نہیں ہیں۔ ڈھاکہ میں خرید و فروخت کی آخری جگہ دریا کے کنارے کا بازار ہے۔ کناروں سے چھلکتے ہوئے دریاؤں کی اپنی زندگی ہے۔ یہ دریا کشتیوں اور مچھیروں کے بیڑوں سے بھرے رہتے ہیں۔ جو اپنے دھلے ہوئے کپڑے جھنڈوں کی طرح مستولوں سے باندھ دیتے ہیں۔ کسی پھل والے سے پکا ہوا انناس چار آنے میں خرید لیجئے۔ اس کے دو ٹکڑے کیجئے اور کسی جگہ بیٹھ کر اس کا لطف اٹھائیے۔

آرٹ کے شوقین شاہ باغ میں واقع آرٹ انسٹیٹوٹ میں مقامی آرٹ اور ڈھاکہ آرٹ گروپ کی بنائی ہوئی تصویروں کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ مغلوں سے ورثہ میں ملے ہوئے فن کا نمونہ یہاں ملتا ہے۔ ستمبر سے مارچ تک تہواروں کے دنوں میں نئی نئی چیزوں کی نمائش کی جاتی ہے۔ یہاں ہر مہینے ہندوؤں، مسلمانوں اور بدھوں کے

تہوار ہوتے ہیں ۔ اسکولوں میں بچے بھی مذہبی رقص کی محفلیں منعقد کر کے تہوار مناتے ہیں ۔ ان موقعوں پر سیاحوں کو ہمیشہ خوش آمدید کہا جاتا ہے ۔ اکتوبر سے نئے سال تک ہندؤں کے تہوار درگا پوجا میں ریشمی کپڑوں میں لپٹی ہوئی مندر کی داسیاں رقص کرتی ہیں ۔ سارے مشرقی پاکستان میں ریسٹ ہاؤس اور ہوٹلوں میں غیر ملکی سیاحوں کی فرمائش پر منی پوری رقص پیش کیا جاتا ہے ۔ چند گھنٹے پہلے کی اطلاع پر آپ کا دل بہلانے کے لئے ایک طائفہ آجائے گا ۔ اور وہ رقص پیش کرے گا ۔ جو آج سے دو ہزار سال پہلے ہوتے تھے ۔

نیا ڈھاکہ ابھی بہت زیادہ بڑا نہیں ہے ۔ یہاں تمام جدید سہولتیں موجود ہیں ۔ یونیورسٹی کے عجائب گھر میں بہت سی قیمتی چیزیں ہیں ۔ لائبریری میں نایاب کتابیں موجود ہیں ۔ نئے خوبصورت ہوٹل شاہ باغ میں تمام آسائشیں مہیا ہیں ۔ ساری عمارت میں مرمر کے ستون بڑے شاندار لگتے ہیں ۔ سنگل کمرہ کا کرایہ جسمیں غسل ، ٹیلیفون اور کھانا سب کچھ شامل ہے ۔ محض پینتیس ۳۵ روپیہ یومیہ ہے ۔ گرین ہوٹل میں ، جو اتنا خوبصورت تو نہیں مگر آرام دہ ضرور ہے ، کرایہ صرف بیس روپے ہے ۔ شاید انہوں نے ابھی مشرقی پاکستان میں گرانی کے بارے میں نہیں سنا ۔ شاہ باغ سے آگے ڈھاکہ ریڈیو اسٹیشن دیکھنے والی جگہ ہے ۔ اسی علاقہ میں ڈھاکہ کلب تمام سیاحوں کے لئے کھلا ہے ۔ اور ہوٹل کے مہمان تیرنے کا تالاب بھی استعمال کر سکتے ہیں ۔

سکول ، جہاں ہر طبقے کے بچے پڑھتے ہیں ، طالبعلموں سے بھرے رہتے ہیں کوئی بھی سیاح کلاس میں بیٹھ کر لیکچر سن سکتا ہے ۔ اور ڈھاکہ کے نوجوانوں سے بہت کچھ سیکھ سکتا ہے ۔ میرے خیال میں ڈھاکہ میں جدید ترین چیز سینما ہیں ۔ حال ہی

میں ایک بلند ایئر کنڈیشنڈ عمارت تعمیر کی گئی ہے جس میں اوپر تلے دو سینما ہیں جہاں بیک وقت مختلف فلمیں دکھائی جاتی ہیں۔

جوٹ مل کے مزدور سروں پر بھاری بھاری بوجھ اٹھائے صرف لنگی پہنے (کپڑے کا ٹکڑا جسے کمر کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے۔ جیسے ہم لوگ غسل کے بعد تولیہ باندھ لیتے ہیں) قیمتی کپڑوں میں ملبوس لوگوں سے بالکل بے نیاز ہر طرف پھرتے نظر آتے ہیں کشتی یا جیپ کے ذریعہ جوٹ مل پہنچ کر بڑا اچھا وقت گزرتا ہے۔

دریا میں دو گھنٹے سفر کر کے نارائن گنج پہنچ جاتے ہیں۔ مسلمان اور ہندو مزدور مل کر مچھلیاں پکڑتے ہیں اور پٹ سن اکھٹی کرتے ہیں۔ راستے میں بہتے ہوئے بازار پڑتے ہیں۔ اور آپ کریم اور آدمجی جوٹ مل پہنچ جاتے ہیں۔ جہاں اس قیمتی پودے سے لاکھوں مقامی اور بیرونی لوگوں کی ضروریات پوری کی جاتی ہیں۔ جوٹ سے رسے، ڈوریاں، تھیلے قالین اور بے شمار دوسری چیزیں بنائی جاتی ہیں۔

پرشور کارخانوں میں مزدور پڑے سوئے رہتے ہیں۔ اور اپنی شفٹ شروع ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ دوسرے لوگ مشینوں پر کام میں مصروف رہتے ہیں بہت سی لڑکیاں اور عورتیں نرم و نازک ہاتھوں سے چیزوں کو نزاکت بخشتی ہیں ۔ مجھے لوگوں نے بتایا کہ شروع شروع ان دیہاتی لوگوں نے صنعتی ترقی میں دلچسپی نہیں لی۔ لیکن اچھی تنخواہ اور کام کے بہترین ماحول نے انہیں کھینچ لیا۔ اور کام کا جذبہ ان کی آزادانہ زندگی پر غالب آگیا۔ اب دریا کے کنارے ان کے گھروں میں ریڈیو اور جدید چیزیں ہیں۔ جو جوٹ مل کی تنخواہوں سے خریدی گئی ہیں۔

ڈھاکہ سے اکانوے میل لمبی ریلوے لائن پر آپ سارے مشرقی پاکستان میں گھوم

سکتے ہیں۔ اور پی۔ آئی۔ اے کے ذریعے کلکتہ، روم اور لندن بھی جا سکتے ہیں۔ اپنی انفرادیت کی وجہ سے ڈھاکہ کا مقابلہ دنیا کے کسی شہر سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہر طرح کی طبی سہولتیں ہیں، سفارت خانے ہیں۔ ایشیا فاؤنڈیشن کا دفتر ہے اور کشتیاں بنانے کے بڑے بڑے مرکز ہیں۔ تین اقسام کی زمین میں طرح طرح کی فصلیں ہوتی ہیں۔ اور رس بھرے لذیذ پھل ڈھاکہ کی خاص چیز ہیں۔

عوام کی تفریح اور لوگوں کو تجارتی حالات سے مطلع کرنے کے لئے ڈھاکہ میں کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں۔ چند دوستوں کے ساتھ میں بھی ایک کانفرنس میں جا نکلا۔ میرا خیال تھا کہ شاید کوئی لیکچر ہو رہا ہے۔ لوگ ہمیں دیکھ کر مسکرائے اور کسی وفد کا رکن سمجھ کر ہمارا خیر مقدم کیا گیا۔ ہمارے لئے یہ بالکل نئی معلومات تھیں کہ ڈھاکہ سے بیشمار چیزیں دنیا کے کونے کونے میں بھیجی جاتی ہیں۔

اکثر مشہور اداکار، آرکسٹرا اور طائفے ڈھاکہ آتے ہیں۔ جنہیں دیکھنے کے لئے لوگ ٹوٹ پڑتے ہیں۔ سارے ٹکٹ کئی دن پہلے فروخت ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ثقافتی محفلوں کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار پہاڑی علاقوں سے لوگ آجاتے ہیں۔ اور ڈھاکہ سٹیڈیم میں اپنے مخصوص رقص پیش کرتے ہیں۔ ان کا بھی بیرونی فن کاروں کی طرح خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ اس سے غرض نہیں کہ وہ کون ہیں۔ اور مشرقی پاکستان کے کس حصہ سے آئے ہیں۔ ان کی صلاحیتوں اور فن کو اولیت دی جاتی ہے۔ پہاڑی علاقوں کے لوگ بڑے عمدہ رقص کرتے ہیں۔ وہ والہانہ انداز میں رقص کرتے ہیں، ڈھولوں کی گت پران کا انگ پھڑکتا ہے۔ انکے ہاتھ بے خودی میں پھیلے ہوتے ہیں۔ اور تماشائی رقص دیکھ کر مسحور ہو جاتے ہیں۔



ڈھاکہ میں دیکھنے کو سبھی کچھ ہے۔ پہاڑی علاقوں کے لوگ، رقاصائیں اور بنگالی۔ تاجر اور سیّاح، ہر شخص ڈھاکہ کا پورا پورا لطف اٹھاتا ہے۔ اس پر خلوص شہر کو دیکھنے کے لئے مشرق کا سفر ضرور کیجئے۔

بندرگاہ چٹاگانگ اور پہاڑی علاقہ

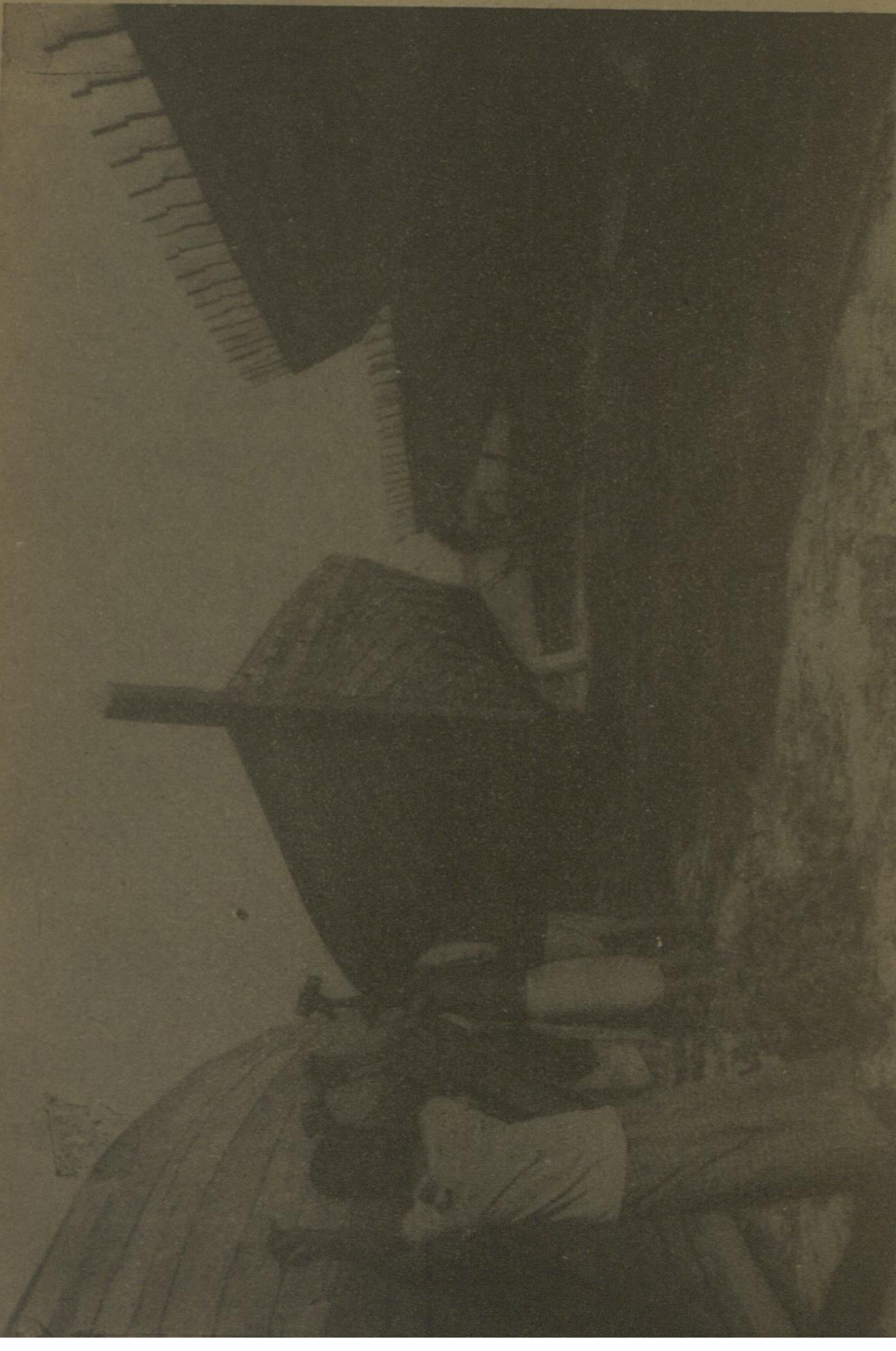
چٹاگانگ، جس کو بنگال کے مغلیہ دور کے گورنر اسلام خاں کے نام پر اسلام آباد بھی کہا جاتا ہے، کرنافلی کے دائیں کنارے واقع ہے اور اس دریا کے ذریعے سمندر سے ملا ہوا ہے اس کے بارے میں بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں.........

"عظیم بندرگاہ...... دھند اور پانی
سے ابھرتا ہوا حسن خوابیدہ کا شہر..."

چینی شاعر ہوان سانگ نے اس طرح چٹاگانگ کی تعریف کی ہے جب وہ صدیوں پہلے یہاں آیا تھا۔ ایک حسین عورت کی طرح سبز لباس پہنے، بازو پھیلائے یہ شہر تمام آنے والوں کا خیر مقدم کرتا ہے۔

ڈھاکہ سے ہوائی جہاز کے ذریعے پچاس منٹ لمبے سفر میں کشتیوں سے بھرے دریا کو دیکھ کر مجھے بہت لطف آیا۔ بندرگاہ دنیا بھر کے جہازوں سے بھری ہوئی تھی۔ ان میں نمایاں کراچی سے آئے ہوئے مال بردار جہاز تھے۔ جو مشرقی پاکستان کے لیے ضروری سامان اتار رہے تھے۔ دوسرے جہاز مغربی پاکستان کے لیے چیزیں لے کر لوٹ رہے تھے۔

چٹاگانگ، جو خلیج بنگال کے مشرقی ساحل پر واقع ہے، پاکستان کی دوسری تجارتی اور صنعتی بندرگاہ ہے اور دونوں صوبوں کے درمیان رابطہ قائم رکھتی ہے یہ جدید بندرگاہ پاکستان ایسٹرن ریلوے سے ملحقہ ہے۔ پہاڑوں کے پس منظر میں یہ شہر انفرادی خوبصورتی کا حامل ہے۔ دریائے کرنافلی کا بل کھاتا ساحل پہاڑوں کے دامن میں پھیلا ہوا ہے جو سرسبز درختوں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ یہاں سے پہاڑی علاقوں، چندرگونا کے کاغذ کے عظیم کارخانے، کپتائی، سندربن، اور کاکس بازار کو راستہ جاتا ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ دوسرے مشہور مقامات کی نسبت چٹاگانگ میں سیاحوں کی دلچسپی کا زیادہ سامان موجود ہے۔ اگر آپ ڈھاکہ سے ریل کے ذریعے آئیں، جو بمشکل پانچ میل کا راستہ ہے، تو کھڑکی سے آپ کو فوجدار ہاٹ کا نیا کیڈٹ کالج نظر آئے گا۔ جو دیکھنے کی جگہ ہے۔ کالج کے اساتذہ سیاحوں کا خیر مقدم کرتے ہیں اور یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ پاکستان ان نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کے لیے کیا کر رہا ہے۔ جو آگے چل کر مسلح افواج میں جانا چاہتے ہیں۔ یہاں دوسرے پیشوں میں بھی تربیت دی جاتی ہے اور اس طرح فوج کی ملازمت لازمی نہیں رہتی۔ اس کے دروازے سب کے لیے کھلے ہیں اور پرجوش طالب علموں کو سائنس، ڈاکٹری، انتظامیہ، معاشیات اور تجارت کی تربیت پاتے دیکھ کر فخر محسوس ہوتا ہے۔ تعلیم کے اوقات کے بعد کھیل کے میدانوں اور تیراکی کے تالاب پر بھیڑ ہو جاتی ہے اور لڑکے کھیلوں میں حصہ لیتے ہیں آپ کو بھی کرکٹ اور بیس بال کے مقابلوں میں شرکت کی دعوت دی جاتی ہے۔ نوجوان یہاں بے حد خوش رہتے ہیں۔



چٹاگانگ میں زندگی بندرگاہ کے گرد گھومتی ہے لیکن سیاحوں کے لئے دریائے کرنافلی پر تفریح کے مواقع موجود ہیں۔ بانس کی چھت والی خوبصورت کشتیوں کے تیرتے ہوئے گھر بنے ہوتے ہیں۔ آٹھ آنے دے کر آپ تقریباً آدھ میل کا فاصلہ طے کر کے کسی نزدیکی جگہ جا سکتے ہیں یا تین روپیہ میں دریائے فینی کے پچیس میل لمبے ساحل کی سیر کر سکتے ہیں۔ اس سفر میں سیدھے سادھے کپڑے پہنے پہاڑی علاقوں کے لوگ آپ کے ساتھ ہوں گے۔

یہ لوگ خلیج بنگال کے اصل باشندوں میں سے ہیں اور ان میں خلیج کے رومان پرور علاقہ کا خاص رنگ اور جذبہ جھلکتا ہے۔ وقت کے اثر سے بے نیاز، اس قدیم علاقہ میں جو چٹاگانگ کے پہاڑی علاقہ کے نام سے موسوم ہے، ان لوگوں کی زندگی آج بھی صدیوں پہلے کی طرح ہے۔ عورتیں رنگدار دھوتیاں پہنے بچوں کو کمر پہ اٹھائے پھرتی ہیں جو مسکراتے ننھے منے بدھا کی طرح لگتے ہیں یہ عورتیں بنگالی میں باتیں کرتی پہاڑیوں پر چڑھتی اترتی نظر آتی ہیں۔ اور پہاڑی علاقے کے گاؤں میں رک جاتی ہیں جو کرنافلی کے ساحل کے ساتھ ساتھ پھیلے ہوئے ہیں۔

یہ علاقہ سلسلہ اراکان سے گھرا ہوا ہے۔ موسم گرما کافی لمبا ہوتا ہے، بارش بھی خوب ہوتی ہے اور ہر طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا ہے۔ جانور بکثرت ہیں اور انسانوں کے لیے خوراک اور جانوروں کے لیے چارہ بھی بافراط ہے۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے میں چار خاص دریا فینی، سنگو، ماتاموری اور کرنافلی ہیں جو گھاٹیوں اور تنگ راستوں سے نکلتے ہیں۔ فینی شمالی سرحد پہ ہے اور کرنافلی خلیج بنگال سے جا ملتا ہے اور تیز رو نہروں میں تبدیل ہو جاتا ہے جن سے بجلی پیدا کر کے

علاقہ کی ترقی میں کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس خوبصورت علاقہ میں بجلی کی روشنی اور انسان کی بنائی ہوئی چیزوں کے بارے میں کوئی سوچتا بھی نہیں۔ یہاں قدرت اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ دھند سے گھرے ہوئے پہاڑ، کائی اور سنہری دھوپ کے مخملیں قالین، سبزہ سے گھرے ہوئے جنگلات، لمبے لمبے بانسوں کے درخت، پہاڑیوں سے اونچی بیلیں، چاروں طرف کھلے ہوئے پھول اور ادھر اُدھر اڑتی چڑیاں یہاں سب کچھ موجود ہے۔

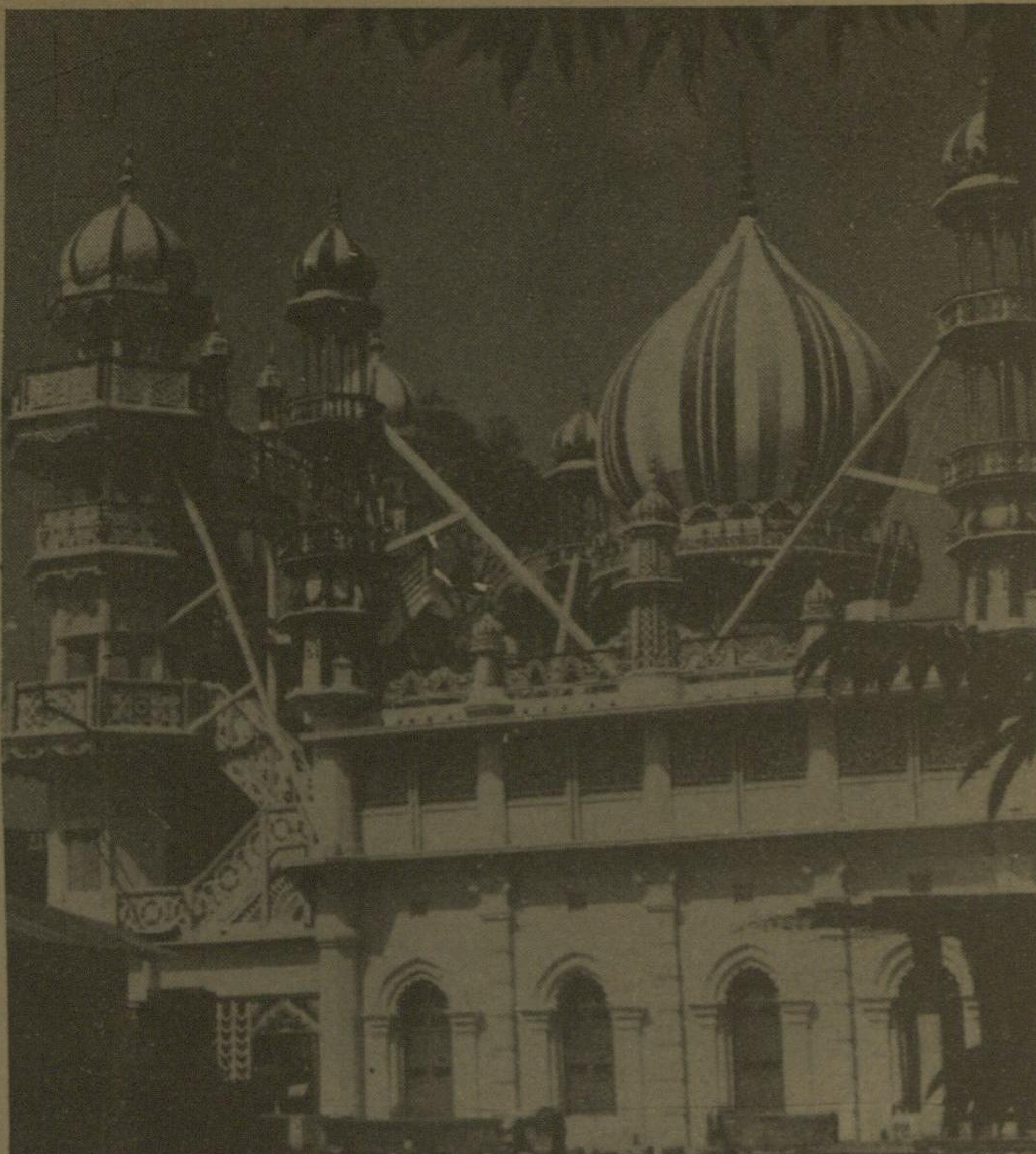
پہاڑی علاقہ کی تو کیا ہی بات ہے اس کا بیشتر حصہ جنوبی افریقہ کے جنگلات سے مشابہت رکھتا ہے۔ دریا اس قدر تند رو ہیں کہ بڑے بڑے سورماؤں کا پتّہ پانی ہوتا ہے۔ صرف تجربہ کار اور گھاگ ملّاح ہی ان دریاؤں میں نازک کشتیاں اور جہاز چلا سکتے ہیں۔ بعض اوقات یہ دریا نہایت سکون سے نالوں کی طرح بہتے ہیں اور پھر اچانک تیز ہو جاتے ہیں گویا کوئی آبشار نیچے اتر آئی ہو۔ ان میں سست رفتار مگرمچھ تیرتے رہتے ہیں اور سفر کی دلچسپی میں اضافہ کرتے ہیں۔ بل کھاتے ہوئے ساحل کے کنارے اکّا دکّا گاؤں اتنے بھلے لگتے ہیں کہ ان کی یاد دل سے محو نہیں ہوتی۔ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر بانس کے مکان اور ان پر ہری گھاس کی چھتیں دریا، ساحل اور جھونپڑیوں کے ماحول کی رنگینی میں اضافہ کرتے ہیں۔

ان جھونپڑیوں میں رہنے والوں کے پاس کاٹنے والی ایک خاص چیز ہوتی ہے، جسے داؤ کہتے ہیں۔ یہ بڑے سے گول چاقو کی طرح کا آلہ ہے جس سے یہ لوگ درخت کاٹتے ہیں اور جنگلی جانوروں سے مقابلہ کے وقت ہتھیار کے

طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ علاقہ چاول کے کھیتوں سے بھرا ہوا ہے جو شمال میں سلسلۂ چیمیوک سے گھرے ہوتے ہیں یہاں چوبیس میل لمبی نئی سڑک بنائی گئی ہے جو سفر کے لیے بہت عمدہ ہے اور سیاح اسے بیحد پسند کرتے ہیں وہ عموماً اس وقت پہنچتے ہیں جب مقامی لوگ اچھی فصل کے لیے قربانی کی رسم ادا کرتے ہیں اور جب کھیتیاں لہلہانے لگتی ہیں تو خوب خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اور میلے لگتے ہیں۔ موسیقی ان میلوں کا اہم جزو ہوتی ہے محبت اور خوشی کے ترانے گاتے جاتے ہیں، جوان اور بوڑھے سب مل کر رقص کرتے ہیں اور نئی فصل کا چاول پکا کر کھایا جاتا ہے۔ سردیوں میں یہ لوگ آرام کرتے ہیں لیکن کاہل کبھی نہیں بیٹھتے۔ ان دنوں میں یہ لوگ خوب محنت کرتے ہیں اور تمباکو کے پتوں سے سگار اور بیڑیاں بناتے ہیں۔ عورتیں سوت کاتتی ہیں اور کپڑا بنتی ہیں اور تمام لوگ مل جل کر کام کرتے ہیں۔

پہاڑی علاقہ چھ ہزار پانچ سو اکاون مربع میل ہے۔ تازہ ترین مردم شماری کے مطابق آبادی تقریباً تین لاکھ پچاس ہزار ہے اور ایک ہزار چار سو پچاس مربع میل کے رقبہ میں جنگلات پھیلے ہوئے ہیں۔

پہاڑی علاقے کے باشندے خوش باش ہیں۔ مشکلات میں بھی یہ لوگ پُر امید رہتے ہیں اور ایسی تکلیفات کو بھی جھیل جاتے ہیں جن کے تلے دوسرے لوگ پس کر رہ جائیں۔ بیشتر لوگ بدھ مت کے پیرو ہیں اور چکمہ قبائل سے تعلق رکھتے ہیں جن کے لیے ان کا مذہب بے حد اہم ہے یہ لوگ چودہ قبائلی دیوتاؤں کی پوجا کرتے ہیں اور سال میں ایک بار ان کی سب سے بڑی رسم



سلطانی مسجد۔ چٹاگانگ

ہوتی ہے جسے تھان مانا کہا جاتا ہے۔ اس میں ہندوؤں کی رسومات کی طرح قربانیاں اور رقص ہوتے ہیں۔ راہبوں اور پروہتوں کی بڑی تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ بچے کی پیدائش پر خوشی میں بندوقیں چلائی جاتی ہیں خواہ لڑکا پیدا ہو یا لڑکی۔ دونوں کی بڑی چاہت کی جاتی ہے۔

یہاں گھریلو زندگی بڑی اہم ہے کثرتِ ازدواج کا نام و نشان تک نہیں اور شادیوں کے لیے والدین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے۔ اگر لڑکا اور

لڑکی محبت میں گرفتار ہو جائیں تو خاندان میں اس کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اگر وہ گھر سے چار بار بھاگ جائیں تو وہ شادی کر سکتے ہیں لیکن اس کے عوض انہیں دو موٹے تازے سوروں کی شکل میں جرمانہ ادا کرنا پڑتا ہے شادی کی رسومات بڑی دلچسپ ہیں۔ دولہا دلہن پاس پاس بیٹھ جاتے ہیں اور خاندان کے لوگ انہیں کمر کے گرد ایک دوسرے سے باندھ دیتے ہیں گرہ کو سخت کرنے سے پہلے تمام رشتہ داروں سے پوچھا جاتا ہے کہ آیا وہ اس رشتہ کو منظور کرتے ہیں (جس کی وہ ہمیشہ اجازت دے دیتے ہیں) اس کے بعد یہ جوڑا اپنے بزرگوں کے پاس جاتا ہے جو انہیں آشیرباد کے طور پر خوشحالی اور خوشی کے لیے چاول، گھاس اور روئی دیتے ہیں۔ ساتھ ساتھ گاؤں کا پروہت شادی کے منتر پڑھتا جاتا ہے۔

تمام دلہنیں کاتنا، بننا، کھانا پکانا اور سینا پرونا جانتی ہیں لہذا اس کو بخوشی قبول کر لیا جاتا ہے۔ چکمہ عورتوں کے لیے پھول خاص کشش رکھتے ہیں اور وہ ان سے خوبصورت ہار اور گجرے گوندھتی ہیں جو دیکھنے میں بڑے پیارے لگتے ہیں۔ پہاڑی علاقے کی تمام عورتیں پھولوں کا بکثرت استعمال کرتی ہیں۔ چکمہ کے علاوہ دوسرے خاص قبائل موگھ، مورنگ، پنکھو اور لوشا ہیں۔ ان سب کا ناک نقشہ اور چہرہ مہرہ ملتا جلتا ہے کیونکہ یہ لوگ آریاؤں اور منگولوں کی نسل سے ہیں۔ ان کے چہروں سے قوت جھلکتی ہے اور جسم گٹھے ہوئے ہیں۔ چکمہ زبان بنگالی کی ہی ایک شکل ہے اور بیشتر قبائل یہی زبان استعمال کرتے ہیں۔ بچے، مرد اور عورتیں سب بلا کے تمباکو نوش ہیں۔

چھوٹے چھوٹے بچے بڑی اور پائپ کا دھواں اڑاتے نظر آتے ہیں۔
سیاح خواہ ہرن کا شکار کرنا چاہیں یا چیتے کا۔ چٹاگانگ کے جنگلات شکاریوں کے لیے جنت ہیں۔ بندر ایک شاخ سے دوسری شاخ پر چھلانگیں لگاتے ہیں اور ہاتھی بادشاہوں کی طرح جھومتے چلتے ہیں اور ہر اس شخص کو مقابلہ کی دعوت دیتے ہیں جو جنگلی جانوروں کی اس دنیا میں شکار کھیلنے کی ہمت رکھتا ہے۔

اس زندگی کے برعکس، شہر کے تجارتی علاقے میں جدید تعمیرات پرانے دور کی عمارات سے مقابلہ کرتی ہیں۔ نئے مکانات اور بنگلے کیلیفورنیا کی عمارتوں سے لگا کھاتے ہیں۔ تاریخی مقامات میں ایک دیکھنے والی چیز عدالت کی عمارت ہے جہاں سے دریا اور سلسلہ چمبک کے پس منظر میں بل کھاتا سمندر نظر آتا ہے چٹاگانگ کا اسلامیہ انٹر کالج مشہور ترین اداروں میں سے ہے اسے تین سو سال قبل پرتگالیوں نے تعمیر کیا تھا۔ اس کے تہہ خانے اور سرنگ آج بھی باقی ہیں۔ جنہیں اسلحہ رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا ایک اور تاریخی چیز تیس فٹ بلند پہاڑی پر جامع مسجد ہے جسے شاہ شجاع کی فوجوں کے ایک جنرل نے تعمیر کرایا تھا۔

بندرگاہ کی عمدہ سڑک پر آپ کی کار بیل گاڑیوں اور رنگ برنگ رکشاؤں کے ساتھ رک جاتی ہے۔ کسی چوک پر آپ یہ حسین تضاد دیکھ کر مسکرائیں گے اور آپ کا خیال دس سو سال پہلے کی شاہراہوں کی طرف چلا جائے گا۔ جن کے راستے جنگجو بادشاہوں کے سپاہی آئے تھے۔ بادشاہ تساعدیا نے اس بندرگاہ کا نام

"تسیت تے گونگ" رکھا تھا جس کا مطلب "جنگ نہیں چھڑنی چاہیئے" ہے۔

اس کے بعد عرب سے سمندر کے راستے تاجر آئے جو مصالحوں، گوند اور کافی کے ساتھ ساتھ اسلام کی تعلیمات بھی لائے جو بنگال کے لوگوں میں بڑی جلد پھیل گئیں۔ تساندیا کے قول و عمل میں زبردست تضاد تھا۔ یہ مقام جلد ہی قزاقوں اور غلاموں کی تجارت کا گڑھ بن گیا۔ کہا جاتا ہے۔ شہزادہ شجاع نے، جو شاہجہان کا دوسرا بیٹا تھا، تساندیا سے پناہ مانگی۔ اپنے بھائی سے بچ کر شہزادہ چٹا گانگ آیا اور رمضان کے مہینے میں دریائے کرنافلی کو عبور کر کے عیدگاہ نامی گاؤں میں نماز پڑھنے کے لیے گیا۔ تساندیا نے اسے پکڑ لیا اور بکرے کی کھال میں زندہ سلوا کر غرق کروا دیا۔ شجاع کے ساتھ کی عورتوں نے سمندر میں شہزادے کے ساتھ ڈوب کر اپنی عزت بچائی۔ بچ نکلنے والے لوگوں کی نسل سے کچھ لوگ آج بھی باقی ہیں۔ انھیں کمانچی کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ بڑے فخر سے آپ کو اس خانقاہ پر لے جائیں گے۔ جہاں شہزادہ نے آخری بار نماز پڑھی تھی۔ اب کوئی شہزادہ کرنافلی کے پار بھاگ کر نہیں جاتا۔ سیاح یہاں آ کر لطف اٹھاتے ہیں۔ ۱۹۶۰ء میں جب ملکہ الزبتھ مشرقی پاکستان کے دورہ پر آئیں تو "میری اینڈرسن" نامی جہاز میں بیٹھ کر انہوں نے اس دریا کی سیر کی تھی۔ بیس آٹھ آنے دیکر ایک کشتی میں سوار ہو گئی اور قریبی مقام پر اتر گئی، آپ آٹھ آنے دیکر "میری اینڈرسن" پر دور تک جا سکتے ہیں۔ یہ سفر بڑا پُر لطف ہے۔

چٹاگانگ میں چھوٹے سے سفر کے لیے آپ کشتی کی طرح جہاز پر بھی نہایت آسانی سے سفر کر سکتے ہیں۔ کاکس بازار کے علاوہ یہی جگہ

ہے جسے صحت افزا مقام کہا جا سکتا ہے۔ صاف ستھرے ساحل پر سمندر میں نہانے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ ناریل کے درخت کے نیچے دھوپ میں لیٹ جایئے۔ ساحل پر سیر کیجیے، اور رنگ برنگے انوکھے گھونگے جمع کیجیے، یا محض پانی میں پاؤں ڈال کر چھینٹیں اڑایئے۔ ساحل پر پکنک کے لیے جھونپڑیاں بنی ہوئی ہیں۔ ایک حکومت کا بنایا ہوا ریسٹ ہاؤس بھی ہے۔ جہاں ایک آدمی کے لیے کرایہ پانچ روپے یومیہ سے شروع ہوتا ہے۔ جیپیں ہر وقت مناسب کرائے پر مل جاتی ہیں اور صفائی کے انتظامات جدید ہیں۔

جب آپ چٹاگانگ کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کریں تو مقامی لوگوں کو بڑی خوشی ہوتی ہے۔ خصوصاً یہ بات کہ بارہ صوفیوں کی سرزمین ہے لوگوں کا تعلق کسی بھی مذہب سے ہو انہیں یقین ہے کہ ان صوفیوں کی روحیں صدیوں سے ان پر اپنی رحمت نازل کر رہی ہیں۔ شہر سے آٹھ میل دور بایزید بسطامیؒ کی درگاہ پر ہر سال ہزاروں عقیدت مندوں کا ہجوم ہوتا ہے۔

گنگا سے سینکڑوں میل لمبے ڈیلٹا کے مقابلہ میں چٹاگانگ بڑا فرحت بخش مقام ہے۔ یہاں مٹی کے ٹیلے نہیں ہیں اور پہاڑ سبزہ سے ڈھکے ہوئے ہیں سب سے اونچا پہاڑ مقدس چندرناتھ ہے جو سیتا کنڈ میں ہے۔ اور ایک ہزار ایک سو گیارہ فٹ بلند ہے اس پر چڑھ کر بڑا خوبصورت منظر دکھائی دیتا ہے۔ اور دُور فاصلہ پر شہر اور بندرگاہ نظر آتے ہیں۔ اگر آپ چاہیں تو گائیڈ کو ہمراہ لے لیجیے جس کا معاوضہ پانچ روپے سے شروع ہوتا ہے۔ سیتا کنڈ کے نزدیک

ضلع توکنال میں پہاڑوں کا ایک اور سلسلہ توں گنگا ہے جو ایک ہزار فٹ اونچے ہیں یہ سخت مٹی اور ریت کے بنے ہیں اور جگہ جگہ مٹی سے نکلتے ہوئے گلابی اور زرد پھول نظر آتے ہیں گویا ہوا انھیں بکھیر گئی ہو۔ سمندر کی خنک ہوا کی وجہ سے چٹاگانگ کا موسم بڑا خوشگوار رہتا ہے۔ یہاں نہ تو سخت گرمی پڑتی ہے نہ سخت سردی۔

ٹیلی گراف ہل پر آپ چشمے دیکھنے کے لیے جا سکتے ہیں جن کے پانی میں شفا بخش اثر ہے۔ ان چشموں پر خانقاہوں کی زیارت کا شدت سے انتظار کیا جاتا ہے۔ ہر طبقہ کے لوگ دور دور سے شفا حاصل کرنے کے لئے یہاں آتے ہیں۔ کچھ لوگ چارپائیوں پر آتے ہیں۔ اور چلتے ہوئے واپس جاتے ہیں اور تمام لوگ یہاں آکر دعا مانگتے ہیں۔ داخلہ کی کوئی فیس نہیں۔ ہر ایک کا خیر مقدم کیا جاتا ہے لیکن بہت سے بیمار لوگ متولیوں کو نذرانے دیتے ہیں تاکہ خانقاہ اور اس کے گرد باغ کو محفوظ رکھا جا سکے اور دوسرے زائرین بھی درگاہ اور چشموں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

چٹاگانگ میں پہلے لمحہ سے لے کر آخری دن تک آپ کی بڑی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ پھر چٹاگانگ کے پرخلوص لوگوں سے رخصت ہونا آپ کے لیے بیحد مشکل ہو جاتا ہے۔

رام گارتھ

ایشیائی اور انگریز ساری دنیا میں چائے کے شوقین مشہور ہیں۔ امریکی چائے پسند نہیں کرتے۔ سب جانتے ہیں کہ انھیں کافی مرغوب ہے۔ مشرقی پاکستان میں چائے کی انجمنیں اب میرا نام بھی "نازیست ممبر" کی حیثیت سے درج کر سکتی ہیں۔

اس نتیجہ پر میں رام گارتھ میں گرم گرم چائے کا تیسرا پیالہ پینے کے بعد پہنچی۔ میں مکرجی ٹی گارڈنز کے ٹھنڈے برآمدے میں بیٹھی ہوئی تھی۔ جہاں میں چائے کے بڑے بڑے باغات دیکھنے گئی تھی۔ یہ باغات نیو انڈیائی کمپنی کی ملکیت ہیں۔ یہ مقام آرام کے لیے بہترین جگہ ہے۔ جہاں ہر طرف خاموشی ہی خاموشی ہے اور نیلگوں آسماں تلے پام کے درختوں کے ٹھنڈے ٹھنڈے سائے پھیلتے ہیں۔

ہر طرف چائے کی کلیاں اور پتیاں اُگی ہوتی ہیں۔ آرام سے بیٹھ کر چائے کی مہک سے لطف اندوز ہوتے ہمیں اندازہ بھی نہیں ہوتا کہ اس میں کتنی بڑی قوت موجود ہے۔ پہلی چسکی کے ساتھ ہی بڑا سکون محسوس ہوتا ہے اور تمام تھکن رفع ہو جاتی ہے۔۔۔۔۔ آخر کیوں؟ اس لیے کہ چائے کی کاشت صرف ایسی

جگہ ہو سکتی ہے جہاں آب و ہوا گرم مرطوب ہو، خوب دھوپ پڑتی ہو اور کھلی ہوئی ڈھلوان پہاڑیاں ہوں۔ جس جگہ چائے کی کاشت ہوتی ہے سارا علاقہ خوشبو سے مہک جاتا ہے اور چائے پینے کو دل چاہنے لگتا ہے۔

رام گارتھ چٹا گانگ سے صرف اڑتیس میل دور ہے اور سیاح یہ سوچ کر خوشی سے جھوم جاتے ہیں کہ بس گھنٹہ بھر میں وہاں پہنچ جائیں گے۔ رام گارتھ کے لیے روانہ ہوتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ اڑتیس میل دنیا کا لمبا ترین سفر ہے۔ مناسب ہوگا کہ آپ جیپ، لینڈ روور یا ٹرک سے سفر کریں اور تقریباً آٹھ گھنٹے میں یہ فاصلہ طے کرنے کے لیے تیار رہیں۔ شہر سے نکلتے ہی جنگل شروع ہو جاتا ہے اور سارا راستہ بے حد دلفریب ہے۔ یہاں دلدلیں، قدیم گاؤں، گھنے جنگلات، پہاڑ، وادیاں اور تالاب سب اکٹھے ہو گئے ہیں آپ کو بے حد لطف آئے گا کیونکہ ایسا ہچکولے دار راستہ آپ نے پہلے کبھی نہیں دیکھا ہوگا۔

علی الصبح روانہ ہو کہ آپ شام کی چائے کے وقت رام گارتھ پہنچ جائیں گے۔ سارا راستہ خوبصورت مناظر سے بھرا پڑا ہے۔ دریا کے کنارے بیٹھ کر کھانے کا لطف اٹھائیے جہاں مچھیرے اُتھلے پانی میں جال ڈالتے ہیں اور ایک بار میں بیسیوں مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں۔ ان میں سرخ کیکڑے بھی ہوتے ہیں جنہیں آپ خریدنا چاہیں تو مچھیرے پیسے لینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ایک دو سگریٹیں ضرور قبول کر لی جاتی ہیں (اپنے ساتھ ایک آدھ فالتو ڈبیہ ضرور رکھیئے۔ مشرقی پاکستانیوں کے نزدیک سگریٹ پیسوں سے زیادہ قیمتی ہے)



بوڑھی گنگا میں کشتیوں کا مقابلہ

دریا کے کنارے لکڑیاں جلا کر ٹین کے ڈبہ میں آپ مچھلیاں اُبال سکتے ہیں۔ اس سے آپ کے کھانے کا لطف بھی بڑھ جائے گا اور آپ کو مقامی لوگوں سے بات چیت کرنے کا موقع بھی مل جائے گا جو بڑے سیدھے سادے اور پُر خلوص ہیں۔

بات شروع کرنے کے لیے آپ ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ کونسا راستہ اختیار کرنا بہتر رہے گا۔ یہ لوگ نہایت سنجیدگی سے آپ کو موسم کے مطابق راستہ

بتائیں گے۔ راستہ میں کچی اور کئی چھوٹی سڑکیں پڑتی ہیں اور بے شمار موڑ اور ڈھلانیں آتی ہیں لیکن مچھیرے جو راستہ بتائیں۔ آپ کو اسی پر جانا چاہیئے۔

بیس میل چلنے کے بعد آپ گھنے جنگلوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ ہائی وے کمیشن نے اس علاقہ میں بڑی عمدہ سڑکیں بنوائی ہیں۔ جنگلی جانوروں سے بھرے علاقہ میں یہ بڑا حیران کن اور جان جوکھوں کا کام تھا۔ سڑک کے بعض حصے بیحد تنگ ہیں ان سے گذرا جا سکتا ہے۔ دو رویہ اونچے اونچے ہر قسم کے درخت ہیں۔ آبنوس، سرو، برگد اور بانسوں کے درخت اکٹھے اگے ہوئے ہیں اور ان کی شاخیں آپس میں اس سختی سے گھتی ہوئی ہیں کہ یہ بند دروازہ معلوم ہوتا ہے ان جھاڑیوں کے پیچھے شیر اور چیتے یوں گھومتے پھرتے ہیں گویا انھیں لوہے کے دروازے کے اندر بند کر دیا گیا ہو صرف سانپ کبھی کبھار اس راستہ کو چیر کر باہر نکل آتے ہیں اور جیپ کے نیچے آکر کچلے جاتے ہیں یا کوئی لکڑ ہارا انھیں مار کر قیمتی کھال حاصل کر لیتا ہے۔

میں نے اور میرے ساتھی نے بندروں کے غول کے غول درختوں پر کودتے پھاندتے دیکھے۔ سڑک کو دیکھ کر سب شور مچا رہے تھے۔ ایک دو بندر تو ٹرک کے اگلے حصہ پر بھی اتر آئے اور تعجب سے دیکھنے لگے۔ اگر آپ انھیں پکڑنے کی کوشش کریں تو وہ بجلی کی تیزی سے کود کر بھاگ جاتے ہیں۔ مقامی لوگ بندر پکڑ کر بیچ دیتے ہیں جو دنیا بھر کے چڑیا گھروں میں بھیجے جاتے ہیں۔

اگلے دس میل کے راستے میں کوئی گاؤں نہیں ہے۔ صرف بارش سے کٹی پھٹی زمین ہے جس کی وجہ سے ہماری رفتار کافی سست ہو گئی۔ میں دھوپ میں

جلتے ہوئے مقامی لوگوں کو دیکھ کر حیران رہ گئی جو صرف ایک دھوتی پہنے سڑک کے کنارے کنارے جا رہے تھے۔ انھوں نے کندھوں پر بالنس کے موٹے موٹے گھٹے اٹھا رکھے تھے جو انھوں نے یقیناً جنگل کے کنارے سے کاٹے ہوں گے مجھے یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ وہ جاتے کس طرف ہیں۔

اپنی منزل سے تقریباً آٹھ میل پہلے ہم ایک چھوٹے سے بازار میں آرام کرنے کے لیے ٹھہر گئے جو راستے میں اچانک ہمارے سامنے آگیا۔ یہ لوگ ہندو تھے اور تمام عورتوں نے نتھنی پہنی ہوئی تھی۔ ہماری آمد ان لوگوں کے لیے اہم واقعہ تھا۔ تمام چائے والوں نے ہمیں چائے پینے کی دعوت دی، بچے ہمارے گرد جمع ہو گئے اور تمام لوگوں نے مجھے رنگ برنگ کپڑے پہنے بچوں کی تصویریں اتارنے میں مدد دی۔

گویّوں نے باجا بجا کر سنایا، بچوں کے والدین فخر سے مسکرا رہے تھے اور انھوں نے ہمیں دعائیں دے کر رخصت کیا۔ مجھے یقین ہے ہم لوگ کئی روز تک گفتگو کا موضوع رہے ہوں گے۔

خوبصورتی کے لحاظ سے آخری چند میل بے مثال ہیں۔ سرسبز کھیتیاں اور بل کھاتی وادیاں ہمارے راستہ میں بچھی ہوئی تھیں اور شام کی دھند نے سارے منظر کو ازلی خوبصورتی بخش دی تھی۔ دودھیا بادل جھاگ کے پردے معلوم ہوتے تھے اور ہم اس خوبصورتی کو دیکھ کر دم بخود خاموشی سے چلے جا رہے تھے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا گویا رام گارتھ کی سڑک پر ہم واحد انسان ہیں۔ الفاظ کی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔ ہم چاروں طرف خوبصورتی سے گھرے ہوتے تھے۔ جو چاتے کے

باغات میں پہنچ کر حقیقت میں بدل گئی۔ چائے کا وقت گذر چکا تھا پھر بھی ہندو مینیجر مسٹر مکرجی نے ہمارا پرجوش خیر مقدم کیا۔

وہ ایک چائے کے کاشت کار کا سب سے چھوٹا لڑکا تھا جس کے سلہٹ میں بہت سے باغات ہیں۔ مکرجی نے ہم سے کہا کہ ہم بہت خوش قسمت ہیں۔ یہ ہندو تہوار درگا پوجا کا زمانہ تھا اور ہمیں بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی۔ دھوئیں دار مشعلوں سے سارا ماحول روشن تھا اور زمین پر بے شمار سائے پڑ رہے تھے سرخ شعلوں نے بھیڑ کے خون کی سرخی میں اضافہ کر دیا تھا جسے شام پڑنے پر رسم کے طور پر ذبح کیا گیا۔ سٹیج کے گرد سرخ، پیلے اور سبز کپڑے اس طرح ہم آہنگ ہو گئے تھے گویا کسی ریاست کے غاروں سے ایک ڈیزائن کاٹ کر لگا دیا گیا ہو۔ جب رات پڑ گئی اور سیاہ آسمان تاروں سے بھر گیا تو ہندوؤں نے ڈھول اور باجوں کی گت پر گانا شروع کیا۔ یکساں اور مسحور کن دھن ایک دم سے تیز ہو جاتی جس میں کیڑے مکوڑوں کی آواز، اور دعوت میں حصہ لینے والے لوگوں کا شور اور ہنسی بھی شامل ہوتی تھی۔

ہم نے ایک بار پھر لذیذ چائے پی۔ روشنی سے منور سٹیج پر اس جگہ کے گرد رقص شروع ہو گیا جہاں بھیڑ کو ذبح کیا گیا تھا یہ رقص اس کی روح کے ایصال کے لیے تھا یا پھر غیر تکمیل شدہ خواہشات کے لئے۔ گنیش (مقدس بت جو لوگوں پر اپنی رحمت نازل کرتا ہے)، کا قدِ آدم بت اور دوسری دیویوں کی مورتیاں ترتیب سے رکھی تھیں گویا وہ بھی اس منظر کی کردار ہوں۔ بوڑھے لوگوں نے ڈھول پھر بجانا شروع کر دیا اور آگ پر نذریں اتارنے لگے۔ ہم

لوگوں کے لیے یہ عجیب وغریب نظارہ تھا کیونکہ ہم نے اس سے پہلے یہ تہوار نہیں دیکھا تھا۔ یہ تہوار ہر سال دسویں مہینے چاند کی دس تاریخ کو ہوتا ہے۔

بعد میں ہم نے مکر جی کے گھر کھانا کھایا اور رات خوبصورت گیسٹ ہاؤس میں گذاری۔ سارے مشرقی پاکستان میں ایسا جدید اور خوبصورت گیسٹ ہاؤس شاید ہی ملے۔ ہماری میزبانی میں ان لوگوں نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اگر ممکن ہو تو یہ مناسب ہوگا، کہ آپ باغات کے مالک کو پہلے سے اپنی آمد کی اطلاع دے دیں۔

آدھے میل کے فاصلہ پر ہندوستان کی سرحد ہے جس پر دونوں طرف کے سپاہی گشت کرتے رہتے ہیں۔ حالانکہ میں نے رات بالکل اپنے گھر کی طرح نہایت آرام سے گذاری تھی لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ چھ پاکستانی سپاہی ساری رات کھڑے پہرا دیتے رہے.... مکر جی نے کہا "آپ غیر ملکی مہمان ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ بالکل محفوظ رہیں۔"

صبح اٹھ کر میں نے چائے کے باغات کی سیر کی اور ان چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر چڑھ گئی جہاں چائے کی جھاڑیاں اُگی ہوئی تھیں۔ میں نے پتیاں توڑنے والی خوبصورت لڑکیوں سے بھی بات چیت کی اور اس خوشبودار پودے کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کیں جس سے ہم اتنا لطف اندوز ہوتے ہیں۔ جھاڑیوں کی روِش بڑی بھلی لگتی ہیں۔

چائے کا بیشتر حصّہ برآمد کیا جاتا ہے۔ یہ بہت عمدہ قسم کی چائے ہوتی ہے۔ کچھ حصّہ دوسری اقسام کے ساتھ ملایا جاتا ہے اور اس کی تیزی اور



ــــــ مشرقی پاکستان کا ایک گاؤں ــــــ

خاص مہک کی وجہ سے برطانیہ اس کا بہت بڑا خریدار ہے۔ ایک دن آپ یہ معلوم کرنے میں گزار سکتے ہیں کہ آخر پاکستانی چائے اتنی عمدہ کیوں ہے۔ یہ چائے حقیقتاً "بہت عمدہ ہے اور بے اندازہ فروخت ہوتی ہے۔ تمام مزدور باغات میں ہی رہتے ہیں۔ مالکان کی طرف سے بنوائے ہوئے سکول میں ان کے بچوں کو تعلیم دی جاتی ہے۔ ان میں سے بہت سے چائے کے کاشت کار بننے کی خواہش لے کر جوان ہوتے ہیں۔

رام گارنتھ ہندوؤں کا علاقہ ہے جو نہ صرف دنیا کی اقوام بلکہ اس پُرخلوص ملک کے لیے بھی چائے پیدا کرتے ہیں، جہاں وہ رہتے ہیں۔

دلکش سُندربن

سندربن کے گرد دریا کے چوڑے کنارے کبوتروں اور تیتروں کے لیے بالکل اجنبی جگہ ہیں اس خوبصورت علاقہ میں موٹی تازی براہمن مرغابیاں، بطخیں اور راج ہنس ملتے ہیں اور آپ رائل بنگال ٹائیگر کے علاقے میں پہنچ جاتے ہیں۔

سندربن رائل بنگال ٹائیگر کی سرزمین ہے جسے بڑے شکاری جنگل میں گھومتے دیکھنے کی آرزو رکھتے ہیں۔ شکار کے شوقین کے لیے، اس جگہ لامحدود مواقع موجود ہیں۔ قدرت کی رنگینیوں سے لطف اٹھانے والوں کے لیے بھی یہ علاقہ ان کی امید سے بڑھ چڑھ کر ہے۔

سندربن صرف لانچ کے ذریعے جاتے ہیں۔ کھلنا سے کشتی میں سندربن کے جنگلات تک جایا جا سکتا ہے۔ درختوں کے ڈوبے ہوئے جزیروں کے گرد قدرتی نہریں اور کھاڑیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ یہ عجیب و غریب نظارہ گرم علاقوں میں ایک غیر معمولی چیز ہے جانوروں کی اس سرزمین کے نام کی طرح سندربن میں ایک بالکل مختلف چھوٹی سی دنیا بسی ہوئی ہے۔ اس کا نام دریاؤں، کھاڑیوں اور نالوں کے جال پر پڑا ہے۔ یہاں بیالیس کھاڑیاں اور نالے ہیں جو جزیروں

سے بٹ گئے ہیں، یہ جزیرے گنگیتی ڈیلٹا کے پار کھلنا سے کلکتہ تک پھیلے ہوئے ہیں مشرقی پاکستان میں شکاری، آرٹسٹ اور مچھیرے سندربن کو اپنی خواہشات کے عین مطابق سمجھتے ہیں۔

انسان کتنی خواہش کرتا ہے کہ ایسی چھٹی گذاری جائے جہاں ایک دن وہ جنگلی جانوروں کا شکار کرے، دوسرا دن پرندوں کے شکار میں گذارے اور پھر آرام کرے مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایسی جگہ نکل جائے جہاں سڑکیں، دریا اور جنگل آپس میں مدغم ہوتے ہیں۔

یہ بالکل خواب معلوم ہوتا ہے لیکن یہ خواب اس وقت پورا ہو جاتا ہے۔ جب آپ کھلنا کے سفر کے لیے سٹیمر پر سوار ہوتے ہیں۔ آپ ہندوستان کی سرحد آنے تک سو سکتے ہیں اور پھر نیچے اتر کر سٹیمر کے واپس ہونے تک جو دل چاہتا ہے کیجیے اگر ممکن ہو تو ساتھ ہی خاندان کو بھی لے جائیے۔ وہ کشتی کے سفر سے بہت لطف اندوز ہوں گے اور جب آپ دن بھر شکار کرنے کے بعد رات کو لوٹیں گے تو آپ کی داستان سن کر محظوظ ہوں گے۔

دریا تے پور سے لانچ گذرتے وقت، جہاں گھڑیال دھوپ میں سوتے رہتے ہیں، ایک ماہر شکاری عرشہ سے ہی گھڑیال کو چھید سکتا ہے۔ اگر آپ کا نشانہ تیز ہے اور برچھی آنکھوں سے ہوتی ہوئی دماغ سے گذر گئی تو آپ نے انسان کے دشمن مگرمچھ کو مار گرایا۔ دریا کے کنارے کھڑے ہوئے جنگلی جانور بڑے رعب سے آپ کی طرف گھور کر دیکھتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں "ہم اسی زمین کے باسی ہیں۔ ہمارا حق اوّلین ہے" یہ دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ اگر

آپ اس کے سامنے کھڑے ہوں تو خود کو کتنا مجبور پائیں گے۔

سندربن بنگال ٹائیگر کا گھر ہے۔ اور یہ سچ مچ بڑے شاہانہ رعب والا جانور ہے۔ لیکن یہ شیر آسانی سے نظر نہیں آتا اور نہ اس پر حملہ کرنا آسان ہے۔ ایک آزمودہ کار شکاری بھی اس کے نزدیک نہیں آسکتا۔ کیونکہ زمین دلدلی ہے اور جنگلات غیر محفوظ۔ دریا کے کنارے گھنے جنگلوں میں درخت پر مچان میں بیٹھ کر شکاری شیر تو نہیں پکڑ سکتا البتہ قدرت کی عجیب و غریب چیزیں ضرور دیکھ سکے گا جنہیں دیکھنے کا موقع بہت کم لوگوں کو ملا ہے۔

شام کے وقت جب سورج کی شعاعیں پانی پر قوسِ قزح کے رنگ بکھیرتی ہیں ہرنوں کے غول رقاصاؤں کے انداز میں بھاگتے نظر آتے ہیں۔ شیر اپنے شکار کی تلاش میں نکلتا ہے اور چیتل اس کی بُو پاتے ہی بھاگ نکلتے ہیں۔ یہ جبلّت قدرت نے ہر جنگلی جانور کو ودیعت کی ہے۔

سائے اور خاموشی گہری ہوتی چلی جاتی ہے اور پھر اچانک ایک دلدوز چیخ سنائی دیتی ہے۔ دبے پاؤں چلنے والا شیر اپنا شکار کوئی اکیلا دکیلا پھرنے والا کالا خنزیر پکڑ لیتا ہے اور کبھی کبھار یہ آدمخور جانور پکڑا جائے تو شکاری کو انعامات سے نوازا جاتا ہے کیونکہ انسانی زندگی کے نقصان کا خطرہ کم کرنے کے علاوہ وہ مقامی لوگوں کے پرانے اعتقاد کو بھی پورا کرتا ہے۔ شیر کی مونچھیں پاؤں اور منہ کی بیماریوں کا تیر بہدف علاج سمجھی جاتی ہیں۔ اس کی چربی سارے پاکستان میں بڑی مہنگی ملتی ہے۔ بُری روحوں کو دور رکھنے کے لیے مرد اور عورتیں شیر کے ناخن گلے میں تعویز کے طور پر پہنتے ہیں۔ اور زبان

جسمانی بیماریوں کی بہترین دوا سمجھی جاتی ہے۔ کھانے سے پہلے اسے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹ کر پلیٹوں میں رکھا جاتا ہے۔ قدیم مسلمان جنگجوؤں کے بارے میں کہا جاتا ہے وہ شیروں پر نہ صرف حکم چلاتے تھے بلکہ ان پر سواری بھی کرتے تھے۔

لانچ پر ایک بار پھر سوار ہو کر آہستہ آہستہ آپ پائے بگبوگا پہنچ جاتے ہیں۔ جو سندربن کے علاقے میں مشرقی پاکستان کا سب سے تنگ دریا ہے۔ کپتان کو لانچ بڑی احتیاط سے چلانی پڑتی ہے کیونکہ یہ تنگی اس طرح پوشیدہ ہے کہ لانچ خشکی پر چڑھ جاتی ہے اور اس کے سرے دریا کے دونوں کناروں سے جا لگتے ہیں۔ اکثر بڑے بڑے سٹیمر یہاں آ جاتے ہیں اور دریا کے کناروں سے رگڑ کھاتے جنگل کے ساتھ سے گزرتے ہیں۔

لانچ اور سٹیمر کو نہایت آزمودہ کار ملاح چلاتے ہیں۔ جنہیں ان دریاؤں کے بارے میں پوری پوری معلومات حاصل ہیں۔ مسافر ان ملاحوں کو نہایت مہارت سے لانچ چلاتے بڑی تعریف کی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ لانچ کا کپتان بڑا باہمت آدمی ہوتا ہے جو تمام خطرات سے بچ نکلنا جانتا ہے۔

مون سون کے زمانہ میں دریا چڑھ جاتے ہیں اور ان میں کشتی چلانا خطرناک کام ہے۔ صرف چند لانچ والے ہی دریا عبور کرنے کی ہمّت کر سکتے ہیں۔

لیکن مون سون کے فوائد بھی ہیں۔ قدرت کی ہر خوبصورتی دھل کر نکل آتی ہے۔ بارش میں سنبل اور کنول جنگلی گھاس کی طرح اگتے ہیں۔ طوفان اور زلزلوں کے باوجود زمین پر جانوروں کے پنجوں کے نشانات نظر آتے ہیں اور اب ان کے



— سُندربن کے کنارے —

بارے میں سوچتے ہوئے کھو جاتے ہیں۔ کھلی جگہ پر عشق پیچاں دور دور تک پھیلی رہتی ہے۔

سندربن میں بڑے شوخ رنگ چمکتے ہیں اور درخت ایک نیا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ زبردست بارش کے بعد کڑی دھوپ لکڑی کو سکھا دیتی ہے اور مکان بنانے کے لیے درخت کاٹے جاتے ہیں۔ گول پتہ پودے کے پنکھا نما پتے دریا کے کناروں پر پھیلے رہتے ہیں۔ اسے توڑ کر مکانوں پر چھت ڈالنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔

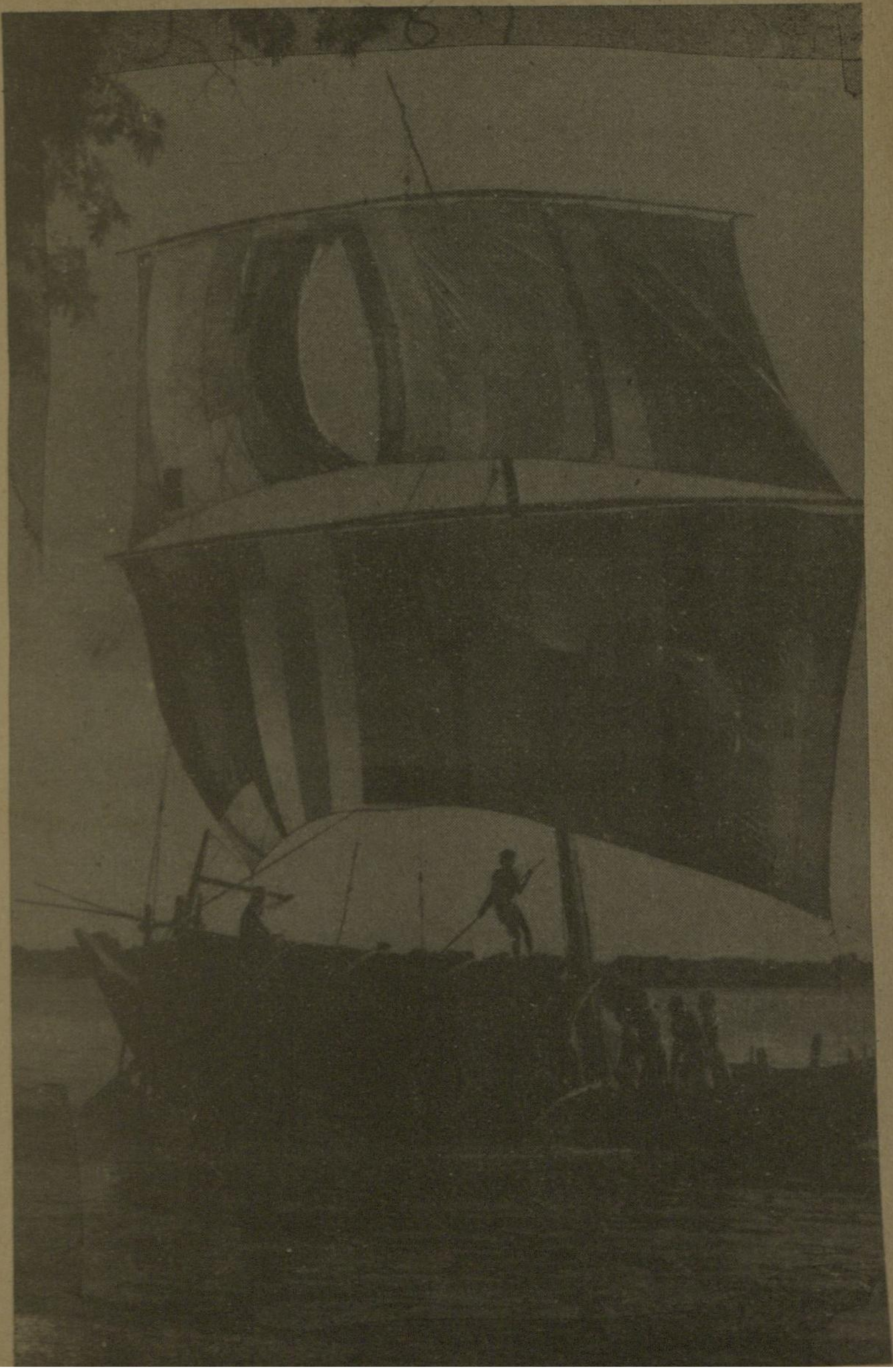
سندربن میں مچھلی کا شکار بڑا پُر لطف مشغلہ ہے۔ مشرقی پاکستان کے لیے اس علاقے سے سب سے زیادہ مچھلی آتی ہے۔ موٹی ہلسا مچھلی (جو مغربی پاکستان میں تقریباً ناپید ہے) بے اندازہ ملتی ہے۔ اور لاکھوں لوگوں کے استعمال میں آتی ہے۔ اسکی خوش ذائقہ خوشبو مچھلی کھانے والوں کو بڑا لطف دیتی ہے۔ مغربی پاکستان سے آنے والے پہلی بار ہلسا کھا کر بڑے خوش ہوتے ہیں جو مشرقی پاکستان کی خاص مچھلی ہے۔

سندربن کو قدرت کا تحفہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہاں خوبصورتی ہی خوبصورتی ہے۔ سندربن میں بے اندازہ پوشیدہ دولت ہے اور دُور دُور سے آنے والے سیاح اکثر سوچتے ہیں کہ اس کے پراسرار خزانوں کے پیچھے کیا چیز چھپی ہوئی ہے۔

کھلنا کو واپس ہوتے ہوئے کاپلمنی کا میلہ دیکھنے کی چیز ہے۔ ہندوؤں کا یہ میلہ نمائش کے اعتبار سے قابلِ ذکر سمجھا جاتا ہے۔ ہزاروں سال پہلے مہابھارت کے دور میں ہندو بادشاہ کاپلی کو' جو ریاست پوندرا کے بادشاہ باسودیو کا لڑکا تھا اس کی سوتیلی ماں نے ریاست کے دارالحکومت سے نکال دیا تھا۔ شہزادہ دریا کاپوتکشا

کے ساتھ ساتھ چلا آیا اور یہاں آکر بس گیا۔ وہ اپنا وقت عبادت میں صرف کرنے لگا اور مشہور رشی بن گیا۔ بارونی کے دن (چیترا (مارچ) کے مہینہ میں چاند کی تیئیسویں تاریخ)، اس کی عبادت قبول ہو گئی۔ اس دن کو منانے کے لیئے اس کے شاگردوں نے میلہ منعقد کیا اور کاپوتکشا دریا میں کھڑے ہو کر قسم اٹھائی۔ اس دن سے ہر سال یہ میلہ لگتا ہے اور ہفتہ بھر جاری رہتا ہے اس موقع پر ہزاروں ہندو جمع ہوتے ہیں اور دریا میں سالانہ غسل کرتے ہیں۔ اس جگہ کا نام رشی بادشاہ کاپل کے نام پر رکھ دیا گیا ہے۔

ہندوؤں کا کہنا ہے "اس کی روح آج بھی موجود ہے" اور اگر آپ میلہ کے بعد ٹھہر جائیں تو کاپل منی آپ پر اپنی رحمتیں نازل کرے گا اور آپ کے خیالات پُر مسرت رہیں گے۔



کرنافلی ملز اور ہائیڈل پراجیکٹ

ذرا اپنی چھٹی کے دوران تصور میں لائیے کہ آپ چمکتے ہوئے بانسوں کو کاغذ میں تبدیل ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ جب آپ عظیم کرنافلی پیپر ملز جاتے ہیں تو اسی قسم کی چیزیں دیکھنے میں آتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ مل مشرقی پاکستان میں ہی ہے اور آپ ڈھاکہ سے پی۔ آئی۔ اے کے جہاز میں چٹاگانگ کے راستے یہاں پہنچتے ہیں۔

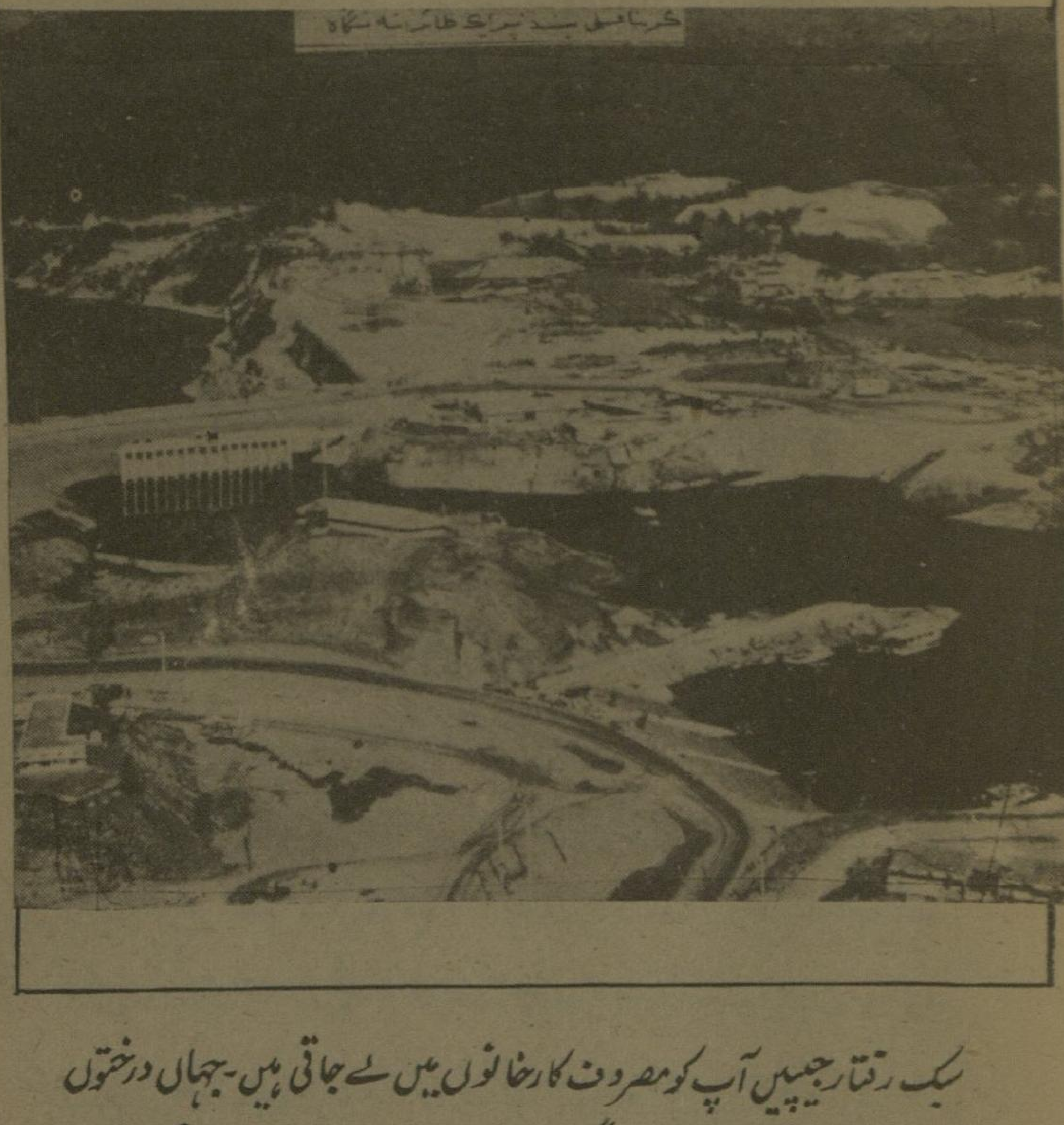
مشینوں کی اس آزاد دنیا دیکھنے کا لطف اسی وقت شروع ہو جاتا ہے جب آپ پہاڑی علاقہ میں چندر گونا جانے کے لیے چٹاگانگ سے کشتی میں لمبے دریائی سفر پر روانہ ہوتے ہیں۔ ہوا تازہ اور خنک ہے، پانی پرسکون ہے اور دریا کے کنارے آہستہ آہستہ نظروں سے اوجھل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کبھی کبھار پاس سے کوئی کشتی گذر جاتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی کشتیوں کو چلانے میں بنگالیوں کی مہارت دریائے ٹیمز میں کشتیوں کی دوڑ کی یاد دلاتی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ بنگالیوں کو دریاؤں اور سمندروں کا علم ورثہ میں ملا ہے۔ انھیں کشتی چلاتے دیکھ کر بہت لطف آتا ہے۔ سفر کرتے کرتے رات پڑ جاتی ہے اور لانچ کے عرشہ سے آپ دریا کی مسحور کن زندگی دیکھ سکتے ہیں۔ مچھیرے تیز تیز گھر جاتے نظر آتے ہیں اور ہاؤس بوٹ میں رہنے والے لوگ آپ کے پاس سے گذرتے رہتے ہیں۔ ستار اور

باجوں کی موسیقی دھند آلود رات پر چھا جاتی ہے۔ ہر طرف سے جگنو نکل پڑتے ہیں اور سیاہ آسمان پر ستارے جھلمل جھلمل کرتے ہیں۔ اگر دریا کا بہاؤ موافق ہو تو راستہ چار سے چھ گھنٹہ میں طے ہو جاتا ہے لہٰذا اپنے ساتھ کھانے کا ڈبہ یا کوئی ایسی چیز رکھیئے جو عرشہ پر پکائی جا سکے۔

سمندر میں چولہے پر مچھلی تلنے کا بڑا لطف آتا ہے۔ پھر گھر پر بھی تلی ہوئی مچھلی ملتی ہے۔ اس کا ذائقہ پکنک کے دوسرے مقامات پر ملنے والی مچھلی سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ آپ لانچ کے کپتان کے ساتھ ساحل پر اتر کر چھوٹے سے پہاڑی گاؤں میں خریداری بھی کر سکتے ہیں (جیسا کہ عموماً لوگ کرتے ہیں) اور تازہ پکڑی ہوئی مچھلی اور پہاڑیوں سے توڑی ہوئی پیاز اکٹھی کر سکتے ہیں۔ آپ کو خرید و فروخت کرتے ہوئے بڑے تعجب اور پر خلوص نظروں سے دیکھتے ہیں۔

جب میں چندر گونا پہنچی تو کشتی کے مدھم مدھم ہلکوروں سے مجھ پر غنودگی غالب آ چکی تھی۔ آنکھ کھلی تو پیپر ملز کا کوئی آدمی مجھے ریسٹ ہاؤس لے جانے کے لیئے انتظار کر رہا تھا۔ یہ ریسٹ ہاؤس بڑی خوبصورت جگہ ہے، تمام آسائشیں اور آرام مہیا ہیں اور کھانا بھی گرم گرم ملتا ہے۔

اگر ملز کے ڈائریکٹر کرنل خاں کو پہلے سے پیغام بھیج دیا جائے کہ آپ کرنافلی ملز دیکھنا چاہتے ہیں تو ہر سیاح کو فوراً دعوت نامہ مل جاتا ہے۔ صبح کو آس پاس کے علاقے کی خوبصورتی دیکھ کر آپ حیران رہ جاتے ہیں۔ سرسبز پہاڑیاں، پھول، اور خاموشی، جسے صرف چڑیوں کی چہچہاہٹ توڑتی ہے، دیکھ کر آپ کا دل ملز دیکھنے کو بھی نہیں چاہتا۔



کرنافلی بند پر ایک طائرانہ نگاہ

سبک رفتار جیپیں آپ کو مصروف کارخانوں میں لے جاتی ہیں۔ جہاں درختوں کے لمبے لمبے تنوں کے اونچے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ پہاڑوں پر پیدا ہونے والے بانس اور دوسری چیزیں کرنافلی ملز میں کاغذ بنانے کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کی لیبارٹری دیکھ کر، جہاں دھاتوں کی مشینیں، ٹیسٹ ٹیوبیں، چولہے اور کیمسٹری کے دوسرے آلات موجود ہیں، انسان دنگ رہ جاتا ہے یہ لیبارٹریاں ملز کا قلب ہیں اور کوئی دن ایسا نہیں جاتا جب کوئی نئی دریافت نہ ہوتی ہو۔ جس

سے کاغذ کی ساخت اور مضبوطی بہتر بنائی جا سکتی ہو۔ کاغذ ٹنوں کے حساب سے دیو ہیکل مشینوں سے نکلتا رہتا ہے۔ یہاں پڑھنے لکھنے والوں، چیزیں لپیٹنے، گھر کے استعمال اور دوسرے ہزاروں کاموں کے لیے کاغذ تیار ہوتا ہے۔ شاید کاغذ کی سب سے اہم قسم وہ ہے جس پر اخبار چھپتا ہے۔

کارخانے کی سیر سے بیش بہا معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ بڑی بڑی کرینیں لکڑی کے لٹھے اٹھائے عقابوں کی طرح فیکٹری میں ادھر سے ادھر جھولتی ہیں اور انھیں آسانی سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتی ہیں۔ عام حالات میں انھیں اٹھانے کے لیئے کئی آدمیوں کی قوت درکار ہے جب آپ گھر خط لکھنے بیٹھیں گے تو آپ کی نظر میں کاغذ کی اہمیت کچھ اور ہی ہو گی کیونکہ چندر گونا کے عظیم الشان کارخانے میں آپ نے کاغذ سازی کے تمام مراحل دیکھے ہیں۔

کرنافلی ملز کے ہزاروں مزدوروں کے لئے بنائے ہوئے مکانات بھی قابلِ ذکر چیز ہیں۔ ہر گھر کے ساتھ باغ ہے اور پھول، چوزے اور بھیڑ کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی وجہ سے اس جگہ کا ماحول کھیتوں کا سا لگتا ہے۔ بچوں کے لیئے اسکول ہیں، ہسپتال ہیں جہاں کرنافلی کی نئی نسل کے بچے پیدا ہوتے ہیں۔ اس شاندار انتظام کا سہرا کرنل سکندر خاں کے سر ہے جو سیاحوں کی میزبانی کرتے ہیں اور اپنا سارا وقت ملز پر صرف کرتے ہیں۔ سرسبز پہاڑیوں میں واقع اس کارخانے سے جانے کو دل نہیں چاہتا۔ لیکن لانچ آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ کپتائی کے کرنافلی ہائیڈرو الیکٹرکل پروجیکٹ جانے کے لیئے پچاس میل لمبے سفر کے دوران آپ کو سوچنے کا موقع ملتا ہے کہ جدید دنیا کی زندگی اس بنجر علاقے

میں کیسا انقلاب لا سکتی ہے اس علاقے میں میں نے دوسری رات کشتی پر گذاری اور صرف رات کے شور اور ملاحوں کے چپوؤں کی آوازیں سونا بڑا انوکھا اور آرام دہ تجربہ تھا۔ ناشتے سے پہلے میں اور میرے ساتھی دریا میں تیرنے کے لیے اتر گئے اور ڈیم دیکھنے کے لیے اترنے سے پہلے مچھوے شکاریوں کی طرح کشتی پر سوار ہوئے۔

یہ پروجیکٹ ایک معجزہ معلوم ہوتا ہے۔ زمین کو زرخیز بنانے کے لیے دریاؤں کو بھر دیا گیا ہے۔ پہاڑوں کو کاٹ کر نئی سڑکیں تعمیر کی گئی ہیں اور قدرت کے وسیع وسائل کو کام میں لا کر انسان کو قوت اور طاقت بخشی گئی ہے۔ بجلی گھروں میں پیدا ہونے والی بجلی کی مدد سے سارے مشرقی پاکستان میں نہریں بنائی گئی ہیں اور امریکی اور پاکستانی انجینئروں نے اسے مکمل کرنے کے لیے دن رات شانہ بشانہ کام کیا ہے۔

امریکی حکومت کی لاکھوں ڈالر کی امداد اور مقامی سرمایہ نے روپیہ کو قابلِ کاشت زمین اور روشنی میں تبدیل کر دیا ہے اور غریب سے غریب کسان کو وہ مواقع بہم پہنچائے ہیں جو پہلے میسر نہیں تھے۔ جس زمانہ میں یہ منصوبہ زیرِ تکمیل تھا۔ امریکیوں نے دریا کے کنارے اپنے لیے ایک چھوٹا سا شہر تعمیر کر لیا تھا اور اس کا نام ولٹن امریکہ، رکھ دیا تھا۔ یہاں بچوں کے لیے سکول، تفریح گاہیں اور ریسٹورنٹ تھے۔ منصوبہ پر کام کرنے والے پاکستانی بھی اکثر یہاں محفلوں میں حصّہ لینے کے لیے آتے تھے۔ ہر طرف خیرسگالی اور بھائی چارہ کا جذبہ نظر آتا تھا اور اس عظیم ڈیم کو مکمل کرنے کے لیے تمام لوگ خاندان کے افراد کی طرح کام کرتے تھے۔

ڈیم مکمل ہونے کے عرصہ بعد بھی وہ مزدور جنہوں نے اس کی آمدنی سے ریڈیو اور دوسری آرام کی چیزیں خریدی تھیں آج بھی نزدیک ہی گاؤں میں رہتے ہیں۔ اور ڈیم کو دعائیں دیتے ہیں۔ ان کے فخر میں امریکیوں سے دائمی دوستی کا جذبہ بھی شامل ہے جن کی مدد سے یہ ڈیم پایہ تکمیل کو پہنچا۔ استعمال ہونے والی امریکی مشینری اب حکومت مشرقی پاکستان کے دوسرے منصوبوں میں کام آ رہی ہے یہاں آنے والے سیاح ہائیڈل کیفے ٹیریا میں مشرقی اور مغربی کھانوں سے لطف اندوز ہو سکتے ہیں۔ پروجیکٹ کی سیر بڑا خوشگوار تجربہ ہے۔ اور اسے مہم بھی کہا جا سکتا ہے۔

رنگامتی

کرنافلی کے کنارے رنگامتی کی اپنی انفرادیت ہے۔ اور خوبصورت دکانوں اور پُرامن گاؤں کی وجہ سے اس کا مقابلہ شمالی یورپ کے کسی چھوٹے شہر سے کیا جا سکتا ہے۔

کپتائی سے لانچ کے ذریعہ دو گھنٹے میں آسانی سے رنگامتی پہنچ جاتے ہیں۔ ساحل پر پہنچ کر جانوروں کو دریا کی طرف لے جاتے ہوئے نوجوان نظر آتے ہیں ——— گویا یہ پرانے زمانے کا کوئی منظر ہو۔ کیونکہ گاؤں میں جگہ جگہ جھیلیں اور ندیاں ہیں۔ جہاں بچے نہاتے ہیں۔ عورتیں کپڑے دھوتی ہیں۔ اور مرد مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یہ ایسا مقام ہے، جہاں لوگوں کی اطلاع کے لئے نوٹس چسپاں نہیں کئے جاتے۔ بلکہ سرکاری ڈھنڈورچی اطلاع کو بار بار بنگالی، اُردو، مقامی زبانوں اور پھر رُک رُک کر انگریزی میں پڑھکر سناتا ہے۔ لوگ اشتیاق سے اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ اور بڑے انہماک سے اطلاع سنتے ہیں۔ ڈھنڈورچی کی بڑی عزت ہوتی ہے۔ اور وہ قدیم طرز کے سینگ کو منہ سے لگا کر چلّاتا رہتا ہے۔ جب کافی لوگ جمع ہوجاتے ہیں۔

تو وہ مسکراتا ہے۔ اور پائیڈ پائپر (Pied Piper) کی طرح آگے چل پڑتا ہے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے، لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل نکلتے ہیں۔ تمام کاروبار رک جاتا ہے، دکانیں بند ہو جاتی ہیں، مائیں اپنے بچوں کو اٹھا لیتی ہیں۔ اور سائیکل پر سودا بیچنے والے بھی بھیڑ میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اطلاع ہمیشہ اہم ہوتی ہے۔ کبھی کسی فیصلے کا اعلان ہوتا ہے، یا کوئی قانون منسوخ ہوتا ہے۔

کسی اجنبی کے لئے یہ ماحول بالکل کسی میلے کا سا ہے۔ اور مناسب یہی ہے کہ وہ بھی اس ہنگامہ میں شامل ہو جائے۔ ڈھنڈورچی کے اعلان کرتے وقت اس بھیڑ سے گزرنا ناممکن ہے۔ بلکہ اعلان سن کر بہت لطف آتا ہے۔ بھانت بھانت کے لوگ ایک دوسرے کو عجیب وغریب کہانیاں سناتے ہیں۔ جن کا ذکر کتابوں میں کہیں نہیں ملتا۔ باریش جوتشی اثبات میں اپنا سر ہلاتا ہے۔ زرد قبائیں پہنے سنجیدہ راہب تاجر اور ان کے ملازمین کھڑے آپس میں سرگوشی کرتے ہیں "غور سے سنو، بہت غور سے، اس نئے قانون کی پوری طرح تعمیل ہونی چاہیئے۔"

اس طرح آدھ گھنٹہ تفریح میں گزر جاتا ہے۔ اور سیّاحوں کو وہ زمانہ یاد آجاتا ہے، جب قصہ خواں خاص خاص موقعوں پر بازار اُٹتے تھے، اور لوگوں کو محظوظ کرتے تھے۔

بنگال ہمیشہ سے صوفیوں کا مسکن رہا ہے، جو پُر اثر عوامی کہانیاں



ایک ــــ چکمہ لڑکی

لکھتے ہیں۔ شروع میں یہ کہانیاں لوگوں کی توجہ کھینچ لیتی تھیں۔ مثلاً منیر سپیرے کی کہانی جس کے پاس جادوئی طاقت تھی۔ جب صوفی لوگ منیر کا قصّہ بیان کرتے تھے کہ وہ کس طرح منتر پڑھتے ہوئے مریض کے جسم پر مقدس پانی چھڑکتا تھا۔ تو اسقدر خاموشی ہوتی تھی کہ سوئی گرنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی۔ اور تمام لوگ بیان میں کھو جاتے تھے۔ "ہمارے بچّے کے ساتھ بھی یہی واقعہ پیش آیا تھا" وہ

آپس میں سرگوشیاں کرتے اور پھر ایک ایک لفظ سننے کے لئے ہمہ تن گوش ہو جاتے۔

وہ اپنے کام میں اتنا ماہر اور رحمدل تھا" صوفی کہانی سناتے ہوئے کہتا، کہ اپنی خدمات کے عوض پیسے لینے سے انکار کر دیتا۔ اور کہتا کہ یہ کسی مستحق آدمی کو دے دو۔ ایک دن منیر کی ملاقات ایک غریب فقیر سے ہوئی، جس کو سانپ نے کاٹ لیا تھا۔ اور وہ زمین پر بے ہوش پڑا تھا۔ منیر نے فوراً علاج شروع کر دیا۔ اور اپنا تمام علم آزما ڈالا۔ مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ فقیر مر گیا۔ منیر اپنی ناکامی پر بے حد رنجیدہ تھا، کیونکہ یہ اس کی پہلی شکست تھی۔ اچانک اس کے کان میں بچّے کے رونے کی آواز پڑی۔ یہ فقیر کی لڑکی تھی جو اپنے ماں باپ کے بغیر بے یار و مددگار رہ گئی تھی۔ منیر اسے اپنے گھر لے گیا، اور اُس کی پرورش کر کے اپنا دل بہلانے لگا۔ اُس نے بچّی کا نام منجورما رکھ دیا، اور اس کے کھیلنے کے لئے کھلونے اور پڑھنے کے لئے کتابیں لے آیا۔ بڑے ہونے پر منیر نے اس کی منگنی ایک نوجوان حسن سے کر دی، جس کے ساتھ وہ بچپن میں کھیلا کرتی تھی۔ شادی سے ذرا پہلے منیر نے محسوس کیا کہ وہ اس کی زندگی کا کتنا اہم جزو بن گئی ہے۔ چنانچہ اُس نے اس سے خود شادی کر لی۔ جب کہ بیچاری منجورما نوجوان حسن سے شادی کرنا چاہتی تھی۔ منیر کو تو وہ ہمیشہ اپنے باپ کی جگہ جانتی تھی۔ اس کی زندگی بالکل قیدی کی

سی ہو کر رہ گئی۔ اور ایک دن جب اُس نے کوئیں پر حسن کو دیکھا تو اس کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ دونوں کو معلوم تھا۔ کہ وہ ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے بھاگ نکلنے کا فیصلہ کر لیا۔ تین روز بعد وہ نکل کھڑے ہوئے۔ اور جنگلات، میدانوں اور دریاؤں کو عبور کرتے ہوئے دور چلے گئے۔ راستے کی صعوبتیں اٹھاتے آخر کار وہ کرنا فلی کے کنارے رنگامتی کے باہر ایک چھوٹے سے گاؤں میں جا پہنچے۔ اور وہاں اطمینان سے زندگی بسر کرنے لگے۔ بوڑھے منیر کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ غصّہ سے پاگل ہو گیا۔ اور اس نے قسم کھائی، کہ وہ حسن کو قتل کر ڈالے گا۔ اس نے ان دونوں کو بے حد تلاش کیا، مگر بے سود، ایک دن دریا کے کنارے اُسے دو سائے نظر آئے۔ اور وہ سمجھا کہ یہ حسن اور منجورما ہیں۔ وہ اندر کود پڑا۔ اور دریا میں ڈوب گیا۔"

یہ واقعہ سنانے کے بعد صوفی لوگوں سے یوں گویا ہوا:

"بھائیو" اللہ کو یہ ہرگز پسند نہیں کہ ہم اس چیز کی خواہش کریں۔ جو ہماری نہیں ہے۔ منیر ایک وفادار بیٹی کی محبت سے مطمئن نہیں تھا جو شادی کے بعد اس کے لئے خوشیاں لاتی۔ اور اس کے نواسے نواسیاں پیدا کرتی۔ وہ خود غرض بن گیا اور اس کو اپنا بنانے کی خواہش کرنے لگا۔ لہٰذا وہ اپنے سچے عاشق کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور منیر کو اپنی زندگی سے ہاتھ

دھونے پڑے۔"

یہ واقعہ سننے کے بعد کوئی شخص ایسا نہ تھا جس کی آنکھیں نہ بھیگ گئی ہوں۔

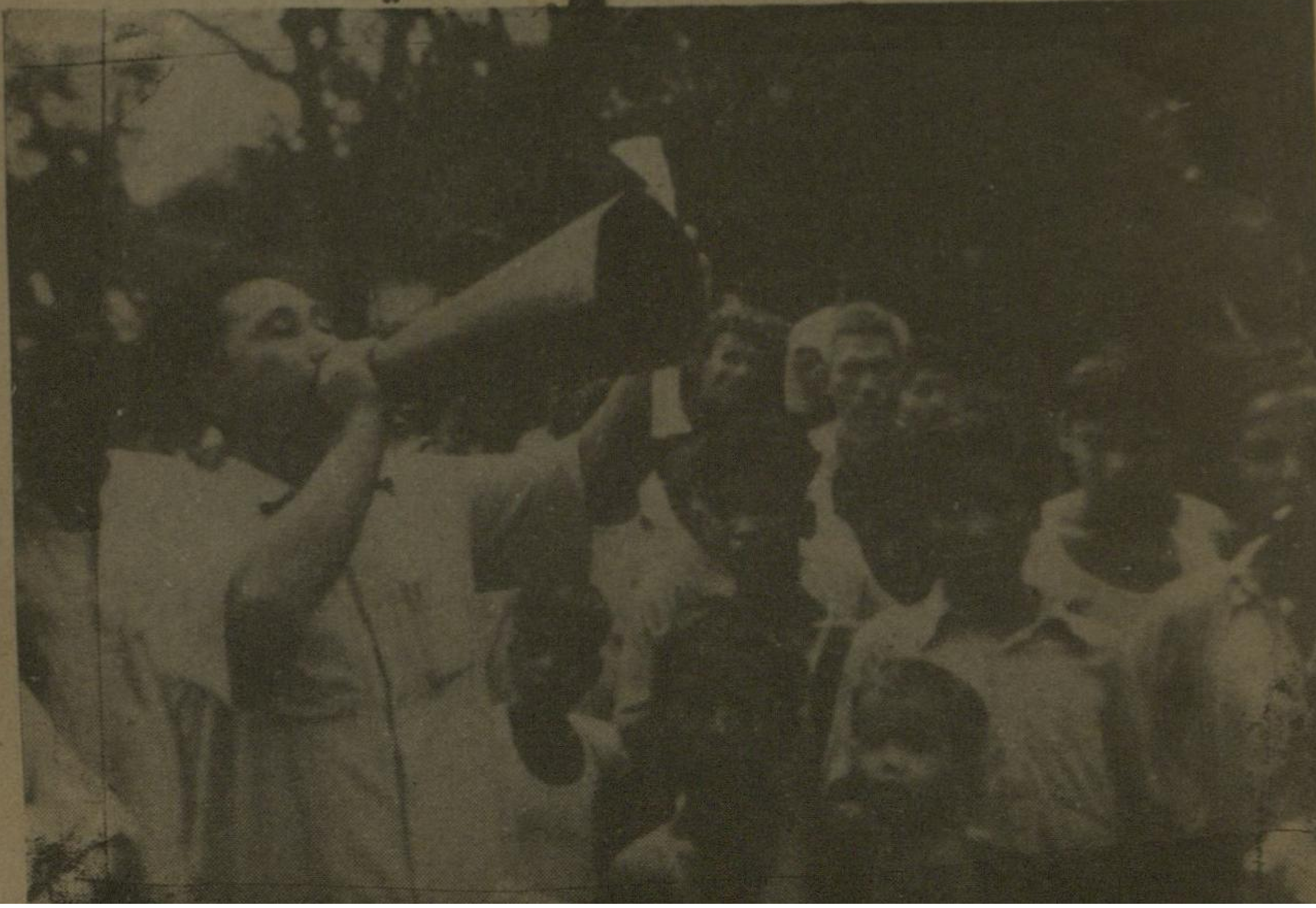
رنگامتی کے گیسٹ ہاؤس جاتے ہوئے آپ کو بھی کوئی ایسا آدمی مل سکتا ہے۔ یہاں کرایہ پانچ سے دس روپیہ یومیہ تک ہے۔ رنگامتی خالص سیاحوں کا شہر ہے۔ اور پہاڑی علاقوں کو جانے کے لئے مخصوص راستہ ہے۔ ایک گھنٹہ میں پیدل آپ اس کے وسط سے ہری بھری پہاڑیوں تک پہنچ سکتے ہیں۔ جہاں چکمہ قبائل خوش وخرم رہتے ہیں۔ یہ لوگ بدھ مت کے پیرو ہیں۔ اِن کا سربراہ کنگ رائے انگریز ماں اور ہندوستانی باپ سے ہے۔ اور بدھ مت سے تعلق رکھتا ہے۔ کنگ رائے اس علاقہ میں ہر روز اپنی عدالت لگاتا ہے۔ جلد ہی چٹاگانگ کے گرد ونواح میں جدید طرز کا ایک اور علاقہ تعمیر ہو جائے گا۔

اگر ضلع کمشنر کے ذریعہ پہلے سے وقت مقرر کر لیا جائے تو کنگ رائے اپنے خاندان کے ساتھ اپنے گھر پر آپ کا استقبال کرے گا۔ اسکی خوبصورت نوجوان بیوی اور ولیعہد آپ کے سامنے پیش کئے جائیں گے۔ دوستانہ گفتگو کے ساتھ ساتھ آپ مشروبات سے لطف اندوز ہوں گے۔ اور آپ غیر ارادی طور پر ان کی زندگی سے اپنی زندگی کا تقابل کرنے لگیں گے۔ لوگوں کی آمد پر یہ لوگ بھڑکیلا لباس پہنتے ہیں۔ مگر دوسرے چکمہ لوگ ایسا نہیں کرتے۔



رنگامتی کی تین شاداں و فرحاں بدھ لڑکیاں

رنگامتی میں ایک منادی کرنے والا



چکمہ قبائل کے بچے عموماً بالکل کپڑے نہیں پہنتے۔ اور ان کے جسم دھوپ میں جل کر بھورے پڑ جاتے ہیں۔ عورتیں صرف دھوتی استعمال کرتی ہیں۔ اور اپنے سر پر بھاری بھاری گٹھڑ اٹھائے چلتی ہیں۔ مرد بھی صرف اپنی کمر کے گرد کپڑا لپیٹ لیتے ہیں۔ یہ دبلے پتلے لوگ بڑی خوبصورت قوم ہیں۔ ان کے چہرے پر ہمیشہ مسکراہٹ کھلتی ہے۔ اور شاذ و نادر ہی رنجیدہ نظر آتے ہیں۔ یہ لوگ حد سے زیادہ سادہ زندگی گزارتے ہیں۔ اور جدید چیزوں کی بالکل پرواہ نہیں کرتے۔ ان کی ضروریات بے حد محدود ہیں۔ بانسوں کی بنیاد ڈال کر کھپریل کے گھر بنائے جاتے ہیں۔ جن کے آس پاس گائیں بھینسیں چرتی رہتی ہیں۔ چکمہ لوگ بالکل اسی طرح رہتے ہیں جیسے صدیوں پہلے ان کے آباؤ اجداد رہتے تھے۔ وقت اور ترقی نے ان پر کوئی اثر نہیں کیا۔ چکمہ لوگ بڑی مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ یہ طمانیت سیاحوں پر بھی اثرانداز ہوتی ہے۔ جو مشرقی پاکستان کے لوگوں کی فرقہ وارانہ ہم آہنگی دیکھ کر رشک کرتے ہیں۔ اگر کوئی سیاح کسی بچہ کو کوئی چیز تحفتاً دے تو وہ اس کی تعریف کر کے واپس کر دے گا۔ اسے معلوم بھی نہیں ہوگا، کہ یہ اسے تحفہ دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ لوگ کسی خدمت کے عوض کوئی چیز قبول نہیں کرتے۔

آپ دوسرے بدھ قبائل سے بھی مل سکتے ہیں۔ جن کے گاؤں جانے کے لئے صرف لانچ کے ذریعہ راستہ ہے۔ ان کے مکانات وادیوں کے اُوپر اونچی پہاڑیوں پر واقع ہیں۔ اور پرانے دور کی یاد دلاتے ہیں۔ کسان

اپنے قدیم اور فرسودہ آلات کے ساتھ صبح سے شام تک کام کرتے ہیں۔ اور ڈھلانوں پر بھیڑیں، چوزے اور گائے بیل آزادانہ چرتے پھرتے ہیں۔ اس علاقہ میں حکومت نے سیاحوں کے لئے ریسٹ ہاؤس بنوائے ہیں جو یہاں رات بسر کرنا چاہتے ہیں، صبح سویرے اٹھ کر سیاح پہاڑی علاقوں کے منظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اور چمکتی دھوپ میں بدھوں کے مندر نقرئی خانقاہیں معلوم ہوتے ہیں۔ سیاح اس علاقہ میں ایک ایک لمحہ عزیز جانتے ہیں پاس سے گزرتے ہوئے بدھ راہب انہیں دعائیں دیتے ہیں۔

رنگامتی واپس پہنچ کر ضلع کمشنر کے گھر ملاقات کے لئے جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ یہ مکان پہاڑی پر بنا ہوا ہے اور یہاں سے سارا شہر نظر آتا ہے۔ کمشنر اور ان کی بیوی کے خلوص کو دیکھ کر سیاح بہت خوش ہوتے ہیں۔ کمشنر کے فرائض میں مہمانوں کی خاطر تواضع بھی شامل ہے۔ یہ میاں بیوی بالکل اپنے ملک کے سفیروں کی طرح کام کرتے ہیں۔ اور اپنے فرائض کو وسیع کر لیتے ہیں۔ یہ سیاحوں کے لئے مختلف مقامات دیکھنے کا پروگرام بناتے ہیں۔ اور ان کے آرام کا پورا پورا خیال رکھتے ہیں۔ اگر مقامی سکولوں میں کوئی موسیقی کا پروگرام ہو رہا ہو تو آپ کو بھی مشرقی پاکستان کے حلیمہ بچوں کی کوشش دیکھنے کی دعوت دی جاتی ہے۔ جنہیں اپنے ملک سے بے حد محبت ہے۔ اور وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔

کاکس بازار

بنگال کا ساحل...... خلیج بنگال جہاں کاکس بازار کسی عورت کے جسم کے پیچ و خم کی طرح پھیلا ہوا ہے۔ اس کا میلوں لمبا ساحل ان کہانیوں کی یاد دلاتا ہے۔ جب سمندر کی حکومت ہوتی تھی اور سمندر کا دیوتا لہروں پر حکومت کرتا تھا۔ کاکس بازار میں سمندر اتنا پرسکون ہے۔ کہ لوگ ساحل سے بہت دور سمندر میں گھس کر غسل کر سکتے ہیں۔ اوپر نیلگوں آسمان ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے گویا سمندر کے پرے جھلملاتے پانی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہے۔

لوگ صرف ایک دن کے لئے کاکس بازار آتے ہیں۔ لیکن اتنی جلدی کبھی واپس نہیں جاتے۔ زیادہ دیر ٹھہرنے کی خواہش سمندر کی وجہ سے ہے ـــــ کاکس بازار کا چمکتا ہوا سمندر دن میں دھوپ اور رات کو ستاروں کی جھلمل جھلمل کرتی روشنی میں باتیں کرتا معلوم ہوتا ہے۔ ملاحوں کے اس قدیم شہر کا ساحل ستّر میل لمبا ہے۔ اور سارا راستہ جیپ چل سکتی ہے۔ جمے ہوئے ریت پر ننگے پاؤں چلنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ اور اس پر گھنی بیلیں اور خوشبودار پھول دُور دور تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ساحل پر دھوپ کا لطف اٹھانے والے کہتے ہیں۔ "یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے ہم پھولوں کی سیج پر لیٹے ہیں۔" چھوٹے چھوٹے ہزاروں سرخ کیکڑے سوراخوں میں آتے جاتے نظر آتے ہیں۔ بعض اوقات

ہوا کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے وہ بالکل سرخ ربن کی طرح لگتے ہیں۔ کاکس بازار میں سمندر صبح کو پرسکون ہوتا ہے، دوپہر کو تلاطم آجاتا ہے۔ اور شام کو پھر خاموش ہو جاتا ہے غروب آفتاب کے بعد یہاں تیرنے کا بے حد لطف آتا ہے۔ کشتیوں میں دریا عبور کرتے برمی مچھیرے بڑے بھلے لگتے ہیں۔ اور فاصلے سے یہ لوگ سمندر کی لہروں پر بدھ کے مجسمے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ غیر معمولی بندرگاہ چٹاگانگ کے جنوب میں اٹھاسی میل کے فاصلے پر ہے جنگلوں سے ڈھکی ہوئی ہزارہا جھونپڑیوں کی قطاریں دور تک چلی گئی ہیں۔ پکی سڑک کے ذریعہ نئی آرام دہ بس سیدھی یہاں آتی ہے۔ اور پی۔ آئی۔ اے کی ایئر بس سروس پچیس منٹ میں یہ سفر طے کرتی ہے۔ اس کا کرایہ صرف بارہ روپے ہے۔ بڑے بڑے دخانی جہاز تقریباً آدھے دن میں اس کے ساحل پر آ لگتے ہیں۔ کاکس بازار میں ہر طرف قدرت کی رنگینیاں بکھری ہوئی ہیں۔ اور سیاح خوبصورت پھول، کیلے اور ناریل کے درخت بانسوں کی جھونپڑیاں اور نقرئی جھیلیں دیکھ کر مسحور ہو جاتا ہے۔ مقامی لوگ، جو بیشتر بدھ مت کے پیرو ہیں۔ صرف ایک دھوتی باندھے یہاں تمام دن غسل کرتے رہتے ہیں۔ اُتھلے تالابوں میں چھینٹے اڑاتے ہوئے ننگے بچے کیوپڈ کی طرح لگتے ہیں۔ ان کے نزدیک کپڑوں کی کوئی اہمیت نہیں۔ لوگوں کی بسر اوقات مچھلی کے شکار، چاول کی کاشت اور کپڑا بننے پر ہوتی ہے۔ وہ صرف اپنی معمولی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے کام کرتے ہیں۔ تھوڑا سا کھانا، پینے کے لئے سگار (جو وہ اپنی فصلوں سے خود ہی تیار کر لیتے ہیں۔) اور تن ڈھانپنے کے لئے کچھ بھڑکدار کپڑے ان کی حاجت کو پورا کرنے کے لئے کافی ہیں۔ دل بہلانے کے لئے یہ لوگ ہاتھ سے بنائے ہوئے موسیقی کے

آلات بجاتے ہیں۔ اور پیدائش، شادی اور تہواروں کے موقعہ پر بینڈ بجایا جاتا ہے۔

تجارتی مرکز ہونے کی وجہ سے کاکسس بازار تنگ گلیوں سے بھرا ہوا ہے۔ جہاں ہر قسم کے دکانداروں کی بھیڑ رہتی ہے۔ ان کی دکانوں میں کھڑکیاں نہیں ہوتیں۔ دکانوں کے بڑے بڑے دروازے صبح سویرے ہی کھول دیئے جاتے ہیں۔ اور دوپہر کے وقت سورج کی تمازت سے بچنے کے لئے سب لوگ پڑ کر سو جاتے ہیں۔

تاریخی اعتبار سے اس شہر کا کوئی خاص پس منظر نہیں ہے۔ لیکن گذشتہ صدی میں ایک باہمت انگریز جہاز راں کاکس نے خلیج بنگال میں اس شہر کو اپنا مرکز بنایا۔ کپتان کاکس کو یہ دُور دراز، تنہا اور سنسان ساحل بہت بھایا۔ اس نے بہت سا تجارتی سامان گوداموں میں جمع کر لیا۔ اور واپسی پر اسے ساتھ لے گیا۔ وہاں کئی جھونپڑیاں بن گئیں۔ اور اس کے عملہ کے بہت سے لوگ یہیں بس گئے۔ آج بھی ہزاروں برمی لوگوں میں، جو یہاں کی آبادی کا بیشتر حصہ ہیں۔ کوئی کوئی نیلی آنکھوں اور سنہرے بالوں والا آدمی نظر آجاتا ہے جو کاکسس کے ملاحوں کی نسل میں سے ہے۔

کاکسس بازار میں مکانات سمندر کے کنارے ہیں۔ خوبصورت گورنمنٹ ریسٹ ہاؤس میں آرام دہ کمروں کا کرایہ صرف پانچ روپیہ یومیہ ہے۔ بال بچوں کے ساتھ آنے والوں کے لئے ان کے نجی مکانات بڑے آرام دہ ہیں۔ اور کرایہ بھی اسی حساب سے ہے۔ کھانا مناسب قیمت پر الگ ملتا ہے۔ لیکن آپ اپنا باورچی ساتھ لا سکتے ہیں۔ یہاں زرق برق کپڑے نظر نہیں آتے۔ کیونکہ ریسٹ ہاؤس اور مکان سمندر کے کنارے ہیں۔ اور تیراکی کا لباس مقبول ہے۔



کس بازار میں ایک بدھ عبادت گاہ

ساحل کے کنارے بچوں کے لئے کھیل کا میدان بھی ہے۔ جس میں جھولے اور دوسری چیزیں لگی ہوئی ہیں۔ لہٰذا تفریح کے لئے پورے خاندان کو اپنے ساتھ لے جائیے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر لوگوں کے ذاتی پیسے سے تعمیر کیا ہوا خوبصورت ٹینس اسٹیڈیم ہے۔ جہاں دوسرے کھیلوں سے دلچسپی رکھنے والوں کا بھی پورا پورا خیال رکھا گیا ہے۔ پر خلوص ڈسٹرکٹ کمشنر معمولی سے کرایہ پر جیپ دے دیتے ہیں۔ جو ریت پر چلنے کے لئے خاص طور پر بنائی گئی ہیں۔ اور سیاح سمندر

کے کنارے ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں بآسانی جا سکتے ہیں۔ دریا کی طرح پرسکون نیلے سمندر میں تیراکی کا بڑا لطف آتا ہے۔ اگر آپ کو نیند نہ آتی ہو تو کاکسس بازار کی ہوا کسی جادوگر کی دوائی کا سا اثر رکھتی ہے۔

اہلِ کاکسس بازار بدھ اور ہندو ہیں۔ اُن کے ذوق نے ہزاروں سال پرانے فن موسیقی اور ادب کی روایات سے ارتقا پائی ہے۔ یہ لوگ بنگالی بولتے ہیں۔ لیکن اردو اور کافی حد تک انگریزی بھی سمجھ لیتے ہیں۔ ان میں کچھ تاجر ہیں۔ کچھ اپنے پگوڈا نما گھروں میں سگار بناتے ہیں۔ لیکن بیشتر لوگ مچھیرے ہیں۔ جو مارشل لأ سے پہلے رات کے اندھیرے میں خلیج برما میں نکل جاتے تھے۔ اور منہ اندھیرے مچھلیوں کے علاوہ اور بھی بہت کچھ لے کر لوٹتے تھے! مارشل لأ کے بعد سے یہ لوگ صرف مچھلیاں پکڑتے ہیں! بہت سے لوگ بڑے اچھے درزی ہیں۔ اور سیاحوں کے کپڑے سی کر بڑی خوشی محسوس کرتے ہیں۔ بانس کی چٹائیوں پر آلتی پالتی مار کر وہ آپ کو بیٹھنے کے لئے کرسی اور گرم گرم چائے پیش کرتے ہیں۔ اور آپ کا آرڈر لیتے ہیں۔ جب آپ اس پیاری بندرگاہ سے رخصت ہونے لگتے ہیں۔ تو وہ تمام خاندان کے افراد کے ساتھ آپ کو خدا حافظ کہنے آتے ہیں۔ اور دعائیں دیتے ہیں۔ انہوں نے کبھی زیادہ پیسے نہیں لئے۔ اور آپ کے کپڑوں میں ایک ایک ٹانکہ بڑی محبت اور شفقت سے لگاتے ہیں۔ میں اپنے ساتھ بے شمار خوبصورت کپڑے لائی۔ جن پر میں بڑے فخر سے "کاکسس بازار میں بنے ہوئے" کا لیبل (اگر ایسے لیبل موجود ہوتے) لگا سکتی تھی۔ جو سمندر کے کنارے میرے درزی عبدالرزاق نے سیئے تھے۔

تقریباً دس میل دور بدھوں کا گاؤں راموہے۔ جہاں بڑی خوبصورت خانقاہیں ہیں۔ یہاں قیمتی پتھروں سے جڑے ہوئے مہاتما بدھ کے سونے کے نایاب مجسمے اونچی اونچی دیواروں پر ترتیب سے رکھے ہوئے ہیں۔ خانقاہوں میں بہت سے راہب رہتے ہیں۔ جو ہر روز عبادت کرتے ہیں۔ اور نہایت خوبصورتی سے متبرک چیزیں تراشتے رہتے ہیں۔ یہ سیدھے سادھے لوگ اجنبیوں سے ملکر بہت خوش ہوتے ہیں۔ اور سیاحوں کو تاریخی واقعات سناتے ہیں۔ اُن کے طور طریقوں سے برما، سیام اور جاپان کا رنگ جھلکتا ہے۔ اور آنے والے لوگ خانقاہوں میں رکھی ہوئی سینکڑوں چیزوں کے بارے میں پوچھے بغیر نہیں رہ سکتے۔

ایک خانقاہ کے اندر جب میں اپنے دوست دینو کے ساتھ گئی۔ تو ہم نے ایک بوڑھے راہب کو قریب المرگ دیکھا۔ جس نے اپنے آخری دن اسی خانقاہ میں گزارنے کو ترجیح دی تھی۔ ہمارے نزدیک پہنچنے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ اور پوچھا کہ ہمارے پاس پانی ہے۔ کیونکہ اس کا نوکر کہیں چلا گیا تھا۔ اور ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ میرے پاس صرف تھوڑی سی مری بیئر تھی۔ جو کھانے کے بعد بچ گئی تھی۔ میں نے بتایا کہ یہ بڑے عمدہ شیرہ سے کشید کی گئی ہے۔ اور میرے خیال میں اُسے تھوڑی سی پی لینی چاہیئے۔ اس نے دھیمی آواز میں مجھے بتایا۔ کہ راہب اکثر شراب کشید کرتے ہیں۔ اور اُسے اتنی سخت پیاس لگی ہے کہ وہ تھوڑی سی بیئر پی کر اطمینان محسوس کرے گا۔ "شاید اس سے مجھے نیند آجائے"۔ اُس نے کہا۔ "اگر مجھے نیند آگئی تو بڑا سکون ملے گا —— کاش مجھے نیند آجائے"۔

لیکن دینو کا خیال کچھ اور ہی تھا۔ وہ مجھ پر برس پڑا "آپ مرتے ہوئے راہب کو پینے کے لئے بیئر کس طرح دے سکتی ہیں۔ اسکی موت واقع ہو سکتی ہے۔"

"دینو"، میں نے جواب دیا، "میرے خیال میں یہ بات نہیں ہے۔ برطانیہ میں حاملہ عورتوں کو جو ادر بیل کی شراب دی جاتی ہے۔ اور پھر وہ خود مانگ رہا ہے۔"

دینو غرایا — "آپ پاگل ہو گئی ہیں۔ وہ حاملہ نہیں ہے۔ آئیے یہاں سے چلیں۔" میں ہنس پڑی اور بڑی آہستگی سے راہب کا سر اٹھا کر اُسے گرم بیئر کا بھرا گلاس پینے میں مدد دی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرایا۔ پھر اس نے آنکھیں بند کر لیں اور ہمارے چلنے سے پہلے ہی گہری نیند سو گیا۔ (مجھے آج بھی اس کے بالوں بھرے سر کا لمس یاد ہے)، اُسی شام کاکس بازار لوٹتے ہوئے ہم دیکھنے لگے کہ اب راہب کا کیا حال ہے۔ ہم نے اسے بیٹھا ہوا پایا۔ وہ خوش باش نظر آتا تھا۔ اور بیئر کے لئے ترس رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

کاکس بازار میں ہر دن نیا واقعہ ساتھ لاتا ہے۔ پرانی عمارتوں کو دیکھتے ہوئے آنکھوں کے سامنے ازمنہ وسطیٰ اور بدھ مت کا دور گھوم جاتا ہے۔

جولاہے کھلی دکانوں میں بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔ اور ساڑھیوں، سکارف اور میز پوشوں پر خوبصورت رنگ دار ڈیزائن بناتے ہیں۔ جو ہاتھوں ہاتھ بک جاتے ہیں۔ شام پڑنے پر ریسٹ ہاؤس کے سامنے سمندر میں تیرنے کا بیحد لطف آتا ہے۔

ریسٹ ہاؤس میں رات کے کھانے کے ساتھ اکثر رقص بھی ہوتا ہے۔ ستار اور دوسرے سازوں کی دھن پر لڑکیاں مشرقی پاکستان کے خاص رقص پیش کرتی ہیں۔ ان کا لباس بڑا دلکش ہوتا ہے۔ یہ گلابی اور زرد دھوتیاں اور ململ کے

بلاؤز پہنتی ہیں۔ اور پاؤں میں مخمل کی بری چپلیں ہوتی ہیں۔ تمام لڑکیاں بالوں میں پھولوں کے ہار گوندھتی ہیں۔ یہ تندرست و توانا لوگ پاکستان کے لئے باعثِ فخر ہیں۔ اور خواہ وہ مشرق میں رامو گاؤں کے رہنے والے ہوں یا جنوب میں تکناف اور نیلا کے (رامو کی طرح کے دوسرے گاؤں) سب لوگ آپس میں رشتہ دار معلوم ہوتے ہیں۔

قریب ہی جنگلات میں شور مچاتے بندر خاموشی توڑتے ہیں۔ کسی ہاتھی کو آتا دیکھ کر کالی گلہریاں اور خرگوش اِدھر اُدھر بھاگتے ہیں۔ اور سمندر کے دور جنگل میں جانوروں کی اپنی دنیا آباد ہے۔ جہاں خوبصورت چڑیاں اُڑتی پھرتی ہیں۔ مور ناچتے ہیں۔ اور ہزاروں سُرخ چونچ والے طوطے آسمان پر اڑتے ہوئے بڑے بھلے لگتے ہیں۔ بعض حصوں میں شکار کی اجازت ہے۔ اور دریا اور سمندر میں مچھلی کا شکار تو عام ہے۔ سمندر میں غوطہ خوروں کے لئے یہاں بڑے مواقع ہیں۔ کیونکہ اس علاقے میں موتیوں والی سیپیاں بہت ملتی ہیں۔

کاکسس بازار میں سیاحوں کی دلچسپی کے لئے تمام چیزیں موجود ہیں۔ اور روانگی سے پہلے ریسٹ ہاؤس سے ساحل کے کنارے نزدیکی مقامات تک بآسانی جایا جاسکتا ہے۔ صرف آدھا میل چلکر آپ سمندر کے اوپر درختوں سے ڈھکی خوبصورت پہاڑی پر پہنچ جاتے ہیں۔ جو پکنک کے لئے بہترین جگہ ہے جنوب مشرق میں سات میل کے فاصلے پر چینداہے۔ شکار کے لئے اس سے اچھی کوئی اور جگہ نہیں۔ رات کو ٹھہرنے کے لئے ڈاک بنگلہ کرائے پر لے لیجئے، جہاں ایک آدمی کے لئے صرف پانچ روپیہ کرایہ ہے۔ صبح کو ناشتے کے بعد

باہر نکل جایئے اور اپنے کھانے کے لئے خود شکار مار کر لایئے۔ جنگلی کبوتر، مور اور ہرن یہاں عام ملتے ہیں۔ آپ "عالم پناہ" رائل بنگال ٹائیگر کی بھی ایک جھلک دیکھ سکتے ہیں۔ جو چینداک کے جنگلات میں رہتا ہے۔ آس پاس کی جھیلیں بطخوں سے بھری ہوئی ہیں۔ چھوٹی سی کشتی میں بیٹھ کر دوربین کی مدد سے آپ ان کی ایک ایک حرکت دیکھ سکتے ہیں۔ اور سورج کی روشنی میں آپ کا نشانہ بالکل صحیح بیٹھ سکتا ہے۔ یہ پرندے بڑے سُست ہیں۔ اور نہایت آسانی سے پکڑے جاتے ہیں۔ دوپہر کے کھانے کے لئے بنگلے پر ٹھہر جایئے۔ اور تین بجے پھر قسمت آزمائی کیجئے۔ جب دھوپ سے پرندے سُست پڑ جاتے ہیں۔ اور غول کے غول آسانی سے نشانہ بن جاتے ہیں۔ شام کے کھانے پر آپ کے شکار کئے ہوئے انواع واقسام کے پرندے موجود ہوں گے۔

رات فرحت بخش طور پر ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اور آپ کی کشتی کے ساتھ پانی سرگوشیاں کرتا چلتا ہے۔ غروبِ آفتاب کا منظر بڑا تابناک ہوتا ہے۔ اور تنہائی آپ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ ساحلِ سمندر پر پکنک منانے کے لئے انانی کے خوبصورت میدان صرف بیس میل دور ہیں۔ ساحل پر پام کے درخت پھیلے ہوئے ہیں۔ پسِ منظر میں کشتیاں بڑی خوبصورت لگتی ہیں۔ اس علاقہ میں شکار کے لئے بہترین جگہ گارجانیا ہے۔ جو مشرق میں بیس میل دور رامو روڈ پر برما کی سرحد پر ہے۔ یہ پہاڑی علاقہ ہے اور گھنے جنگلوں سے گھرا ہوا ہے۔ یہاں پھل اور سبزیاں جنگلی جھاڑیوں کی طرح اُگتی ہیں۔ گارجانیا کے جنگلوں میں ارنا بھینسے، ہاتھی اور خوبصورت چڑیاں بھری ہوئی ہیں۔ بے شمار دیہاتوں میں سے سانڈ یا گو دیکھنا

ہرگز نہ بھولیئے جو کاکسس بازار سے دریا کے ذریعہ گھنٹے بھر کے فاصلے پر ہے۔ یہاں ہزاروں سبز کبوتر، طوطے، مینا، کوئلیں اور بلبلیں نظر آتی ہیں۔ ساحل رنگ برنگ گھونگھوں سے بھرا ہوا ہے۔ یہاں مچھلی کا شکار بڑا پرلطف مشغلہ ہے مچھلیاں سمندر سے باہر نکلی چلی آتی ہیں۔ اِس جگہ کو چھوڑنے کو آپکا دل نہیں چاہے گا۔

کاکسس بازار خوبصورت چیزوں سے بھرا ہوا ہے۔ اور ہر شخص کی دلچسپی کا سامان موجود ہے۔ یہ افریقہ کے جنگلات، برطانیہ کی خاموش جھیلوں اور امریکہ کے فلوریڈا کی شوخی سے بڑی مماثلت رکھتا ہے۔ اس کو دیکھنے کے لئے زیادہ پیسوں کی بھی ضرورت نہیں۔ یہاں سے روانہ ہوتے وقت مجھے ان چیزوں کا خیال آیا۔ جو میں نے نہایت کم خرچ پر دیکھ لی تھیں —— بدھوں کے گاؤں اور ان کے پرخلوص لوگ، پرسکون پہاڑیاں اور خوفناک جنگلات، سمندر کی اونچی اونچی لہریں اور وہ تمام چیزیں جو ایک شہر سے دوسرے شہر جاتے نظر آتی ہیں اور اٹھاسی میل کے سفر کے بعد آپ پھر دنیا میں لوٹ آتے ہیں۔

اب سامان باندھیئے۔ اور اُن اَن گنت چیزوں کے بارے میں سوچیئے۔ جو کاکسس بازار میں آپ کی تفریح طبع کے لئے موجود ہیں۔ کون ہے جو یہاں قدرت کی رنگینیوں سے انکار کرے گا۔

شخصيات

تعارف

اب میں اس عظیم الشان اسلامی ملک کے چند لوگوں کی تصویر پیش کرتی ہوں، جو آج پاکستان کے معاشرتی، تعلیمی، ثقافتی، صنعتی اور تجارتی میدان میں سرگرم عمل ہیں۔
ان لوگوں میں سے ہر ایک نے اپنے وطن کی مدد کے لیے کوئی نہ کوئی خاص کام ضرور کیا ہے، انہوں نے اس کی مالی امداد کی ہے، انفرادی کوششوں سے اسے فائدہ پہنچایا ہے، کثیر رقوم کے عطیات دیئے ہیں اور پاکستانی نوجوانوں کے لیے وظیفے مقرر کئے اور ادارے قائم کئے ہیں، تاکہ ملک کو فائدہ پہنچے اور اس کا مستقبل درخشندہ ہو۔ یہ ثابت کرنے کے لیے کہ جب کوئی شخص ہر وقت مصروف کار رہنے کا عزم بالجزم کرلے تو اس کی عمر اس کے راستے میں حائل نہیں ہو سکتی، میں بڑے فخر سے رحیم بخش خان کا نام پیش کرتی ہوں، جو ان چند احباب میں سے سب سے زیادہ معمر ہیں، لیکن ان کا دل اتنا جوان ہے کہ وہ اس چیز کے دے دینے میں کبھی دریغ نہیں کرتے جو ان کے ہم وطنوں کی فلاح و بہبود کے لیے مفید ہو، وہ پینٹ کے کاروبار میں ایک پُرسحر شخصیت کے مالک ہیں۔

مسٹر اختر حسین



ذہنی سکون اور اطمینانِ قلب کا صحیح لطف وہی روحیں اُٹھا سکتی ہیں جو یہ جانتی ہیں کہ جہاں تک ممکن ہُوا ہے انہوں نے ہمیشہ نیکی کی ہے۔ یہ ایک ایسی خوشی ہے، جس کی نہ مثال ہے اور نہ جسے زوال ہے۔ کسی بھی دوسرے سرچشمے سے یہ مسرت حاصل نہیں ہو سکتی۔ زندگی کے باسٹھ برس میں اپنے ہمنفسوں کے ساتھ پیہم نیکیاں کر کے اختر حسین صاحب ایک دائمی سکون حاصل کر چکے ہیں۔ اور انہیں وہ ذہنی خوشی میسّر ہے، جس کے لیے بنی نوعِ انسان تلاش میں رہتی ہے۔

۱۹۴۸ کے ابتدائی ایّام میں نوخیز پاکستان مہاجرین کے سیلاب کی زد میں تھا ہزاروں بلکہ لاکھوں لٹے پٹے مہاجرین، پریشان حال اور غم واندوہ کی تصویر بنے لاہور آرہے تھے لوٹی ہوئی ویران ریل گاڑیاں، نادار بے گھر اور اپنے رشتہ داروں سے بچھڑے ہوئے ہزاروں مہاجرین کو لیے آرہی تھیں۔ اس وقت ان مہاجرین کی فوری نگہداشت اور افہام و تفہیم کی ذمہ داری۔ پختہ کار اختر حسین کے ذمہ دار ہاتھوں میں دی گئی ــــــ جو

اس وقت سابق مغربی پنجاب کی نئی حکومت کے چیف سیکرٹری اور فنانشل کمشنر تھے۔ یہ ذمہ داری بڑی کٹھن اور بڑے پیمانے کی تھی کیونکہ لاہور تو مہاجر مسلمانوں کے لیے پاکستان میں داخل ہونے کا دروازہ تھا، مختصر سے جسم، مگر وسیع دل کے مالک اختر حسین اس عظیم مسئلے سے عہدہ برآ ہونا جانتے تھے۔ پُر ہجوم مہاجر کیمپوں سے وہ یکسر خانماں برباد خاندانوں کو اٹھاتے اور انہیں پنجاب یا شمال مغربی علاقوں میں ایکڑوں زرخیز زمینوں میں آباد کر دیتے۔ اس مبارک کام کے دوران میں انہیں کوئی چھ لاکھ کے قریب مہاجرین کی بحالی کا موقع نصیب ہوا۔

دس برس بعد جب پاکستان میں مارشل لاء نافذ ہوا تو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ایوب خان نے مغربی پاکستان میں زرعی اصلاحات کے اطلاق کے متعلق سوچا۔ انہوں نے صدارت کا عہدہ سنبھالتے ہی جناب اختر حسین کی سربراہی میں لینڈ ریفارمز کمیشن قائم کر دیا۔ اب ایسے انسانی دماغوں کی ضرورت تھی جو زمین اور زرعی پیداوار سے متعلق پوری طرح باخبر ہوں، مزارعوں اور مالکان اراضی دونوں کے مسائل اچھی طرح سمجھتے ہوں، جاگیردارانہ نظام کے پسے ہوئے چھوٹے لوگوں کے لیے معاشی انصاف کا مکمل شعور رکھتے ہوں۔ اختر حسین نے اس چیلنج کو گرمجوشی سے قبول کیا۔ سارے زمیندار اس وقت دہشت زدہ تھے کہ خبر نہیں کیا ہونے والا ہے لیکن اپنے واضح الفاظ، افہام و تفہیم اور عملی اقدامات سے گورنر نے وہ نتائج برآمد کیے کہ اب خوفزدہ زمیندار شکر گذار تھے کہ وہ اپنی توقعات سے زیادہ زمین کے مالک رہ گئے ہیں۔ کسی کو لوٹا نہیں گیا تھا۔ یہ حل جذبات اور تشدد پر مبنی نہیں تھا بلکہ ایک سائنسی نوعیت کا تھا۔ ۶۰۰۰ کے قریب زمینداروں میں ایک خاص نسبت سے زمین تقسیم کر دی گئی۔ اکتوبر ۱۹۵۸ء میں اختر صاحب نے کام شروع کیا جنوری ۱۹۵۹ء

میں انہوں نے رپورٹ پیش کی اور اسی برس مارچ میں زرعی اصلاحات قانونی طور پر ایک مصدقہ حقیقت بن چکی تھیں۔ اختر صاحب نے اس امر کا خاص خیال رکھا کہ غریب مزارعین کو اتنے ایکڑ زمین مل جائے کہ وہ کسی دقت کے بغیر اپنا کام شروع کر سکیں۔ بے شمار جفاکش اور محنت شعار مزارعین اچانک اور بڑے پُرمسرت طریقے سے اپنی ذاتی زمینوں پر ہل چلا رہے تھے۔ ۲۲ لاکھ ایکڑ زمین زندگی میں پہلی مرتبہ ان کی تحویل میں آئی تھی۔ اس انبساط کے موقع پر وہ گورنر کے انتہائی ممنون تھے کہ ان کی ذاتی دلچسپی سے انہیں یہ دن دیکھنا نصیب ہُوا تھا۔ اسی لیے مغربی پاکستان میں کسی کو اخباروں میں یہ خبر غیر متوقع نہیں لگی تھی کہ ان کی خدمات کے صلے میں صدرِ پاکستان نے اختر حسین صاحب کو 'ہلالِ پاکستان' کے اعزاز سے نوازا تھا۔ اختر صاحب ایک ایسے انسان ہیں جو ہر کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے عادی ہیں۔

اختر صاحب سی۔ پی کے شہر برہانپور میں ۵ مارچ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ علی گڑھ اور سینٹ جان کالج کیمبرج میں تعلیم حاصل کی۔ ۲۲ برس کی عمر میں سول سروس کی ملازمت کے ساتھ ساتھ ان کی شادی بھی ہو گئی۔ بعد میں وہ مختلف اضلاع میں اسسٹنٹ اور ڈپٹی کمشنر کے انتظامی عہدوں پر مامور رہے۔ ان کے دوسرے تمام عہدے پنجاب کی حکومت سے متعلق ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان کی تعمیر میں ان کا نہایت اہم حصہ ہے۔ ۱۹۵۱ء میں کراچی ایڈمنسٹریشن کی تنظیمِ نو کے لیے ان کی خاص ڈیوٹی لگائی گئی تھی اور بعد میں لارڈ بوئڈ آر کی ایگریکلچرل کمیٹی کی مجوزہ سفارشات کے لیے ماہرین کی کمیٹی کے چیئرمین بن گئے۔ ۱۹۵۰ء میں انہوں نے تمام مشرقِ وسطیٰ، یورپ اور امریکہ کا دورہ کیا، اس کے بعد وہ ستمبر ۱۹۵۷ء میں مغربی پاکستان کے گورنر مقرر ہوئے اور اس کے بعد وزیر امورِ کشمیر

اور وزیر تعلیم بنے۔

گورنر کی حیثیت سے انہوں نے اہلِ قلم کی بہبود میں ہمیشہ دلچسپی لی اور انہیں ہر ممکن سہولتیں بہم پہنچائیں۔ دوسرے ملکوں اور شہروں کے لوگ ان سے بڑے دوستانہ ماحول میں مل سکتے تھے۔ اپنی حسِ مزاح، اور بے تکلفانہ انداز کے باعث وہ حلقۂ احباب میں بڑے ہردلعزیز تھے۔ ان کا مختصر سا چہرہ بڑے تاثرات کا حامل ہے۔ ان کی دوربیں نگاہیں وہ سب کچھ دیکھ لیتی ہیں جسے دوسرے نظرانداز کر دیتے ہیں۔ اس گہرے مشاہدہ کے طفیل ہی ان کی قوتِ ادراک بڑی تیز ہے۔ وہ بہت متحمل مزاج اور ٹھنڈے دل کے مالک ہیں۔ اسی لیے جب نیشنل پریس ٹرسٹ کے چیئرمین کے انتخاب کا مرحلہ آیا تو سارے حصہ داروں نے کسی تامّل کے بغیر انہیں اپنا صدر منتخب کر لیا تھا۔ نیشنل پریس ٹرسٹ کے اس عہدے کے لیے اختر حسین موزوں ہی نہیں بلکہ نہایت مناسب شخص تھے۔ نیشنل پریس ٹرسٹ نے اخبارات کا معیار بلند کرنے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کا ہر حصے دار "سٹیکر" کہلاتا ہے۔ اور یہ سبھی ایسے افراد ہیں جنہوں نے ملک کی بہبود و ترقی کے لیے اپنی دولت کا بہت بڑا حصہ وقف کر رکھا ہے۔ مستحق انسانوں کی مدد، غریب طلبہ کو تعلیمی سہولتیں اور اسی قسم کے رفاہِ عامہ کے دوسرے کاموں میں ان کا نمایاں حصہ ہے انہوں نے ایک بورڈ آف ٹرسٹیز بنا رکھا ہے۔ اس میں پشاور یونیورسٹی، ڈھاکہ یونیورسٹی اور راجشاہی یونیورسٹی کے وائس چانسلر، انجمن ترقیٔ اُردو کے صدر، منصوبہ بندی کمیشن کے ڈپٹی چیئرمین اور مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی کے ڈائریکٹر شریک ہیں۔ علماء و فضلاء کی اس شاندار فہرست کے دو ممتاز ٹرسٹی غلام فاروق اور ایم۔ اے زنگون والا سربراہ ہیں جو تین برس تک ان کے نمائندے کی حیثیت رہیں گے۔

پریس ٹرسٹ کی سربراہی کے ایام کی ہر روشن صبح کو اختر حسین اپنے دفتر میں موجود ہوتے ۔ اپنی زندگی بھر کے تجربے، تدبّر اور عقلمندی سے وہ اپنی اس ذمّہ داری سے عہدہ برآ ہونے کی سعی میں رہتے ۔ تین بیٹوں، ایک بیٹی (چاروں شادی شدہ ہیں اور بڑی پُرمسرت زندگی بسر کر رہے ہیں) اور ایک خوشدل بیوی پر مشتمل ان کا خاندان تصنّع اور تکلّف سے بے نیاز بڑی پیاری اور سادہ زندگی بسر کر رہا ہے ۔ اللہ کے فضل سے ۔ انواسے نواسیاں اور پوتے پوتیاں بھی ان کی طمانیت قلب کے لیے مل گئے ہیں ۔ ان ننھے منّوں میں سے ایک یا دو ضرور اختر صاحب کے ہاں ہوتے ہیں ۔ اختر صاحب جو ہمیشہ جوان دکھائی دیتے ہیں، ان سے خوب کھیل رہے ہوتے ہیں ۔ انہیں کھیلوں کا شوق نہیں ہے بلکہ ان کے اپنے الفاظ میں دفتری اوقات کے دوران ان کی لامتناہی مصروفیات کے علاوہ ان کی زندگی کا اطمینان صرف ان کے خاندان سے وابستہ ہے ـــــ"

گھریلو زندگی میں اس قدر خوش رہنے والے اختر حسین آج کل انجمن ترقیٔ اُردو کے ذریعے اردو کی خدمت میں مصروف ہیں ۔



امیر علی فینسی

اس مسلمان کو بطورِ وطن کے پاکستان سے جس قدر محبت ہے، اس قدر اپنی جائے پیدائش سے نہیں ہے۔ امیر علی فینسی سمندر پار (افریقہ میں) اپنے گھر کے آرام و آسائش میں پیدا ہوئے۔ مگر ذاتی مفادات کو قربان کر کے اپنے عزیز و اقارب کو خیرباد کہا اور ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کی جدوجہد میں شرکت کے لیے برِّ عظیم کا رُخ کیا۔

اس آزمائشی دَور میں اسمٰعیلی فرقہ کے اس اہم رکن نے اس بھاری فنڈ کی دیکھ بھال کی ذمہ داری سنبھالی جو ہز ہائی نس آغا خان کے پیروکار کراچی روانہ کرتے تھے۔ پاکستان کی اسمٰعیلی فیڈرل کونسل کا صدر بننے سے قبل آپ اپنی برادری کے رہنما تھے۔ آپ جہاں بھی جاتے ہیں ہر شخص فوراً اس بات کا اندازہ کر سکتا ہے، کہ لوگوں کے درمیان کوئی اہم شخصیت موجود ہے۔

آپ جن کمپنیوں کے ڈائریکٹر ہیں ان کے ملازموں کی تعداد چار ہزار تک پہنچتی ہے مگر ان میں نسل و فرقہ کا امتیاز روا نہیں رکھا جاتا بلکہ زیادہ اہمیت کام کی

لگن، اہلیت اور محنت کی خواہش کو دی جاتی ہے۔

امیر علی فینسی چالیس سال قبل عباسہ کی بندرگاہ میں پیدا ہوئے۔ نیلگوں بحرِ ہند نے آپ کی مختلف دلچسپیوں اور اہلیتوں کے لیے پس منظر مہیا کیا اور شادی سے قبل اوائل عمر ہی میں آپ نے شہری اور تجارتی انجمنوں اور اداروں میں کام کر کے نام پیدا کیا (آپ کی شادی ۱۹۳۷ء میں ہوئی) مشرقی افریقہ میں آپ صوبائی و سپریم کونسلوں کے اہم رُکن بنے اور ٹانگانیکا میں آپ پہلے شخص تھے جس نے کافی تعداد میں امدادِ باہمی کی تنظیموں کے قیام میں مدد کی۔ فینسی گروپ (جو آپ کے خاندان کا قائم کردہ تھا) صنعتی اداروں اور معدنی ترقی کے منصوبوں کا مالک تھا مگر قائدِ اعظمؒ کی دعوت پر ان لوگوں نے اپنے نصف سے زیادہ کاروبار کو خیرباد کہا تاکہ غیر مسلم تاجروں کے انخلا سے پیدا ہونے والے خلا کو پُر کر سکیں۔ ان غیر مسلموں کا خیال تھا کہ پاکستان کے منصۂ شہود پر آنے کے فوراً بعد ان کے چلے جانے سے اس نئے ملک کی معیشت تباہ ہو جائے گی۔ امیر علی فینسی نے اپنے خاندان کے چند ارکان کے ہمراہ افریقہ کو خیرباد کہا اور پاکستان کی ترقی کے لیے اپنے سرمایہ اور وسائل کے ہمراہ نئے ملک کا رُخ کیا۔

ان کی حالت ایک نو آزاد سرزمین میں نوواردوں کی سی تھی۔ چاروں طرف ایسے لاکھوں مصیبت زدگان تھے جن کو تیار شدہ اشیاء کی نسبت خوراک اور رہائش کی زیادہ ضرورت تھی۔ موجودہ وسیع کاروبار کی تعمیر میں کئی سال لگ گئے۔ یہ عرصہ امیر علی اور ان کے بھائیوں نے تنہائی میں گزارا۔ اس کے بعد ان کے اہلِ خانہ اور بچے ان کے پاس پاکستان پہنچ گئے۔

اس کے بعد فینسی خاندان کی قسمت کا ستارہ مائل بہ عروج رہا۔ اس کی ایک وجہ میرے نزدیک مسٹر فینسی کی انتہائی دیانت ہے۔ آپ اس وقت چھتیس کمپنیوں کے چیئرمین اور ڈائریکٹر ہیں۔ جن میں بینک، تیل صاف کرنے کے کارخانے، صنعتیں سٹیل کارپوریشن، جوٹ مل، فینسی گروپ اور فینسی فاؤنڈیشن کے علاوہ پاکستان میں آغاخان کے تمام کاروباری ادارے بھی شامل ہیں۔

مسٹر فینسی "نیکی کر دریا میں ڈال" کے قائل ہیں۔ اور جب کوئی شخص جوبلی انشورنس کمپنی کی عظیم الشان عمارت کی طرف دیکھتا ہے۔ جس کے قیام کا فیصلہ ۱۹۵۲ میں آپ کے روحانی راہنما نے کیا تھا تو اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ بدلہ کا خیال کیے بغیر دوسروں کے لیے بھلائی کرنا اپنا معاوضہ آپ ہے۔

چند ماہ قبل کامرس بنک کے پہلے سالانہ اجلاس سے بطور چیئرمین خطاب کرتے ہوئے آپ نے بنک کی سرمایہ کاری کو مزید وسعت دینے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اگر ہمیں یہ مقصد حاصل کرنا ہے کہ بنکنگ سروس کو آبادی کے زیادہ سے زیادہ حصے تک پہنچایا جائے تو نظام بنکاری کو اس قدر وسعت دی جانی چاہیئے کہ بڑے شہروں سے دور کم ترقی یافتہ علاقوں میں کم حیثیت لوگوں کو قرضہ کی سہولتیں مہیا کی جاسکیں۔

"کم حیثیت لوگوں" کے لیے آپ کے جذبات ایسے ہی ہیں۔ جیسے کہ عام لوگوں کے ہیں۔ آپ اپنے چپڑاسیوں سے بھی ایسی ہی نرمی سے پیش آتے ہیں جیسے اپنے ڈائریکٹروں کے ساتھ جن کو آپ نے پورے اختیارات تفویض کر رکھے ہیں۔ آپ کے دفتر کی دیواریں مشرقی پاکستان کے جنگلوں کے آبنوس کی لکڑی سے ڈھکی ہوئی ہیں،

اور یہاں کا ماحول ازحد خوشگوار ہے۔ یہ کمرہ اپنے مالک کی باوقار سادگی اور ذاتی پسند کا مظہر ہے۔ جس کی دیوار پر (بنگالی فنکار کی) آئیل پینٹنگ آویزاں ہے۔ اس صاف و آراستہ کمرے میں آپ کے بڑے ڈیسک کے اوپر قائداعظم کی تصویر آویزاں ہے۔ جس میں قائداعظم گویا شفقت سے مسکرا رہے ہیں۔ اس کے سامنے ایک شیلف پر چاندی کے فریم میں جڑی ہوئی آپ کے روحانی رہنما کریم آغاخاں کی تصویر ہے۔

آغاخاں کے لیے آپ کی عقیدت کی کوئی انتہا نہیں آغاخاں کا مکتوب ہر ہفتہ آپ کے پاس آتا ہے آپ نے مجھے بتایا کہ آغاخاں میرے روحانی راہنما ہیں اور میں ان کے لیے سب کچھ کرنے کے لیے تیار ہوں۔ کیونکہ آغاخاں بھی دوسروں پر ازحد مہربان ہیں۔ اور صرف ہماری زندگی بہتر بنانے کے طریقوں پر غور کرتے رہتے ہیں۔ آپ نے مجھے آغاخاں کا خط بھی دکھایا۔ خط میں ایک سکول کے دورہ کا ذکر کیا گیا تھا۔ جہاں آپ کے خیال میں طلباء کی تعداد نسبتاً زیادہ تھی۔ خط میں مسٹر فیینسی کو ہدایت کی گئی تھی کہ سکول میں دو کمروں کا اضافہ کر دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی خط میں اس قدر معروف آدمی کو تکلیف دینے کی معذرت بھی کی گئی تھی۔ مسٹر فیینسی نے پُرمسرت الفاظ میں بتایا کہ متذکرہ سکول میں تین کمروں کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور آغاخاں اس سے ازحد خوش ہوئے ہیں۔ اس خاموش اور آرام دہ کمرے میں مجھے ان دو اہم شخصیتوں کی مشترکہ کوششوں کے متعلق بتایا کہ جو مختلف النوع کاروبار میں مصروف ہیں۔ مگر اس کے باوجود عوامی بہبود کے لیے شانہ بشانہ کام کر رہی ہیں۔ آغاخان کی حالیہ تجویز کے تحت ایسے منصوبوں کو عملی جامہ پہنایا جائے گا جن کے تحت جدید ترین فوجی ایجادات کو دنیا کے پسماندہ علاقوں کی ترقی کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ یہ تجویز اس اعتماد کا ایک

حصّہ ہے جو آغا خاں کو اسمٰعیلی فیڈرل کونسل کے اس صدر پر ہے۔ اسمٰعیل فیڈرل کونسل۔ اپنے فرقہ کی عملی امداد میں مصروف ہے۔

اس کے تحت تمام ملک میں امدادِ باہمی کی ساٹھ انجمنیں قائم ہیں اس کے علاوہ آغا خاں کا خیراتی وقف بھی کام کر رہا ہے جس نے کریم آباد میں رہائشی سہولتیں فراہم کی ہیں۔ گو امیر علی فینسی سب سے زیادہ کاروباری اداروں کے مالک ہیں۔ مگر آپ کو اپنے بھائیوں خصوصاً چچا زاد بھائی جیمی فینسی کے تعاون پر گہرا اعتماد ہے۔ اپنی بے شمار مصروفیتوں کے باوجود آپ اپنی بیوی اور چار بچوں کے ہمراہ اپنی گھریلو زندگی نہایت سکون کے ساتھ بسر کر رہے ہیں۔ آپ کی بیگم تمام عمر آپ کے لیے روحانی سکون کا باعث رہی ہیں۔ آپ کا سب سے بڑا بیٹا آپ کے نقشِ قدم پر چلنے کا ارادہ رکھتا ہے اور ابھی سے اس کو ابتدائی کاروبار کی تربیت دی جا رہی ہے۔ کیونکہ مسٹر فینسی کا خیال ہے کہ اس طرح اس کو ضروری قابلیت وسیادت کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ حتیٰ کہ وہ تمام کاروبار کی باگ ڈور سنبھال لے۔

ڈاکٹر جاوید اقبال



"عظیم انسانوں کی زندگیاں ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں، کہ ہم بھی اپنی زندگیوں کو شاندار بنا سکتے ہیں اور جاتے وقت ہم وقت کی ریت پر اپنے نقشِ قدم چھوڑ کر جا سکتے ہیں"

لانگ فیلو نے جب یہ غیر فانی الفاظ لکھے تو وہ یقیناً اس وقت کم سن اقبال کو نہیں جانتا ہوگا لیکن یہ اس وقت شاعر کے لیے ایسے موزوں رہے، جیسے یہ اسی کے لیے قلمبند کئے گئے تھے۔ اقبال کی زندگی شاندار تھی۔ اس لیے کہ یہ ان کی خواہشات کے عین مطابق تھی۔ اور جب وہ رخصت ہوئے تو انہوں نے نقشِ قدم ہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ چھوڑا۔ اور ان کی زندگی داستانِ اسلام کا ایک سنہری ورق ہے۔ ان کے نظریات، فلسفہ، تخلیقی تصورات اور شاعری آج پاکستان کے مذہبی اور ثقافتی سرمائے میں بیش قیمت جواہر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور ہر طالب علم محض ان کے ذکر سے ہی علم کے موتی سمیٹ لیتا ہے۔ لیکن اقبال نے قوم کے لیے اس قابلِ قدر سرمائے سے

بھی کچھ زیادہ ورثہ چھوڑا۔ اس نے قوم کو ایک بیٹا دیا —— ایک بیٹا —— جس کو انہوں نے بچپن سے ہی اپنے پسندیدہ راستے پر چلنا سکھایا —— جاوید —— وہ اس نام سے اسے پکارتے تھے۔ اور جاوید نامہ انہوں نے اس کے اور اپنے ابدیت کی طرف مقدس سفر کے متعلق لکھا۔ بغیر کسی خوف کے، وہ خوبصورت، میٹے اور انوکھے اشعار سناتے رہے اور اپنے بسترِ مرگ سے سرہانے بیٹھے دوستوں سے کہتے رہے کہ میرے بیٹے کو یہ سب کچھ سکھا دینا۔ آخری سانس کے ساتھ ان کے لبوں نے یہ سرگوشی کی۔

نسیمے از حجاز آید نا یید — سرودے رفتہ باز آید نا یید
سر آمد روزگارے ایں فقیرے — دگر دانائے راز آید نا یید

جواں سال جاوید اقبال اس وقت سولہ سال کے تھے جب ان کے عظیم والد نے لاہور میں اپنے گھر میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ جاوید کی بہن ان سے بھی کم عمر تھیں اور صرف دس برس کی تھیں۔ ان کی والدہ دو برس پہلے فوت ہو چکی تھیں۔ یہ دونوں یتیم اکیلے رہ گئے تھے لیکن ان کی جرمن آیا اور خادمہ کی مشفق شخصیت کی موجودگی رحمت ثابت ہوئی اس کی محبت اور الفت اس قدر مادرانہ تھی کہ والدین کی کمی کا احساس اس قدر شدید نہ ہونے پایا اور یہاں تک کہ جاوید کی تعلیم اسی انداز سے جاری رہی جو اس کے والد نے اس کے لیے منتخب کیا تھا۔ جاوید، اقبال کا مطالعہ ایک عبادت سمجھ کر کرتے تھے۔ اور انہوں نے ان کے ایک ایک خیال اور ایک ایک لفظ کو ازبر کر لیا۔ وہ مسکراتے ہوئے اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ جب وہ سکول میں زیرِ تعلیم تھے تو انہیں اپنے والد سے بے حد محبت تھی۔ اگرچہ انہیں ان کے زبردست دماغ اور ان کے نظریات

کی قوت کا احساس نہیں تھا۔ ایک دن جب ان کے ہم مکتب بچوں نے دریافت کیا کہ تمہارے والد کا ذریعۂ معاش کیا ہے، انہیں یاد ہے کہ انہوں نے اس کا جواب بہت گھبرا کر دیا تھا۔ کچھ بھی نہیں۔ وہ تو بس گھر میں بیٹھے رہتے ہیں اور شعر لکھتے ہیں۔"

تھوڑے عرصے بعد ہی اقبال کے فرزند ہونے کا احساس ان کے کردار سے جھلکنے لگا۔ انہوں نے اس احساس کو ایک غلاف کی طرح اوڑھ لیا اور ان کے نظریات کے ساتھ گھومتے پھرتے انہیں فخر محسوس ہونے لگا۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے کیا۔ پھر پانچ برس کیمبرج اور دو برس لندن میں فلسفے میں پی۔ایچ۔ڈی کے لیے صرف کیے اور ساتھ ہی بار ایٹ لاء بھی ہو گئے۔ کیمبرج میں قیام کے دوران میں انہوں نے فلسفۂ سیاسیات کی تشکیل کے مفصل مطالعہ کے لیے درخواست دی۔ اور اسلامی نظریۂ دستور پر بہت سے مضامین لکھے جو غیر ممالک کے ممتاز جرائد میں شائع ہوتے رہے۔ ۳۲ سال کی عمر میں وہ وطن لوٹے اور وکالت شروع کر دی۔ پھر ان سے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے 'نظریۂ پاکستان' پر کتاب لکھنے کو کہا اس کے لیے صدرِ محترم نے پیش لفظ بھی خود لکھا۔ ادب میں جاوید اقبال کی تحریروں میں زیادہ تر اقبال اور جناح کا عکس ہے خاص طور پر جہاں 'کیسے، کیوں اور کہاں پاکستان معرضِ وجود میں آیا' کا ذکر ہو۔ ہلکے پھلکے ادب میں انہوں نے انگریزی اور دو دونوں میں ڈرامے لکھے جو بی۔بی۔سی نے انگلستان بھر میں پیش کیے۔ یونیورسٹی لاء کالج میں ایک لیکچرر اور پاکستان ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ کی حیثیت سے انہیں آسٹریلیا میں دانشیا میں آئینی نظام پر ایک مذاکرے میں پاکستان کے نمائندے کے طور پر مدعو کیا گیا۔ یہ مجلس اگست ۱۹۶۰ء میں کینبرا کی نیشنل یونیورسٹی میں منعقد ہوئی تھی۔ یہاں بارہ ملکوں کے نمائندے موجود تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال سے پوچھا

گیا کہ اسلامی نظریات پر استوار کی جانے والی ۔۔۔ اسلامی مملکت پاکستان کے متعلق وہاں کے اپنے عوام کے کیا نظریات ہیں۔ اس کے باشندے اس کا کہاں تک جواز پیش کرتے ہیں۔ اس پر جاوید اقبال کی عالمانہ بحث ایک کتاب کے باب تک پھیل گئی۔ لیکن اس کا خلاصہ اس کے دل اور روح سے تصوّف کی سی گہرائی سے ابھرتے ہوئے ارسطو سے ہوتے ہوئے اپنے والدِ مرحوم کے تصوّرات تک آ پہنچا۔ انہوں نے برّصغیر ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کا ذکر بھی کیا۔ جب وہ تاریخ کے نئے دور میں الگ الگ مذہب اور نظریات کی حامل قوموں کی حیثیت سے داخل ہو رہے تھے۔ ہندو اکثریت میں تھے اور مسلمان بہت بڑی اقلیت ۔۔۔ لامذہبیت، دستوریت کے جدید نظریات نے ہندوؤں کو سیاسی طور پر بہت باشعور اور پیش بیں بنا دیا تھا۔ لیکن انہوں نے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہوا تھا کہ وہ اپنے اس شاندار ماضی کو یاد کریں جب وہ ہندوستان کے حکمران تھے ۔۔۔ وہ اپنے قدیم معاشی نظام سے چمٹے رہیں اور اور طرزِ نو کو اختیار نہ کریں اور ہندوؤں کو آگے بڑھتے رہنے دیں۔ مسلمان رہنما یہ کہتے تھے کہ ہندوستان ہمیشہ ہندو، ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں منقسم رہا ہے اور تاریخ گذشتہ بارہ سو برس میں دونوں کے درمیان یگانگت قائم کرنے میں ناکام رہی ہے اور برطانوی سامراج نے پورے ہندوستان پر ضرور حکمرانی کی ہے ۔۔۔؟

جواں سال اقبال نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے گذشتہ تمام صدیوں میں مسلمانوں کی زندگی پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ ہر مسلم ریاست ایک دوسرے سے وابستہ رہی ہے اور جب مغربی استعماری قوتوں نے اپنے مفادات کے لیے انہیں استعمال کرنا شروع کیا تو خالص اسلام کے احیاء کے لیے کوششیں شروع ہو گئیں اور پورے

عالم اسلام میں مغرب کی مذمت شروع ہوگئی۔ پھر مسلمان علماء نے یورپ میں ترقی کے طریقوں کو اپنانا شروع کردیا اور مسلمانوں کو یورپ کی ترقی کی روح کو سمجھنے کی دعوت دی۔

جاوید اقبال نے بتایا "علامہ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے یہ واضح کیا کہ اسلام ایسے اصولوں کی تردید کرتا ہے جن سے لوگوں کو خالصتاً نسلی، لسانی یا علاقائی بنیادوں پر متحد کیا جائے۔ اقبال نے یہ سبق دہرایا کہ مسلمان نسلی، یا زبانی رشتوں میں منسلک نہیں ہیں بلکہ وہ معاشرتی طور پر ایک برادری ہیں۔ وہ اس لیے ایک نہیں ہیں کہ وہ کسی خاص نسل رنگ، قبیلے، زبان یا علاقے سے تعلق رکھتے ہیں بلکہ اس لیے کہ وہ مسلم برادری کے رکن ہیں۔" اپنی بحث کو سمیٹتے ہوئے جاوید اقبال نے اپنے والد کے مزید مقالات کا حوالہ دیا کہ ان کے خیال میں مسلمانوں کو ہمیشہ ایک مکمل اور مستحکم حکومت کی طرف حرکت کرتے رہنا چاہیے معاشی، معاشرتی اور سیاسی انصاف کے زیادہ معقول اور مناسب ڈھانچے ترتیب دیتے رہنے چاہئیں۔"

گرم آب و ہوا کی دھوپیلی سرزمین میکسیکو کو ۱۹۶۲ء میں جاوید اقبال کی میزبان بننے کا شرف حاصل ہوا۔ وہ ایک لیکچرر کی حیثیت سے آئے تھے۔ یہاں پانچ ماہ تک وہ بین الاقوامی معاملات کے تقابلی مطالعہ اور ایشیا کے معاملات میں دلچسپی رکھنے والے طلبہ کو لیکچر دیتے رہے۔ اور باہر سے آنے والے لیکچررز کے مقابلے میں ان کے لیکچر سب سے نمایاں قرار دیئے گئے تھے۔

اب جاوید اقبال چالیس کے اردگرد ہیں۔ کئی برس کے کنوارپن کے بعد ان کی شادی ابھی ابھی ہوئی ہے۔ شادی ان کے آزاد مزاج اور سیاسی نظریات میں کوئی تبدیلی نہیں لائی۔ وہ "صداقت" پر پختہ یقین رکھتے ہیں اور وہ اس بات کے قائل ہیں کہ سچائی ہمیشہ ہر آزمائش اور ہر کڑے وقت میں کامیاب و کامران ہوگی۔ "میں سچائی کے راستے کو ہرگز نہیں چھوڑ سکتا۔ کیونکہ

میں اس باپ کا بیٹا ہوں جس نے ہمیشہ سچائی کا دامن پکڑا اگرچہ انہیں اس کے لیے مشکلات بھی برداشت کرنا پڑیں۔

جاوید کی زندگی بھر تربیت دینی ماحول میں ہوئی ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنے آپ کو پاکستان کی خدمت کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ کئی سال وہ اقوام متحدہ میں پاکستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے نیویارک بھی رہے ہیں۔ انہوں نے کئی مرتبہ برلن میں بھی پاکستان کی نمائندگی کی ہے۔ چند سال ہوئے وہ پاکستانی پارلیمانی وفد کے ساتھ چین بھی گئے اور چواین لائی وزیراعظم چین سے فلسفیانہ بحث بھی کی۔ اس ملک کے نظریات کی توضیح کرتے ہوئے جاوید اقبال اس نتیجے پر پہنچے کہ اہل چین نے سائنسی اصولوں کے ساتھ ایک نظام ایجاد کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سائنس کبھی غلط نہیں ہوتی ـــ جاوید کے خیال میں ایسے اعتقادات کے لیے یقین کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح جوش و جذبہ کا لازماً دخل ہو جاتا ہے احساسات اور جذبات ہوا ہو جاتے ہیں۔ وزیر اعظم چین نے انکے اس بے تکلفانہ انداز فکر کی تعریف کی اگرچہ ان کے خیالات سے پورا اتفاق نہ کیا۔

اس زندگی میں جاوید اقبال کی خواہش اور مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے والد کے مشن اور ان تعلیمات کو آگے لے کر بڑھیں جن سے تمام مہذب دنیا کی جواں نسل متاثر ہوئی ہے۔ "ہم اب خلا کے دور میں رہتے ہیں۔ آج کی دنیا جس کے ہم مکیں ہیں یونہی اچانک نہیں بن گئی تھی۔ صدیوں سے لوگ آسمانوں اور عناصر ارضی سے متعلق سوچتے آرہے ہیں۔ جاوید اقبال نے پھر باآواز بلند کہا "لیکن ہمارے قرآن میں کوئی غلط اعتقادات در نہیں آئے۔ صرف ہمارے پیغمبر ہی اس مقدس کتاب میں کسی ترمیم و تحریف کی طرف اشارہ کر سکتے تھے۔ سائنس اور دوسرے نظریات اس کے عین مطابق ہیں۔ ہاں زندگی کے طور طریقے بدلتی دنیا کے ساتھ بدل رہے ہیں۔

اور ہمیں بھی اپنی زمین کی سائنسی ترقی کے بخشے ہوئے بے شمار مواقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اپنے آپ کو اس سے ہم آہنگ کرنے کی کوششیں بروئے کار لانی چاہئیں ورنہ ہم اس دور کے ساتھ نہیں چل سکیں گے۔"

اپنے نقطۂ نظر میں زندگی اور پیار سے بھرپور حکیم الامت اقبال اپنے بیٹے کے روپ میں پھر زندہ ہیں۔ شکل وصورت کے اعتبار سے وجیہہ، دلکش اور خوبرو، کردار وافکار میں منفرد جواں سال اقبال وہ سب کچھ ہیں جو ان کے والد انہیں بنانا چاہتے تھے۔ وہ اپنے والد مرحوم کی امیدوں اور خوابوں کا مجسم آئینہ ہیں۔ ان کے پاکیزہ اور سادہ اسلوب حیات میں ایک وقار ہے — اقبال کا وقار — یہ ورثہ ان کے پاس اب تک محفوظ ہے

حبیب ابراہیم رحمت اللہ



پاکستان کے رہنماؤں نے قائداعظمؒ کی قیادت میں آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی جدوجہد کا آغاز اس وقت کیا جب غیر منقسم ہندوستان کے مسلمان ان بارگولوں میں ایک پرکاہ کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہوں نے دن رات انتھک کوشش کرکے بالآخر آزادی حاصل کر ہی لی۔ قائداعظم مرحوم کے انتہائی قابلِ اعتماد سپاہیوں میں حبیب ابراہیم رحمت اللہ بھی شامل تھے۔

عنفوان شباب سے ہی ان میں اپنے عوام کو برطانیہ کے سیاسی چنگل سے نجات دلانے کی خواہش نے جنم لیا تھا اور انہوں نے بگولوں پر سوار ہو کر اس طوفان میں سرگرم حصہ لیا اور انہیں فتح حاصل ہوئی اور ۱۴ اگست، ۱۹۴۷ء کو لندن میں پاکستان کا نیا سفید اور سبز پرچم لہرانے لگا اور مسٹر حبیب ابراہیم رحمت اللہ برطانیہ میں پاکستان کے پہلے ہائی کمشنر مقرر ہوئے۔ نوجوان سیاست دان کی زندگی میں یہ کتنا عظیم موقعہ اور کتنا عظیم دن تھا۔

بالآخر جب حبیب ابراہیم رحمت اللہ نے انگلستان کی سرزمین پر کھڑے ہو کر دنیا کو

اپنے ملک کے عالمِ وجود میں آنے کا بتایا اور یہ کہ اب برِّصغیر کے مسلمان پاکستان کو آزاد وطن اپنا وطن کہہ سکتے ہیں تو ان کا دل موسمِ گل کی طرح خوشی سے چھلک رہا تھا۔ اب بھی جب وہ گذشتہ کئی برسوں کی اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں تو ان کا چہرہ شدتِ جذبات سے تمتما اٹھتا ہے۔ "یہ میری زندگی کا قابلِ فخر لمحہ تھا اور میں اسے کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ اپنے ملک کے عوام کی آزادی کا اعلان تھا" جشنِ آزادی کی تقریبات کے دوران میں ایک دوست نے رحمت اللہ سے پوچھا کہ کیا وہ اس وقت خود کو غمگین تو محسوس نہیں کرتے کیونکہ اس خوشی کے موقعہ پر ان کے اہل و عیال ان سے بہت دُور ہیں تو رحمت اللہ نے اپنی دلی تابندگی کے مطابق جواب دیا "میں خود کو کیسے غمگین محسوس کر سکتا ہوں۔ اب تو میرے آٹھ کروڑ بھائی اور بہنیں ہیں اور ہم سب ایک ہی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں۔

ایک ایسا خوش قسمت شخص جو ایک امیر گھرانے میں پیدا ہو، غریب اور ستائے ہوئے انسانوں کی امداد کرنے سے غفلت برت سکتا ہے"؛

ان الفاظ سے مسٹر رحمت اللہ کے کردار کی عظمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ دراصل وہ یہ مانتے ہیں کہ انہوں نے ناز و نعم میں پرورش پائی اور انہیں زندگی میں چیزیں بغیر کوشش کے حاصل ہو جاتی تھیں۔ مگر مسٹر رحمت اللہ اور امیر و کبیر لوگوں کے لڑکوں کی اکثریت میں یہ فرق ہے کہ مسٹر رحمت اللہ نے بہت سے موقعوں سے مالی منفعت کے لیے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیونکہ انہوں نے دولت کی کبھی پرواہ نہیں کی اور نہ ہی اس کی انہیں ضرورت پیش آئی۔ لیکن ان کے پس منظر کی وسعت نے انہیں یہ اجازت دے دی۔ کہ وہ امیر کا آوارہ اور بیکار بیٹا بننے کے لیے پورا فائدہ اٹھائیں یا کسی امیر کا قابل بیٹا بنیں جو محنت سے مطالعہ کر کے اپنی پسند کی تاجرانہ یا فن سفارت کی دنیا کو اپنا لے۔ اس فائدہ

سے مسٹر رحمت اللہ کے خیالات میں آزادی پیدا ہوئی۔ حبیب ابراہیم رحمت اللہ نے
جو ۱۹۱۲ء میں بمبئی کے ایک ممتاز خاندان میں پیدا ہوئے۔ رئیس اور ثقافتی روایات سے
بھرپور ماحول میں پرورش پائی اپنی خاموش اور شریف الطبع والدہ لیڈی کلثوم سے انہیں
جرأتِ پاکیزہ اور اپنے ذہین والد سر ابراہیم رحمت اللہ سے خیالات میں ہم آہنگی ورثہ
میں ملی۔ جس طرح فلاسفر یورپوڈس نے کہا ہے "نیک باپ کی اولاد نیک ہوتی ہے، لیکن
صرف نیک اعمال ہی بڑے آدمیوں کے کردار کو نمایاں کرتے ہیں"، نوجوان رحمت اللہ اپنے
والد سے بہت متاثر ہوئے جن کے دن نیک اعمال میں بسر ہوئے تھے۔ ان کے گھر کی دولت
زندگی۔ علم اور تکمیل سے ناپی جاتی تھی۔ ان کے والدین نے امارت کے ذریعے حکومت
کرنے کے بجائے خدمت کی۔ آپ کے والد ذاتی دولت کو ایک مقدس امانت سمجھتے
تھے جسے انہوں نے اپنی تمام زندگی اپنے قبیلہ کی بھلائی کے لیے خرچ کیا۔ اسی طرح نوجوان
حبیب کی پرورش بھی اسی مقصد کے تحت کی گئی (اپنے چھ بھائیوں اور بہنوں کے ساتھ)
کہ دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے۔ اپنے والد جو ۱۹۱۲ء میں مسلم لیگ پارٹی کے صدر، بمبئی
کے میئر اور ۱۹۳۰ء میں ہندوستانی پارلیمنٹ کے سپیکر اور ہر دور کے سیاسی رہنما تھے،
کی سیاسی زندگی سے متاثر ہو کر انہوں نے والد کے نقشِ قدم پر چلنے کا فیصلہ کیا اور بمبئی اور
بیرون ملک میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد وہ ایک لیڈر بن گئے۔ وہ عزت و افتخار سے
بڑھتے گئے۔ اعلیٰ عہدے ان کے لیے راستے پر جا بجا بکھرے ہوئے تھے اور انہیں ان
عہدوں کو منتخب کرنا پڑا۔ ہر بار انہیں ایک خاص عہدے کے لیے ایک انسان کی
حیثیت سے چن لیا گیا۔ انہوں نے یہ عہدہ عزت و حشمت کے لیے نہیں قبول نہیں کیا۔
بلکہ اس حقیقت کے پیشِ نظر کہ اس طرح وہ اپنے ہم وطنوں کی بہتر طور پر خدمت سرانجام

دے سکتے ہیں۔ ایک اعلیٰ عہدے سے دوسرے اعلیٰ عہدہ تک وہ ترقی کی منازل طے کرتے گئے مسٹر رحمت اللہ عوام میں یقین رکھتے ہیں وہ ان لوگوں پر بھروسہ کرتے ہیں جو ان کی خدمت کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔ وہ ان لوگوں کو حکم دینے کے بجائے نصیحت کرتے ہیں کہ کیا کرنا چاہیئے اور اس مقصد کے لیے کہتے ہیں "میں جانتا ہوں کہ تم یہ کر سکتے ہو" اور اپنے ملازمین کی خوبیوں کو اُجاگر کر دیتے ہیں۔ تقسیم ہند سے پیشتر انہوں نے کئی سال حکومت ہند کے ممتاز عالمی وفود میں بسر کیے۔ تقسیم ہند کی یادگار ساعت کے بعد انہوں نے حکومتِ پاکستان کی خدمات پوری تن دہی سے سرانجام دیں۔ آپ ۵ سال تک برطانیہ میں پاکستان کے ہائی کمشنر اور ۱۹۵۱ء کے اوائل سے ۱۹۵۲ء کے آخر تک فرانس میں پاکستان کے سفیر کے عہدہ جلیلہ پر فائز رہے۔ اس کے بعد آپ سندھ کے گورنر، گورنر پنجاب اور بعد ازیں وزیر صنعت و تجارت مقرر ہوئے۔ اس کے علاوہ اب تک آپ پاکستان کے متعدد عالمی وفود میں شرکت کر چکے ہیں۔ آج کل آپ بندہ نواز لمیٹڈ کے چیئرمین ہیں اور اپنے روزانہ کام میں سرگرم حصہ لیتے ہیں۔ آپ سات اور ممتاز کمپنیوں کے چیئرمین بھی ہیں۔ جن میں آکسیجن لمیٹڈ، یونائیٹڈ بنک، کوٹس برادرز ہیمبون پاکستان لمیٹڈ، پاکستان کیبلز اور ایسٹ پاکستان لبریکنٹ شامل ہیں۔

مسٹر رحمت اللہ نو اور ممتاز کمپنیوں کے ڈائریکٹر ہیں جن میں فارمینٹیکل سروسز، آدم جی جیوٹ۔ کوہ نور انڈسٹریز لمیٹڈ، سیمنٹ اینڈ ڈویلپمنٹ کارپوریشنز، بروک بانڈ ٹی، اور ایسٹرن فیڈرل انشورنس وغیرہ ہیں۔ کمپنیوں کی کانفرنسوں میں آپ بڑی دانش مندی سے ہر اجلاس کی رپورٹ سنتے ہیں اور چند الفاظ کہہ کر رپورٹ کی شان میں اضافہ کر دیتے ہیں۔ ان کے فرزند فاروق (ان کے دو بیٹے، ایک خوب صورت بیٹی اور رقابلِ فخر بیوی ہے)

بندہ نواز ہیڈ کوارٹرز میں مسٹر رحمت کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔ مسٹر فاروق نے اپنی ۴۲ سالہ زندگی میں ۴۱ سال انگلستان میں بسر کیے ہیں اور آپ سب سے پہلے پاکستانی ہیں اور انگریزی لب و لہجہ کے باوجود انہیں ہمیشہ اس بات کا فخر ہے جس طرح حبیب رحمت اللہ نے اپنے باپ سے محبت کی اسی طرح ان کا بیٹا فاروق ان سے محبت کرتا ہے۔ ان کی خوش خلقی ان کا شریفانہ برتاؤ اور کام کاج میں محویت کا عالم اس بات کی غمازی کرتا ہے جیسے وہ اپنے آپ کو عام ملازم خیال کرتے ہیں۔ بیٹا باپ کے سامنے ادب کی وجہ سے نہیں بولتا اور اپنے والد کو بادشاہ کی طرح سمجھتا ہے۔

بیگم زبیدہ رحمت اللہ (سر سلطان چینوئی کی صاحبزادی) اپنے گھر کی ملکہ ہیں، ایک ذہین عورت اور ایک منفرد شخصیت ہیں۔ آپ مختلف سرکاری جلسوں میں نمائندگی کر چکی ہیں۔ اس کے علاوہ آپ تین سال تک اپوا کی چیئرمین اور کراچی ڈویژنل کونسل کی ممبر رہیں، ان کا بیٹا مقبول ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کالج میں زیر تعلیم ہے اس وجہ سے بیگم صاحبہ کو غریب اور نادار لوگوں کی مدد کرنے کے لیے بہت سا وقت مل جاتا ہے۔ بیگم زبیدہ سوسائٹی میں گھومنے پھرنے میں کم حصہ لیتی ہیں وہ نادار اور غریب لوگوں کی امداد کے پروگرام ترتیب دے کر بہت خوش ہوتی ہیں اور حبیب رحمت اللہ کو اپنی بیگم پر بہت فخر ہے۔ اپنے فارغ اوقات میں مسٹر حبیب رحمت اللہ اپنے اہل خانہ کے ساتھ ٹینس کھیلتے ہیں۔ لیکن ان کا محبوب مشغلہ فوٹو گرافی اور گھوڑ دوڑ ہے اپنی جوانی میں انہوں نے قانون کا مطالعہ کیا ہے۔ اس کی وجہ سے قوم کی حالت اور اخباری کہانیوں پر گھریلو بحث کرتے ہیں۔

خان رحیم بخش



ان کا چہرہ جذبۂ شباب سے تمتماتا ہے اور اپنی تابندہ روح کے طفیل وہ سدابہار جوان دکھائی دیتے ہیں اگرچہ ان کے بال سفید ہیں اور وہ زندگی کی ستر بہاریں دیکھ چکے ہیں۔ پاکستان کی تاریخ میں ایسے محبّ وطن بہت کم ہوں گے جنہوں نے ایک قلیل سرمائے سے آغاز کرکے بہت کچھ حاصل کیا ہو لیکن بکسلے پینٹس لمیٹڈ کے گورننگ ڈائریکٹر۔ رحیم بخش خان بلند مقاصد کے انسان ہیں۔ جن کا ہر قدم نظریہ یہ ہے کہ محض لامتناہی محنت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ وہ آج بھی اس کے اسی طرح قائل ہیں جس طرح وہ ماضی میں تھے۔ جب انہیں خود محنت کرکے اپنا پیٹ پالنا ہوتا تھا۔ مسٹر خان اس قدر قوتِ ارادی کے مالک ہیں کہ مسائل جو ایک چیلنج بن جاتے ہیں وہ کسی غلطی کے بغیر انہیں حل کر لیتے ہیں۔ اور پھر نئے مسائل سے نبرد آزما ہونے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

پاکستان میں رنگ سازی کی صنعت کی کامیابی میں رحیم بخش خان صاحب

کا بہت زیادہ حصّہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس صنعت سے متعلقہ ہر شعبے اور ہر پہلو میں بڑی دلچسپی رکھتے ہیں۔ اپنے رنگ و روغن کو وہ اپنے پیارے وطن کی سرزمین کے قریے قریے میں پھیلاتے ہیں۔ انہیں اپنی ابتدائی عمر کی پریشانیاں، دُکھ اور مصیبتیں خوب یاد ہیں۔ انہوں نے مصائب برداشت کیے۔ دوسرے پاکستانیوں کی طرح مسلسل جدوجہد سے یہ کٹھن راہیں طے کرتے ہوئے اپنی فراست اور محنت سے کامیابی حاصل کی۔

۱۹۵۳ میں انہوں نے آل پاکستان پینٹ مینوفیکچرز ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھّی۔ اور ۱۹۶۲ کے آغاز تک وہ اس سوسائٹی کے سربراہ رہے۔ پاکستان سٹینڈرڈز انسٹی ٹیوشن کی جنرل کونسل کی مجلس عاملہ کے ممبر کی حیثیت سے ۱۹۵۹ میں جنوب مشرقی ایشیا میں جانے والے سرکاری وفد میں وہ بھی شریک تھے۔ اور انہوں نے اس علاقے کے دس ممالک کا دورہ بھی کیا۔ ان کی اس دورے کی رپورٹ حکومت پاکستان کو اس قدر پسند آئی کہ ۱۹۶۰ء میں تنہا انہیں سرکاری طور پر مشرقِ وسطیٰ کے ممالک، یورپ، انگلستان اور امریکہ کے دورے پر بھیجا گیا۔ جہاں انہوں نے چیمبرز آف کامرس کے اجلاسوں سے پاکستان کی ترقی اور دوسرے پانچسالہ منصوبے کے متعلق خطاب کیا۔ اس سے اگلے برس وہ امریکہ کی نیشنل پینٹ، وارنش اور لیکور ایسوسی ایشن کے پچاس سالہ پینٹ کلب کے رُکن اعزازی منتخب کر لیے گئے۔

متموّل براعظم افریقہ میں نئی منڈیاں دریافت کرنے کے سلسلے میں حکومتِ پاکستان نے ۱۹۶۲ میں ایک تجارتی وفد مغربی افریقہ کے دورے پر بھیجا تھا۔ انہیں اس کی قیادت کا اعزاز حاصل ہُوا۔

رحیم بخش خان یکم دسمبر ۱۸۹۵ میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے لاہور اور انگلینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ پہلی جنگِ عظیم میں افریقہ اور عراق میں فوجی خدمات سرانجام دینے کے بعد وہ بڑے اعزازات کے ساتھ ریٹائر ہو گئے۔ بعدازیں انہوں نے برصغیر میں ۱۹۳۳ کے اوائل میں حیدر آباد دکن میں پہلی پینٹ فیکٹری قائم کی جو ایک مسلمان کی ملکیت تھی۔ حیدر آباد شہر سے پندرہ میل دور ۱۵۰ ایکڑ کے رقبے پر پھیلی ہوئی صنعتی بستی (رحیم آباد) میں ایک شیشے کے کارخانے اور تعمیراتی مسالے بنانے کی صنعتیں بھی قائم کی گئیں۔

نومبر ۱۹۴۷ میں انہوں نے پاکستان ہجرت کی اور ۱۹۴۹ میں بکسلے پینٹ ورکس کے نام سے پاکستان میں پہلی پینٹ فیکٹری قائم کی۔ دوسرا کارخانہ کراچی میں ۵۶-۱۹۵۵ اور ایک ۵۷، ۱۹۵۶ میں چٹاگانگ میں قائم کیا گیا۔

انتھک قوتوں کے حامل رحیم بخش عوام پر کامل اعتماد رکھتے ہیں اور آج کے نوجوان طبقے کے شب و روز میں نہایت دلچسپی لیتے ہیں۔ پاکستان کے بے شمار مستحق لیکن محنتی طلبہ، جو اپنے حالات کے باعث تعلیم جاری نہیں رکھ سکتے۔ ان کے لیے رحیم بخش خان ایک مخلص اور مہربان دوست بن کر سامنے آتے ہیں۔ وہ ان طلباء کو اپنی مرضی کی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لیے وظائف دیتے ہیں۔ وہ ان کی نشوونما پر فخر محسوس کرتے ہیں اور ان کی انتہائی کامیابی پر تو وہ مسرت سے جھوم جاتے ہیں۔ پاکستان کو بہت سے سائنس دانوں کی ضرورت ہے۔ اس سلسلے میں ان کی خدمات نمایاں ہیں۔ کئی ضرورتمند، بھوکے لیکن ہونہار جواں سال طلبہ کی انہوں نے گمنام رہ کر مدد کی ہے اور ان کی دل سے کوشش یہی رہی ہے کہ سائنسی اور ٹیکنیکل تعلیم میں مزید ترقی ہو۔ ان کے اپنے بچے — پانچ بیٹے اور چار بیٹیوں کو اللہ نے ہر چیز دے رکھی ہے۔

اس لیے رحیم بخش دوسرے بچوں کے سر پر دست شفقت رکھتے ہیں۔ اور انہیں اس کے طفیل ہی زندگی میں ترقی کے مواقع ہاتھ آرہے ہیں۔

ایک کارخانہ دار کی حیثیت میں وہ ایک باپ کی طرح مشفق ہیں۔ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی طرح وہ ہر شخص کی بلا امتیاز نسل و رنگ و ذات عزت کرتے ہیں۔ ان کے نظریات بڑے پاکیزہ ہیں۔ وہ اس بات کے قائل ہیں کہ "دوسروں سے اس حسن سلوک سے پیش آؤ۔ جس کی تم دوسروں سے توقع کرتے ہو"۔ ان کے خاندان میں ان الفاظ کی باقاعدہ عملی شکل نظر آتی ہے۔

اس سادہ لیکن باوقار شخص کی خدمات تو بے شمار ہیں لیکن میں ایک کا ذکر کیے بغیر نہ رہوں گی۔ جب ۱۹۶۱ء میں امریکی سفارت خانے کی عمارت مکمل ہوئی تو اس نے اس عمارت کے لیے رنگ و روغن "تحفتہً" دیئے تھے۔ اس شاندار عمارت کی اندر اور باہر کی دیواروں پر ہزاروں گیلن رنگ و روغن لگ گیا تھا۔ ایک عام شہری ہونے کی حیثیت سے رحیم بخش خاں نے یہ ذمہ داری محسوس کی تھی کہ امریکہ نے ۱۹۵۲ء میں سیلاب سے متاثرہ افراد کے لیے جو گندم "تحفتہً" دی تھی۔ اس کے "تشکر" کے اظہار میں یہ تحفہ دیا جائے۔ انہوں نے رنگ و روغن کی صنعت پر کئی کتابچے بھی لکھے ہیں۔ خان کے پانچوں ہونہار بیٹے اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک ملک بھر میں پھیلی ہوئی اپنی خاندانی تجارت کی شاخوں کی نگرانی کرتا ہے۔ کراچی کے اس معزز شہری کے ذکر کو سمیٹتے ہوئے مشہور نظم ابوبن ادہم کا حوالہ دیا جا سکتا ہے۔ جسے ایک رات ایک فرشتہ ملا اور ان سے کوئی خواہش دریافت کی، ابوبن ادہم نے بڑے وقار سے جواب دیا "میرا نام انسانوں سے محبت کرنے والوں میں لکھ لو"۔ اور رحیم بخش خان بھی حقیقی معنوں میں ایک ایسے انسان ہیں جو انسانوں سے محبت کرتے ہیں"۔

روشن علی بھیم جی



وہ بڑے آدمی جن کی زندگی کے ایام مُفلسی میں گزرے ہوں ان لوگوں کے لیے ایک وجدانی مثال کی حیثیت رکھتے ہیں، جو یہ سمجھتے ہیں کہ اوج ترقی پر پہنچنے کے لیے امیر خاندان کا فرد ہونا ضروری ہے۔ اگر ہم اپنے گردوپیش نظر دوڑائیں تو ہمیں پتہ چلے گا کہ یہ غلط ہے دنیا کے متعدد ممالک کے سربراہ جھونپڑیوں میں پیدا ہوئے۔ اسی طرح پاکستان کے ممتاز "انشورنس مین" مسٹر روشن علی بھیم جی نے بھی سترہ سال کی عمر میں برما کے دارالحکومت رنگون میں "ڈیسپچ کلرک" کی حیثیت سے کام کا آغاز کیا۔ ان کی تنخواہ صرف ۳۵ روپے ماہوار تھی۔

اس وقت بظاہر اس بات کا کوئی امکان بھی نہیں تھا کہ یہ نوجوان اپنی زندگی میں اتنا اعلیٰ اور بلند مرتبہ بھی حاصل کرلے گا۔ اس نے اپنی خوش گوار اور مسحور کن شخصیت کی بدولت آہستہ آہستہ ترقی کی منازل طے کرنی شروع کیں، معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دماغ ایک سٹور کی مانند ہے جس سے یکے بعد دیگرے وہ عقلی دلائل یوں برآمد کرتے ہیں کہ سُننے والا انھیں بخوبی سمجھ لیتا ہے پھر ان دلائل کے ساتھ مسٹر بھیم جی کا مزاج بھی

یوں شامل ہوتا ہے جیسے چاکلیٹ کے ٹکڑے خوش نما سنہری کاغذ میں لپٹے ہوئے ہوں۔

روشن علی ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو ہنستے کھیلتے کام کریں وہ خود بھی بڑے زندہ دل ہیں اور ایک ایسی شخصیت ہیں جس نے بمبئی لائف انشورنس کمپنی میں ڈسپیچ کلرک کی حیثیت سے ترقی کے زینے پر چڑھنا شروع کیا اور بالآخر بام مراد تک پہنچے۔ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ نے اتنا بزنس کیا کہ کمپنی کے مینجر ہو گئے بعد ازاں انھوں نے ویسٹرن انشورنس کمپنی آف کینیڈا کا چارج سنبھالا جب حکومت پاکستان نے انشورنس مشاورتی بورڈ کی تشکیل کی تو مسٹر بھیم جی نے اس بورڈ کے ممتاز رکن کی حیثیت سے بڑا اہم کردار ادا کیا حالانکہ اس وقت وہ دوسرے کاروبار بھی کر رہے تھے لیکن چیئرمین مسٹر عباس خلیلی کے اصرار پر آپ نے ۶۰ء میں ایسٹرن فیڈرل انشورنس کمپنی کے جنرل مینجر کا عہدہ سنبھالا آپ نے یہ عہدہ سنبھالتے ہی دن رات کام کیا اور کمپنی کا کاروبار کمال پر پہنچ گیا آپ نے کمپنی کے ملازمین کی سماجی بہبود کے لیے بھی بہت کچھ کیا، ملازمین کو پراویڈنٹ فنڈ۔ گریچوٹی اور دیگر بے شمار سہولتیں میسّر ہونے لگیں۔

بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ مسٹر بھیم جی ایسے ہر دلعزیز ڈائریکٹر کبھی بائیں بازو کی جماعت سے بھی تعلق رکھتے تھے اور کالج کے ایام میں کمیونسٹوں سے ان کا گہرا رابطہ تھا وہ خود کہتے ہیں "میرے دوستوں کو اس انکشاف پر تعجب ہوگا اس زمانے میں میرا یہ ایمان تھا کہ سیاسی آزادی معیشت کے بغیر بے معنی ہے اور ان دونوں کا عوام کو فائدہ پہنچنا چاہیے تاہم ۱۹۴۲ میں کمیونسٹ پارٹی کے رویے سے مسٹر روشن علی بھیم جی چکرا گئے اور دوسری جنگِ عظیم میں روس کی شمولیت سے انھوں نے کمیونسٹ پارٹی کو خیرباد کہہ دیا خود ان کے الفاظ میں کمیونسٹوں کا یہ نظریہ تھا کہ "روس کے کودنے سے یہ جنگ

اب سامراجی جنگ کی بجائے عوامی جنگ بن گئی ہے۔ مسٹر روشن علی اس حقیقت کو جان گئے کہ کمیونزم کے زیر سایہ شخصی آزادی ختم ہو جاتی ہے۔

تقسیم ملک سے قبل آپ پنڈت نہرو کے بڑے مداح تھے جو اس زمانے میں انڈین نیشنل کانگرس کے صدر تھے لیکن نہرو کے ساتھی آنجہانی سردار ولبھ بھائی پٹیل نے فرقہ پرستی کے تحت مسلمانوں کو کانگرس سے نکلنے پر مجبور کر دیا تو روشن علی بھیم جی کے ذہن میں بھی تبدیلی پیدا ہوئی آپ نے قائداعظم محمد علی جناح مرحوم سے ملاقات کی اور قائداعظم نے انہیں بتایا کہ مسلمانوں کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ پاکستان کے نام سے اپنے لیے ایک الگ خطۂ زمین کا مطالبہ کریں چنانچہ قائداعظم کے فرمان کے مطابق آپ نے مطالبۂ پاکستان کے لیے ہر ممکن جدوجہد کی۔

گذشتہ سال مسٹر بھیم جی انشورنس ایسوسی ایشن کے صدر منتخب ہوئے حقیقت میں وہ اس قابلِ عزت عہدے کے حقدار بھی تھے اس کے علاوہ آپ پاک برما فرینڈ شپ سوسائٹی کے صدر، کراچی آٹو موبائیل ایسوسی ایشن کے بانی اور سیکرٹری بھی انجمن خدام النبی کے جائنٹ سیکرٹری بھی ہیں، پاکستان کی سب سے پرانی انشورنش کمپنی کے آپ اس لیے ڈائریکٹر نہیں کہ آپ اس عہدے کو روزی کمانے کا ذریعہ تصور کرتے ہیں بلکہ آپ انشورنس کے کام سے بالکل اسی طرح حظ اٹھاتے ہیں جسطرح کوئی شخص اپنی کسی "ہابی" سے لطف اندوز ہوتا ہے آپ کا کہنا ہے میں آسانی سے اپنے سٹیل سکریپ پن اور کلپ تیار کرنے کے کارخانوں سے روزی کما سکتا ہوں لیکن مجھے انشورنس کے کام سے بہت الفت ہے کیونکہ یہ کاروبار عوام کو آرام، سکون اور تحفظ بخشتا ہے۔

مسٹر روشن علی بھیم جی جو کچھ کہتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں اور کہتے ہیں" جیو

اور جینے دو۔ اگر تم ہنسو گے تو دنیا تمہارے ساتھ ہنسے گی اور اگر روؤ گے تو دنیا تمہارا ساتھ نہیں دے گی"۔ آپ انشورنس کو موجودہ دور کی بہت بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔ آپ کا کہنا ہے "یہ مت سمجھو کہ صرف امراء ہی اپنے آپ کو انشور کرا سکتے ہیں انشورنس کا زیادہ تر بزنس قلیل آمدنی والے خاندانوں کا مرہونِ منت ہے، ہم ان افراد سے کاروبار کرتے ہیں جن کے پاس دولت تو نہیں ہوتی مگر ان کے دل بہت بڑے ہوتے ہیں اور یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اعزاء کی فلاح و بہبود کا انتظام اپنی آنکھوں کے سامنے ہی کر لیتے ہیں۔ مسٹر بھیم اگر چاہیں بھی تو انشورنس کا کاروبار ترک نہیں کر سکتے، یہ کاروبار اب ان کے خون میں رچ بس چکا ہے۔

مسٹر روشن علی کے پرانی طرز کے گھر میں ان کی بیوی اور تین بیٹے رہتے ہیں۔ مسز بھیم جی کہتی ہیں ہم اپنے دوستوں کا خیر مقدم اپنے باغ میں کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارا باغ ہمارے گھر سے بڑا ہے مسٹر بھیم جی کے گھر کا ماحول بڑا گرم اور خوشگوار ہے۔ دوست اور ہمسائے ہمیشہ اس میں آتے رہتے ہیں۔

میاں سعید سہگل



"اس دنیا میں ایسی بے شمار اشیاء ہیں جن کے باعث ہم بادشاہوں کی سی مسرت حاصل کر سکتے ہیں" جب رابرٹ لوئیس سٹیونسن نے گزشتہ صدی میں یہ الفاظ لکھے تھے تو زندگی بڑی سادہ تھی۔ امراء اور اعلیٰ طبقہ کے لوگ اس لیے مسرور رہتے تھے کہ ان کے پاس محل، حویلیاں، غلام اور زر و سیم تھے اور وہ ہر چیز خرید خرید سکتے تھے۔

آج بادشاہ ایک رات میں ہی ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کی سلطنتیں ان کے لیے بیکار ہوتی ہیں۔ خوشی و مسرت کا انحصار مادی اشیاء پر نہیں صرف وہی افراد خوشی و مسرت کی دولت سے مالا مال ہو سکتے ہیں جن کے پیشِ نظر عوامی فلاح و بہبود ہوتی ہے کیونکہ مسرت خریدی نہیں جاتی، حاصل کی جاتی ہے۔

میاں سعید سہگل کی رائے میں جو خوشی اور غم ——— دونوں کیفیتوں سے گذر چکے ہیں "دولت تمہارے کسی کام کی نہیں، صرف اچھے کام جو صلہ و ستائش کے بغیر کیے جائیں تمہیں مسرت بخشتے ہیں اور خیر خواہ دوست ہی مصیبت و آزمائش کے وقت

انسانوں کے لیے سہارا بنتے ہیں۔ امیر ہونا ایک اچھی صفت ہے لیکن اچھا نام اور اچھی شہرت زر و مال سے بھی بڑھ کر ہے۔

میاں صاحب جو کوہِ نور انڈسٹریز کے سربراہ ہیں کہ انہیں اچھا نام وراثت میں ملا لیکن اس کے لیے انہیں خود بھی بڑی محنت کرنی پڑی۔ دوسروں کا احساس اور نوعِ انسان کی بھلائی ان کے دل میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے میاں صاحب اگر چاہیں تو بادشاہوں کی سی زندگی بسر کر سکتے ہیں، لیکن انہیں ایسی زندگی پسند نہیں وہ مشترکہ خاندان کے نظام پر یقین رکھتے ہیں۔ وہ اپنے تمام اقرباء کو چاہے ان کے حالات کیسے ہی ہوں اپنے سینے سے لگانے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سہگل خاندان میں بڑا اتحاد ہے۔ حتٰی کہ ان کا بنک اکاؤنٹ بھی مشترکہ ہے۔

میاں صاحب اس صدی کے اوائل میں تاجروں کے ایک خاندان میں پیدا ہوئے اگرچہ وہ اپنے والدین کے سب سے بڑے بیٹے نہیں تھے لیکن پھر بھی انہوں نے اپنی نوعمری ہی میں اپنی ذہانت کا سکہ بٹھا دیا۔ اور اپنے تین بھائیوں حاجی گل، میاں یوسف اور میاں بشیر کے لیڈر بن گئے۔ انہوں نے نوجوانی میں ہی اپنے بھائیوں کی مدد سے کلکتہ میں اپنے والد کے جوتوں کے کاروبار کو بے حد وسعت دی۔ انہوں نے بھائیوں کو اپنا شریکِ کار بنایا چونکہ وہ اپنے گاہکوں کی خوشی کو مدِ نظر رکھتے تھے اس لیے انہیں کاروبار میں بڑی کامیابی نصیب ہوئی اور انہوں نے جلد ہی کئی اور کاروبار بھی شروع کر دیئے ۱۹۲۸ء میں انہوں نے ربر اینڈ کینوس ٹیکسٹائل کا کارخانہ جاری کیا۔

جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو سہگل خاندان بھی کلکتہ سے اس نئے ملک میں آ گیا اور لائلپور میں ایک ٹیکسٹائل مِل قائم کی یہ مِل اتنی کامیاب ثابت ہوئی کہ اس

خاندان نے لیاقت آباد، کوئٹہ اور راولپنڈی میں بھی ملیں قائم کر لیں ان ملوں کے ساٹھ فیصد ملازمین کو کمپنی کی طرف سے رہائشی سہولتیں میسر ہیں۔ لائلپور کی مل میں ایک لاکھ تکلے ہیں چند برسوں ہی میں سہگل خاندان کوہِ نور انڈسٹریز کے نام سے پاکستان بھر میں بہت بڑا ٹیکسٹائل گروپ بن گیا اس وقت دو لاکھ ملازمین کوہِ نور سے اپنی روزی کماتے ہیں۔ ان کے بچوں اور خاندان کے دیگر افراد کو تعلیمی، طبی اور دیگر متعدد سہولتیں حاصل ہیں۔ انہیں کمپنی کی مصنوعات ارزاں نرخوں پر مہیا کی جاتی ہیں۔ اِنہیں پراویڈنٹ فنڈ بھی دیا جاتا ہے۔

یہ میاں سعید سہگل ہی تھے جن کے دل میں سابق فوجیوں کی مدد کا خیال آیا اور انہوں نے جہلم میں فوجی ٹیکسٹائل مِل قایم کر کے اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنایا اور سابق فوجیوں کے لیے ملازمتیں مہیا کیں۔ حکومت پاکستان کے ایماء پر ملکی تعمیر و ترقی کے پیشِ نظر میاں صاحب نے اس عظیم فیکٹری کے لیے سابق فوجیوں کے پراویڈنٹ فنڈ میں سے سرمایہ حاصل کیا اس مل کا منافع ہزاروں سابق فوجیوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ اب میاں صاحب نے کیمیکلز کے میدان میں قدم رکھا ہے چنانچہ سہگل خاندان نے کالا شاہ کاکو کے نزدیک ایک کیمیکل پلانٹ نصب کیا ہے جو کاسٹک سوڈا، کلورین، ڈی، ڈی، ٹی اور دیگر متعدد کیمیکلز تیار کر رہا ہے۔ آج کل کوہِ نور ریان پلانٹ اور کوہِ نور کاٹن سیڈ پلانٹ زیرِ تعمیر ہیں۔ سہگل خاندان نے صنعت بنکاری میں بھی اپنی جولانیٔ طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ مغربی و مشرقی پاکستان میں یونائیٹڈ بنک کی بے شمار شاخیں ہیں پاکستان کی فلاح و بہبود کے لیے میاں صاحب کی مساعی کو مدِّنظر رکھتے ہوئے صدر ایوب نے انہیں تمغۂ قائداعظم دیا ہے۔

میاں سعید سہگل بڑے سادہ دل ہیں۔ انہوں نے پاکستان کی معیشت کو مستحکم کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ کوہِ نور انڈسٹریز کے سرمائے سے اس وقت کئی رفاہی، خیراتی اور تعلیمی ادارے چل رہے ہیں۔ سہگل فاؤنڈیشن سے پاکستان کے کئی نادار لیکن ذہین طلبہ استفادہ کر رہے ہیں۔ سعید سہگل کو اپنے ہم وطنوں پر اعتماد ہے۔ سہگل فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں میں اس وقت سپریم کورٹ کے جج مسٹر جسٹس ایس۔اے۔ رحمان، مغربی پاکستان ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس مسٹر منظور قادر سیکرٹری زراعت حکومت پاکستان مسٹر ایم خورشید، میاں یوسف سہگل اور خود میاں سعید سہگل شامل ہیں۔ سید مہدی شاہ اعزازی سیکرٹری ہیں۔

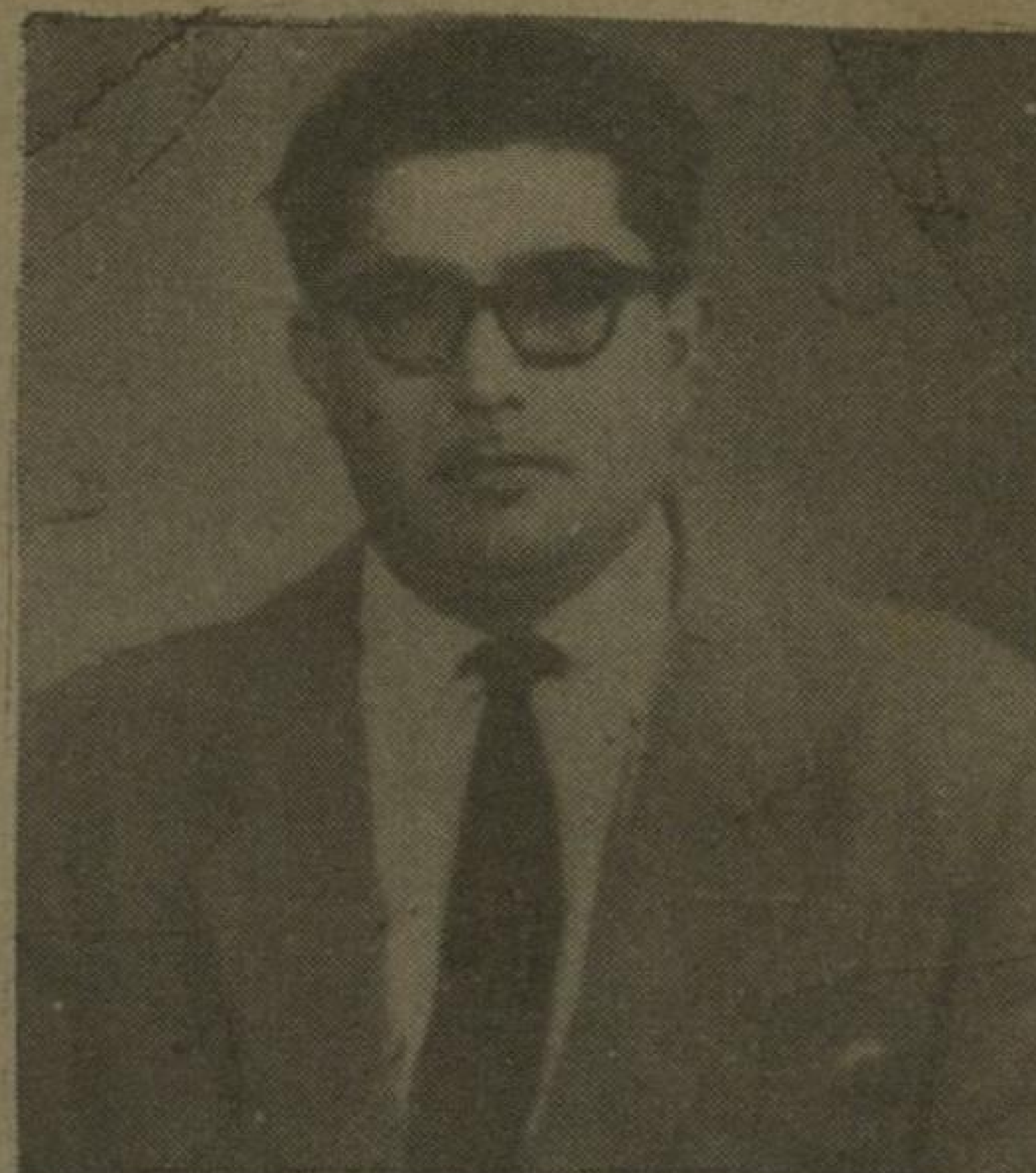
اس فاؤنڈیشن کا قیام ۱۹۶۰ء میں عمل میں لایا گیا۔ آج اس کا سرمایہ ساٹھ لاکھ روپے ہے۔ ۱۹۶۳ء میں اس فاؤنڈیشن کی طرف سے اندرون ملک میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کو ایک لاکھ روپے کے وظائف دیئے گئے، کچھ طلبہ کو ۵، ہزار روپے کے خصوصی وظائف بھی ملے۔ طلبہ کو ان دی جانے والی سہولتوں پر میاں صاحب بڑی مسرت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں احساس ہے کہ ہماری نئی پود بڑی ذہین ہے یہی وجہ ہے کہ ۱۹۵۴ میں انہوں نے اپنا تمام کاروبار اپنے نوجوان اور قابل بھتیجے میاں رفیق کے سپرد کر دیا۔ میاں رفیق سہگل خاندان کے ایک بڑے ذہین نوجوان اور میاں یوسف سہگل کے فرزند ہیں۔ میاں سعید سہگل کے اس فیصلے پر تمام خاندان نے اتفاق رائے کا اظہار کیا۔

میاں صاحب اب بھی ہر روز دفتر آتے ہیں۔ سید مہدی شاہ اور پرانے کارکنوں سے

گپ شپ لڑاتے ہیں فاؤنڈیشن کے وظائف پر بحث و تمحیص کرتے ہیں اور پانچ بجے گھر لوٹ جاتے ہیں۔ جہاں ان کی دو بیویاں اور گیارہ میں سے چار بچے ایک ہی چھت تلے رہتے ہیں میاں صاحب کے سات بچوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور وہ اپنے گھروں میں مسرور زندگی بسر کر رہے ہیں یہ چار بچے ان کی دوسری اہلیہ سے ہیں۔ ان کے گھر میں ہر وقت پوتے پوتیوں، نواسے، نواسیوں اور مہمانوں کا مجمع رہتا ہے اور میاں صاحب ان کے درمیان بڑی خوشی اور سکون محسوس کرتے ہیں۔

میاں سعید سہگل برج اور گاف کے بڑے شایق ہیں۔ لیکن آج کل ان کی زیادہ توجہ ریس کے گھوڑوں پر مبذول رہتی ہے۔ ان کے پاس اپنے کئی گھوڑے ہیں جو متعدد انعام حاصل کر چکے ہیں۔

گذشتہ برس میاں صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ دنیا سوگوار ہوئی، اور جنت الفردوس خوشگوار۔ عزیزوں اور دوستوں نے غم کے آنسو بہائے، حوروں اور فرشتوں نے خوشی کے ترانے گائے۔ میری دعا ہے کہ خدا میاں صاحب کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔



شوکت جی
سبجالی

ہم میں سے ایک اکثریت کا یہ راسخ یقین ہے کہ سائنس اور امن، جنگ اور جہالت کو دنیا سے مٹا دیں گے۔ ہم تمام قوموں کے لیے دل سے دعا کرتے ہیں کہ آپس میں مفاہمت پیدا کریں۔ تباہی کے لیے نہیں بلکہ تعمیر، محبت اور نشوونما کے لیے — اس امید کے ساتھ کہ مستقبل کی زلفیں ان کے بازوؤں پر پریشاں ہوں گی جو ساری انسانیت کی بہبود کے لیے کچھ کر چکیں گے۔

شوکت سبجالی کے نزدیک یہ نظریات ایک منشورِ حیات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور انہی الفاظ کو انہوں نے زندگی بھر پیشِ نظر رکھا ہے۔ اِس لیے آج وہ ایک خوشحال اور خوشدل انسان ہیں۔ اپنی روزمرہ کی زندگی سے پوری طرح مطمئن، اور اپنے ہزاروں ملازمین کے لیے پُرخلوص جذبات رکھتے ہیں۔ اگرچہ اپنے فرائض کے لیے انہیں اکثر گھر کا آرام چین قربان کرنا پڑتا ہے۔ اپنے پیارے اہلِ خانہ سے میلوں دور جانا پڑتا ہے اور عام لوگوں کے لیے اقتصادی خوشحالی فراہم کرنے کے لیے انہیں میلوں فاصلے طے کرنے پڑتے ہیں۔

سبجالی ایک نہایت پاکیزہ انسان ہیں، اخلاقی نظریات پر بڑی پابندی سے عمل پیرا۔ صبح سویرے آٹھ بجے دفتر آجاتے ہیں۔ نیو جوبلی انشورنس کمپنی کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر کی حیثیت سے ان کے نزدیک سب سے اہم فرض — کام اور کام —— ہے۔ اتوار کو ہر چند کہ ان کا عملہ دفتر نہیں آتا لیکن وہ چند ایک گھنٹے وہاں ضرور بسر کرتے ہیں اور اس طرح اپنے ملازمین کے لیے یہ مثال قائم کرتے ہیں کہ مسلسل محنت کس قدر فائدہ بخش ہو سکتی ہے۔ ان میں سے بہت سے اپنی زندگی کو ان کے اسلوب کے مطابق ڈھال رہے ہیں اس دھندلے سے خیال کے ساتھ کہ کبھی وہ ایک کریانے کی دکان پر ایک معمولی سے سیلز مین تھے جس کی ماہانہ آمدنی صرف ۳۰/- روپے تھی۔ اور پھر وہ ایک کیمسٹ کی دکان پر، جہاں ترقی کے بہت کم امکانات تھے۔ مجھے اِن دنوں کی ایک خبر یاد آ رہی ہے کہ "کالج کے طلبہ بیروں کی حیثیت سے کام کر رہے ہیں۔ ایشیا میں ان باتوں کا رواج نہیں ہے۔ اس لیے اخبارات اسے شاندار کارناموں کی طرح چھاپتے ہیں۔ کیونکہ دنیا کے اس حصّے میں طبقاتی تمیز کا احساس بہت شدید ہے۔ اور شوکت سبجالی کے زمانے میں تو یہ شدید تر تھا۔ آج کے ماحول میں نوجوان خود بخود قائدانہ ذمہ داریاں نہیں سنبھال سکتے لیکن جب وہ سبجالی ایسا قائد سامنے پاتے ہوں تو ان کے لیے جو کچھ پہلے تعمیر ہو چکا ہے۔ اسے آگے لے جانا بہت آسان ہوتا ہے۔

سبجالی کے دادا ان کے لیے ایک قائد تھے۔ یہ پہلے مسلم خوجہ بیرونٹ ہونے کی حیثیت سے دولت بھی، ثقافتی سرمایہ بھی اور عزت و وقار بھی حاصل تھا۔ بیرونٹ ہز ہائی نس آغا خان کے ذاتی اور قریبی دوست تھے۔ وہ ایک ساتھ ہی پلے بڑھے تھے اور ایک سی آسائشیں انہیں میسّر تھیں۔ شہزادے اور نواب ان کے ساتھی تھے۔ اور سا اپنی آخری عمر میں بیرونٹ

کے بیٹے۔ شوکت سبجالی کے والد ایک سٹاک بروکر تھے۔ اور جب ۱۹۲۵ء میں شوکت سبجالی نے آنکھ کھولی تو وہ اپنے منہ میں چاندی کا جو چمچہ لے کر پیدا ہوئے وہ خالص سونے کا تھا۔ ان کے سات بھائی بہنیں بھی تھیں۔ وہ جو چاہتے انہیں میسر ہو سکتا تھا۔ اس وقت برصغیر میں تحریکِ آزادی کے آثار اُبھرے تو سیاسی صورتِ حال کے ساتھ ان کے خاندان کی خوش قسمتی بھی پلٹی۔ ۱۹۴۲ء کی تحریکِ آزادی کے دوران سٹاک مارکیٹ گر گئی اور بہت سے مکانات تباہ ہو گئے۔ رات کی رات میں لاکھوں پتی مفلس ہو گئے اور تجارت بالکل ختم ہو گئی۔ جب شوکت سبجالی کے سکول میں داخل ہونے کے دن آئے خاندانی دولت عنقا ہو چکی تھی۔ اگرچہ انہوں نے رہنے کے لیے ایک اعلیٰ مکان حاصل کر لیا تھا۔ ان کی والدہ نے اپنی خداداد ذہانت کے طفیل اخراجات میں کفایت شعاری سے کام لیتے ہوئے اپنے گھر کا وقار برقرار رکھنے کی کوشش کی تاکہ بچے اس اقتصادی تبدیلی کو محسوس نہ کر سکیں۔ بس ایک چیز میں انہوں نے کفایت شعاری سے کام نہ لیا وہ تھی تعلیم ——— انہوں نے پوری کوشش کی کہ ان کے آٹھوں بچے اعلیٰ تعلیم سے بہرہ ور ہو سکیں۔ اگرچہ ان کے چار بیٹے کالج میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ کام بھی کر رہے تھے۔ انہیں محنت بھی کرنا پڑتی تھیں اور مشکلوں سے بھی گزرنا پڑتا تھا لیکن ماں کی شفقت اور محبت بھرے سایے میں یہ سب کچھ بھول جاتا۔

سبجالی نے تعلیم کے ساتھ ساتھ محنت مزدوری کر کے بی۔ ایس۔ سی کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ایک دھوئیں بھرے گیرج سے نکلتا اور پُر ہجوم صنعتی علاقے کی کھڑکھڑاتی ٹیکسٹائل مل میں محنت کے لیے چلا جاتا ——— انہوں نے کبھی ہمت نہ ہاری۔ اور اپنے دوسرے بھائیوں کی طرح ان کی کوششیں بھی کامیابی سے ہمکنار ہوئیں۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ہی

وہ ۲۰۰/۰ روپے ماہوار کماتے رہے۔ پھر انشورنس بزنس میں ہی انہوں نے اعلیٰ عہدہ حاصل کر لیا۔ ۱۹۴۷ء میں اسی کمپنی نے ہی انہیں کراچی کی شاخ میں بھیج دیا جہاں وہ ۱۹۵۱ تک رہے۔ پھر امیر علی فینسی کے اشتراک سے انہوں نے ایک نئی کمپنی نیو جوبلی انشورنس کی بنیاد ڈالی۔ مسٹر فینسی اس کے چیئرمین اور سبجالی مینجر مقرر ہوئے۔ انہوں نے گھنٹوں روزانہ کام کیا اور کمپنی ترقی کے راستے پر گامزن رہی۔ انہوں نے ۱۹۵۷ تک نیو جوبلی کے نام سے ایک دنیا کو روشناس کرا دیا۔ اس وقت سے اب تک یہ پاکستان کی ممتاز قومی کمپنیوں میں شمار ہوتی ہے اور اس سو فی صد پاکستانی کارنامے کی ملک بھر میں شاخیں قائم ہیں۔

کم سخن انسان اپنے متعلق کبھی زیادہ بات چیت نہیں کرتے۔ اسی لیے شوکت سبجالی کہتے ہیں کہ یہ کامیابی امیر علی فینسی کی خداداد صلاحیتوں کے طفیل ہے۔ یہ سب کچھ ان کی رہنمائی، فلسفے اور مسلسل توجّہ کے باعث ہے۔ سبجالی اس امر پر فخر کرتے ہیں کہ ان کے معمولی سے آغاز سے اب ملک بھر میں... ۱۰۰ سیلز مینوں کو معقول ذریعہ معاش ملا ہے اور ۳۰۰ مزید کارکن کراچی ہیڈ آفس میں کام کر رہے ہیں۔ ان پاکستانیوں کو مفت طبّی امداد، پوری تنخواہ کے ساتھ ایک سال میں ایک ماہ کی چھٹیاں، دو ماہ کی تنخواہ کے برابر سالانہ بونس میسّر ہے۔ سبجالی کہتے ہیں کہ "ایک مرتبہ جو شخص ہمارے ساتھ کام شروع کر دیتا ہے۔ وہ ہمیں کبھی چھوڑ کر نہیں جاتا۔" اس کی وجہ سبجالی کی اپنے عملے سے محبت اور شفقت ہے۔

۱۹۵۵ سے وہ سال کے سال دوسرے ملکوں کی انشورنس کمپنیوں کے کام کے جائزہ اور مشاہدے کے لیے جاتے ہیں تاکہ وہ پاکستان کے لیے بہتر معلومات لے کر آسکیں۔

وہ انشورنس ایڈوائزری بورڈ کے ممبر بھی رہے ہیں اور تین برس وہ انشورنس ایسوسی ایشن آف پاکستان کے چیئرمین رہے ہیں۔ انہیں بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہے لیکن ۱۹۵۸ میں جب انشورنس ایکٹ میں پہلی نمایاں ترمیم عمل میں آئی۔ شوکت سبحالی اس کمیٹی کے ممبر تھے جس نے انشورنس کی تجارت کو معقول بنایا اور جس کے اثرات نہایت دوررس ثابت ہوئے۔ اور نتیجۃً پاکستان میں انشورنس کی تجارت نے بڑی ترقی کی۔ ۱۹۶۰ کے دوران میں امریکی امداد کے پروگرام کے تحت سبحالی اور جمی فینسی (امیر علی فینسی کے چچازاد بھائی) کو امریکہ کے آٹھ ہفتے کے مطالعاتی دورے کی دعوت ملی۔ اس دورے سے انہوں نے بہت سی نئی معلومات حاصل کیں۔ جو پاکستان میں انشورنس بزنس کے افق کو وسعت بخشنے میں نہایت کامیاب ثابت ہوئیں۔ اپنے وسیع تجربے کے باعث سبحالی صاحب کو قاہرہ میں انشورنس کی ہونے والی افرو ایشیین کانفرنس میں شرکت کے لیے منتخب کیا گیا۔ وہ جہاں بھی گئے انہوں نے پاکستان کے دوستوں میں اضافہ ہی کیا ہے۔

کراچی میں اپنے گھر میں (جب وہ اپنے گھر میں داخل ہوتے ہیں) ان کی نوجوان اور پیاری بیوی (سونیا)، ان کے ۱۲½ سالہ بیٹے، سات سالہ بیٹی اور سپنکی —— کتا سب نہایت گرمجوشی سے ان کا استقبال کرتے ہیں۔ سونیا اپنے شوہر کا نہایت فخر سے ذکر کرتی ہیں۔ بیگم سبحالی سپینسر کی پوتی ہیں۔ وہ سپینسر جنہوں نے کراچی کو سپینسر آئی ہاسپٹل کا تحفہ دیا تھا۔

زیادہ دیر کی بات نہیں کہ شوکت اپنی بیگم کو سوس دی انشورنس کمپنی کی سالانہ تقریبات کے موقع پر زیورچ لے گئے۔ اس تقریب میں بیگم سبحالی تنہا ایشیائی خاتون

تھیں لیکن ہر کوئی ان کی خوب صورت پاکستانی ساڑھیوں اور ان کی دل کشی سے متاثر ہُوا تھا۔ انہوں نے ہر جگہ اور ہر وقت سچائی کی خدمت میں جو کچھ کر سکے ہیں، کیا ہے — وطن لوٹ کر سبجالی اپنے اصولوں کو عملی جامہ پہناتے ہیں، وہ ایک ایسے شخص ہیں جو حال میں زندہ رہنے کے قائل ہیں — وہ اپنی ذات میں ایک پوری مہم ہیں جو اقتصادی ترقی کے راستے ہموار کر رہی ہے۔



مسٹر عبدالقادر

ہمارے ہاں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جنہوں نے کامیابی کے درخشاں راستے پر دن رات لگاتار محنت کی ہے اور شدید محنت و مشقت کے بعد وہ اپنی منزلِ مقصود کو پا چکے ہیں۔ اپنے عروج کو پہنچنے اور تمام خواہشات کی تکمیل کے بعد یہ لوگ آرام و آسائش کے حصول کے لیے ریٹائر ہو سکتے تھے۔ مگر اس کے برعکس وہ کاروباری دنیا کو اپنے علم و تجربہ اور سوجھ بوجھ سے فائدہ پہنچانے کے لیے میدان میں داخل ہو گئے مسٹر عبدالقادر بھی ایسے ہی لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جنہوں نے عملی زندگی کا آغاز سول سروس کے نچلے زینے سے کیا اور انتہائی بلندیوں تک جا پہنچے۔ آج کل آئندہ پیشہ کی تلاش میں مصروف نوجوانوں کے لیے مسٹر عبدالقادر کا مشورہ نہایت کارآمد ثابت ہو سکتا ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ کوشش کے بغیر حاصل ہونے والی چیز کو ہم کوئی اہمیت نہیں دیتے بلکہ اس کی قدر و قیمت کا راز اس کی کمیابی میں مضمر ہے۔ علم تک پہنچنے والا مختصر راستہ ناپائیدار ہوتا ہے جو ہوا کے ایک جھونکے سے ختم ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے نوجوان ایسے ہی مختصر راستوں کی تلاش میں رہتے ہیں کیونکہ وہ مطالعہ اور

محنت کے طویل سالوں کی صحیح قیمت ادا کرنے کو تیار نہیں۔ یہ نوجوان ایسے لوگوں سے حسد کرتے ہیں جو کاروباری دنیا میں اہم مقام کے حامل ہیں اور خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنا موجودہ مقام صرف جادو کے ذریعے حاصل کر لیا ہے۔ اگر ان نوجوانوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ لوگ اپنے موجودہ مقام تک کیسے پہنچے تو ان کو کامیابی کے حصول کا پہلا سبق فوراً مل جائے۔ پاکستان کو اقتصادی آزادی کے حصول کے لیے ایسے ہی لوگوں کی ضرورت ہے۔

عبدالقادر صاحب کو اپنی زندگی کی جدوجہد میں ایسا کوئی مختصر راستہ نہیں ملا وہ اکسٹھ سال قبل مشرقی پنجاب میں پیدا ہوئے تھے۔ ان دنوں ترقی کی رفتار نہایت سست تھی۔ سفر تانگہ، گھوڑا گاڑی یا ریل کے ذریعے کیا جاتا تھا۔ ابتدائی زندگی آرام و آسائش سے دور رہی۔ ہر شے کے حصول کے لیے آپ کو سخت محنت کرنی پڑی۔ بطور ایک طالب علم کے آپ نے عہد کیا کہ وہ اپنے پیشے کی انتہائی بلندی تک پہنچ کر دم لیں گے خواہ اس کام میں پوری عمر ہی کیوں نہ صرف ہو جائے چنانچہ خود اعتمادی اور عزم صمیم کی بدولت اپنے مقصد کے حصول میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ درمیانی عمر میں ہی آپ سٹیٹ بنک آف پاکستان کے گورنر کے عہدہ تک جا پہنچے جو بنکنگ کے میدان میں سب سے بڑا اعزاز تصور کیا جاتا ہے۔ اس عہدہ پر آپ سات سال تک متمکن رہے۔ یہ عرصہ معمول سے دو سال زیادہ ہے۔ آپ کی جوانی کے ابتدائی ایام میں مقابلہ بہت سخت تھا، برعظیم کے برطانوی حکمرانوں نے سول سروس میں داخلہ کے لیے نہایت اعلےٰ معیار مقرر کر رکھا تھا اور بہت سے طلبا سخت مطالعہ و محنت کے باوجود معیار پر پورے نہ اترنے سے ناکام رہ جاتے۔ مسلمان عام طور پر بنکنگ یا انشورنس

کا رُخ بھی نہیں کرتے تھے۔ سول سروس میں مقابلہ کے امتحان کے لیے صرف گنتی کے امیدواروں کو اجازت ملتی تھی۔ نوجوان عبدالقادر نے عملی زندگی کا آغاز ایک معمولی اکاؤنٹس افسر سے کیا اور آہستہ آہستہ ترقی کرتے ہوئے حکومت ہند کے انکم ٹیکس افسر کے عہدہ تک جا پہنچے قیام پاکستان کے بعد آپ کی لیاقت و محنت کی بنا پر آپ کو وزارت مالیات کا جائنٹ سیکرٹری مقرر کیا گیا اس کے علاوہ آپ کو "وقتاً فوقتاً" قائداعظم کی خدمت کا موقع بھی ملتا رہا۔ سالہاسال تک یہ اہم فرائض انجام دینے کے بعد ۱۹۵۲ء میں آپ کو ملازمت سے سبکدوش کر دیا گیا تھا مگر جلد ہی آپ کو سٹیٹ بنک آف پاکستان کا گورنر مامور کر دیا گیا۔

اس اعلیٰ عہدے پر پہنچنے کے بعد بھی آپ عوامی مسائل میں گہری دلچسپی لیتے رہے جس کے متعلق کئی واقعات مشہور ہیں۔ پاکستان میں مقیم ایک غیر ملکی خاتون بھی آپ کی بلند اخلاقی کا ایک واقعہ بیان کرتی ہے۔ اس بیوہ خاتون کا بچہ ۱۹۵۹ء میں اچانک اس سے ملنے کے لیے یہاں آیا گو اس خاتون نے اپنی ذاتی آمدن سے کافی ملکی کرنسی جمع کر رکھی تھی مگر یہ رقم اس کے بچے کے واپسی کے اخراجات کے لیے ناکافی تھی چنانچہ اس خاتون کو کافی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا۔ اس خاتون کو بتایا گیا کہ صرف سٹیٹ بنک کا گورنر ہی ملکی کرنسی سے بچے کا واپسی ٹکٹ خریدنے کی اجازت دے سکتا ہے مگر اس وقت بنک بند ہو چکا تھا۔ ہفتہ کی شام تھی اور اس خاتون کے لیے یہ نہایت پریشانی کا وقت تھا۔ مگر اس نے گورنر کو فون کر کے امداد کی درخواست کی۔ گورنر اس وقت گھر سے باہر تھے، مگر ان کی چھوٹی بچی نے جواب دیا کہ ان کے واپس آنے پر ان کو تمام معاملہ سے آگاہ کر دیا جائے گا، چنانچہ گورنر نے رات کو ایک تقریب میں

شرکت سے قبل ہی اس خاتون سے رابطہ پیدا کیا اور پیر کی صبح کو تمام معاملہ تسلّی بخش طور پر طے ہو گیا۔ مسٹر قادر کی اس ذاتی دلچسپی اور دانش مندانہ اقدام سے یہ چھوٹا سا غیر ملکی کتبہ ابھی تک پاکستان کے گن گاتا ہے۔

مسٹر عبدالقادر قیادت کے لیے ہمیشہ موزوں پائے گئے ہیں۔ حال ہی میں قائم شدہ نیشنل آئلز لمیٹڈ کے چیئرمین کے طور پر آپ کا پروگرام نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ آپ کی زیرِ ہدایت ملک میں دریافت ہونے والا تیل صحیح مقاصد کے لیے استعمال ہوگا اور زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والے افراد اس سے استفادہ کر سکیں گے گذشتہ سال مئی میں جب اس ادارہ کے حصص فروخت ہونے لگے تو ان حصص کی مانگ اس قدر زیادہ تھی کہ ان کے لیے تیس ہزار سے زائد افراد نے درخواستیں روانہ کیں صرف قومی سرمایہ کاری ٹرسٹ نے دس لاکھ روپے کی مالیت کے حصص خریدے یہ کمپنی اس سال کاروبار شروع کر دے گی اس سلسلہ میں تیل صاف کرنے کا کارخانہ قائم کیا جا رہا ہے۔ جہاں خلیج فارس سے آنے والا تیل صاف کر کے پٹرول اور اس کی دوسری مصنوعات تیار کی جائیں گی۔ امریکن انٹرنیشنل آئل کمپنی ٹیکنیکل امداد مہیا کرے گی اور مقامی عملہ کو تربیت بھی دے گی۔ اس نئی اور ضروری صنعت کے قیام کے لیے بنک آف امریکہ نے بھی ایک کروڑ ڈالر کا قرضہ دیا ہے۔ کراچی اور چٹاگانگ میں قائم ہونے والے کمپنی کے مراکز کے لیے اٹھائیس لاکھ ڈالر کا سازوسامان بھی درآمد کیا جائے گا۔ جس میں لیبارٹری۔ آگ بجھانے کے آلات۔ ذخیرہ کرنے کے ٹینک اور دیگر مشینری شامل ہے۔ یہ سازوسامان فرانس سے منگایا جا رہا ہے اور کارخانوں کے لیے جگہ کا انتخاب ہو چکا ہے۔

مسٹر قادر اور دیگر ڈائریکٹر جن میں اے کے خان، داؤد، رنگون والا، عبد الجلیل، نصیر شیخ اور محمد بشیر شامل ہیں، مکمل تعاون کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ مگر ان کو اپنے چیئرمین پر مکمل اعتماد ہے، مسٹر عبد القادر نے اعزازی طور پر بھی بہت سے اداروں کی سربراہی کے فرائض سنبھال رکھے ہیں، جن میں ٹیکسیشن اینڈ ٹیرف کمیشن اور نیشنل انکم کمیشن بھی شامل ہیں۔ آپ کا دوستانہ انداز، پرسکون چہرہ اور سنجیدہ انداز دیکھ کر ابراہیم لنکن کی یاد آتی ہے، جن کی نہ صرف گھریلو حلقے بلکہ اپنے دفتر میں ہر جگہ عزت کی جاتی تھی۔ ہوٹل یا کلب میں آپ کے ساتھی آپ کو دیکھ کر رک جاتے ہیں اور آپ کو گزرتے دیکھ کر احترام سے سر جھکا دیتے ہیں۔ مگر مسٹر عبد القادر خود کو متوسط طبقہ کا رکن ظاہر کرتے ہیں اور اس بات پر فخر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں سادگی کا قائل ہوں کیونکہ مسرت کا راز سادگی میں ہی پنہاں ہے، چھٹی کا دن، آپ اپنی بیگم کے ہمراہ اپنے پوتوں اور نواسوں میں گزارتے ہیں۔ آپ امین خیراتی وقف اور داؤد فاؤنڈیشن کے ٹرسٹی بھی ہیں۔ آپ کے نزدیک خود کو مصروف رکھنا عمدہ زندگی گزارنے اور نوجوان رہنے کے لیے ضروری ہے۔

پاکستان کے متعلق آپ کے خیالات نہایت سادہ مگر معقول ہیں۔ ایک مرتبہ آپ نے فرمایا تھا کہ برعظیم کی تقسیم ہی ہمارے مسائل کا واحد حل تھی، ہمیں اپنی روایات اور تہذیب و ثقافت کو ترقی دینا تھا۔ اور اس کے لیے ہم دوسروں کا سہارا نہیں لے سکتے تھے۔ ہمارے ملک کا مستقبل نہایت شاندار ہے اور ہم نے جو خون بہایا ہے وہ رائیگاں نہیں جائے گا۔ ملک و قوم کے لیے آپ کی شاندار خدمات کے سلسلہ میں آپ کو ستارۂ پاکستان کا اعزاز بھی مل چکا ہے۔

قاسم دادا

پاکستان کے استحکام، قوت اور وقار کا دارومدار آج پاکستان کے لاکھوں اوسط درجے کے افراد کو ذریعۂ معاش مہیا کرنے والے صنعت کاروں کے شوقِ تحقیق و تجسس پر ہے۔ انسان فطرتاً ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے ان سب سے مساوی سلوک بے سود ہے۔ مختلف کارخانوں میں ملازم سینکڑوں افراد کے لیے موزوں معاشی مساوات اور طریقِ کار کو فعال کرنا متعلقہ منتظمین سے بڑے گہرے غور و فکر کا تقاضا کرتا ہے۔ اکثر اوقات اس کے لیے زندگی بھر کے تجربے کی ضرورت ہوتی ہے لیکن ہمارے درمیان بعض ایسے نوجوان منتظم بھی ہوتے ہیں۔ جو وجدانی طور پر فعال نظریات لے آتے ہیں۔ اور کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔ جبکہ دوسرے اپنے مقصد کے حصول میں ناکام رہتے ہیں، حالانکہ ان کی پیدائش رئیس گھرانوں میں دولت کے انباروں میں ہوئی ہوتی ہے ——

جواں سال اور ہشاش بشاش قاسم دادا کو بامِ کمال تک پہنچنے میں زندگی بھر کے تجربے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ ان کی موروثی دولت نے ان کے راستے کو آسان

بنا دیا اور انہوں نے اس سے پورا پورا فائدہ یوں اٹھایا کہ ہمیشہ نئے نئے اور مختلف مواقع کی جستجو کی اور انہیں ہمیشہ صحیح وقت پر گرفت میں لے لیا۔ ایسبسٹاس سیمنٹ انڈسٹریز لمیٹڈ کے چیئرمین اور مینجنگ ڈائریکٹر جواں ارادہ قاسم دادا کئی برس سے صنعت و تجارت کی کم از کم ۳۰ نمایاں کمپنیوں کے چیئرمین، صدر، اور ڈائریکٹر اعلےٰ چلے آرہے ہیں۔ اس کے علاوہ کئی ایک رفاہِ عام اور خدمتِ انسانی کی تنظیموں کی مجلس عاملہ کے رُکن بھی ہیں۔

دادا صاحب کے والد اگرچہ پہلے پہل صرف ایک سکول ماسٹر تھے لیکن بعد میں انہوں نے جنوبی ہند کے ایک قصبے تیلیچری میں قرض پر غلّے کی تجارت کا آغاز کیا تو ان کے حالات بدل گئے۔ قاسم دادا نے ۱۹۱۹ء میں خوشحالی کے دور میں ہی آنکھ کھولی۔ اپنے باپ کے سولہ بچوں میں سے چھٹے بیٹے تھے۔ اِن سولہ میں سے ۱۰ لڑکے تھے۔ قاسم دادا کا بچپن بڑا خوش و خرم گذرا۔ کلکتہ سے اپنی تعلیم مکمل کی اور ۱۹۳۹ء سے اپنے والد کے ساتھ کام میں شریک ہو گئے۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے سمندری جہازوں کی تجارت کا آغاز کر دیا۔ اپنی محنت اور بلند فطری کے باعث پانچ سال بعد وہ پاکستان شپ اونرز ایسوسی ایشن کے بانی صدر بن گئے۔ تیس تینتیس برس کی عمر میں ایک شخص کے لیے یہ اعزاز بہت بڑا کارنامہ تھا۔ بعد میں وہ پاکستان مرچنٹس ایسوسی ایشن، پاکستان شپنگ لائن اور بانٹوا میمن جماعت کے صدر بھی رہے۔ آل پاکستان میمن فیڈریشن اور کراچی سٹاک ایکسچینج کے وہ اب بھی صدر ہیں۔ انہوں نے انہیں اپنا کافی وقت دیا ہے۔ ۱۹۵۸ء سے ۱۹۶۳ء تک وہ محمدی سٹیم شپ کمپنی لمیٹڈ کے چیئرمین رہے اور اس عظیم ادارے کو انہوں نے نہایت وقار اور عظمت سے چلایا۔ سٹیٹ بنک آف پاکستان جیسن اینڈ نکلسن،

کالونی ٹیکسٹائلز۔ اینج کے دادا لمیٹڈ، بھارت اور برما میں ان کے والد کی تجارت، آدم جی شوگر ملز کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے بھی ان کا کام قابلِ ذکر ہے۔

قاسم دادا کی زندگی میں ایک اور واقعہ ایسا ہوا جس سے ان کی زندگی پر ایک حد تک تبدیلی آگئی۔ محمدی سٹیم شپ کمپنی کی چیرمینی کے دوران انہیں ہوابازی کا شوق چرایا، اور ایک شام جب وہ اپنے دوست کے پاس سے اٹھ کر آ رہے تھے تو اس دوست سے ملنے اسی لمحے ایک مہمان آئے، جن کا تعارف ایک پائلٹ کی حیثیت سے کروایا گیا۔ قاسم دادا جب کار میں بیٹھ رہے تھے تو پائلٹ صاحب نے دادا کو بتایا کہ ایک جہاز کم قیمت لیکن زیادہ لطف دہ ہوتا ہے۔ چند روز بعد اس پائلٹ نے قاسم دادا کو کراچی فلائنگ کلب کی پچیسویں سالگرہ میں شمولیت کی دعوت دی۔ اس شاندار شام کے بعد قاسم دادا نے سوچا کہ سوسیل کے علاقے کے اندر واقع کسی تجارتی ادارے کے لیے ایک چھوٹا سا جہاز کس قدر اچھا رہے گا ــــ ان کا شوق اور تیز ہوگیا، ہوابازی سے ان کی محبت بڑھ گئی، اور چار ماہ کے اندر اندر اس تجارتی شخصیت نے تربیت بھی حاصل کرلی اور ہوابازی کا باقاعدہ لائسنس بھی لے لیا۔ اس کہانی کا اختتامیہ پریوں کی داستان کا سا ہے۔ اگر وہ ہواباز نہ بنے ہوتے اور اپنے جہاز کا تجربہ حاصل نہ کیا ہوتا تو ان کا کاروبار کراچی سے باہر تک نہ بڑھا ہوتا۔ اب حیدر آباد میں ایسبسٹاس سیمنٹ انڈسٹریز میں ۳۰۰ کے قریب ملازم صرف اسی سبب سے بہت اچھے پیسے کما رہے ہیں۔ ان کے بچوں کو مفت تعلیمی سہولتیں بھی مہیا ہیں۔ قاسم دادا اکثر حیدر آباد کو پرواز کرتے رہتے ہیں لیکن وہ تو زیادہ تر عالمی مسافر ہیں اور اپنے ملک کے غیر سرکاری سفارتی نمائندے اور کمرشل ایلچی ہیں۔ ایک مرتبہ ان کا انجن خراب ہوگیا اور دو مرتبہ انہیں موسم کی خرابی کے باعث مجبوراً اترنا پڑا، لیکن وہ بال بال

بچ گئے۔ یہ یقیناً اس لیے کہ انہیں ابھی اس زمین پر اہم کام کرنے ہیں۔

قاسم دادا غیر ملکی تجارت میں پاکستان کے مسائل سے پوری طرح باخبر ہیں، انہیں معلوم ہے کہ دوسرے ترقی پذیر ملکوں کو جن مسائل کا سامنا ہے، یہ بھی ان سے ملتے جلتے ہی ہیں، اس سلسلے میں پاکستان کو ہر لمحہ تیز رفتاری سے ترقی پذیر صنعتی دور کی روشنی میں اپنے دس کروڑ افراد کی معاشی حیثیت پر غور کرنا چاہیئے،

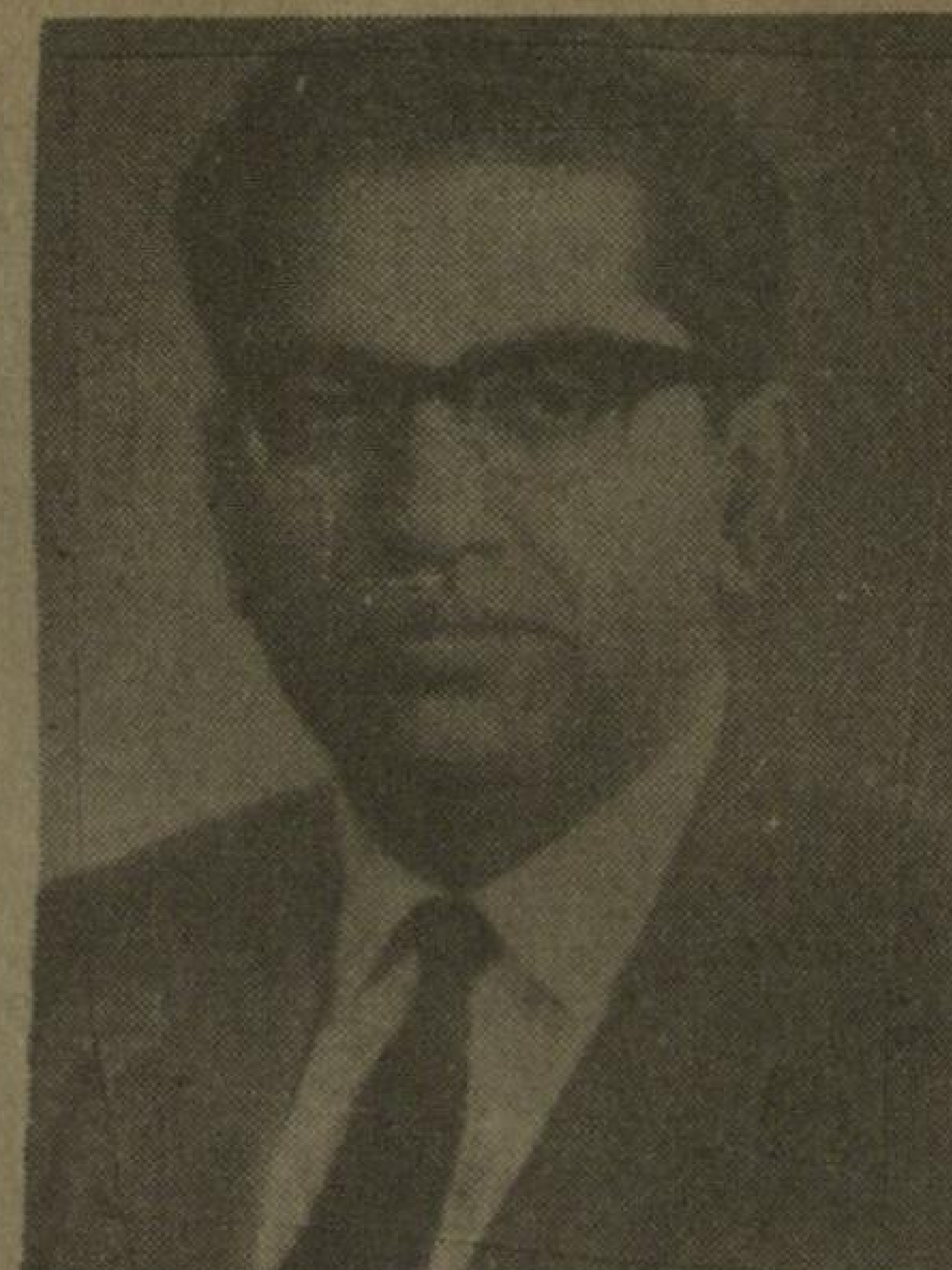
قاسم دادا کے نزدیک یہی پاکستان میں محدود صنعت کی وجہ بھی ہے۔ غیر ملکی کمپنیاں باہمی مفادات اور اطمینان کے لیے صرف یہی کر سکتی ہیں کہ پاکستانیوں کو اپنے ساتھ کام کا موقع دیں۔ قاسم دادا نے ایبسٹاس سیمنٹ میں کافی سے زیادہ غیر ملکی افراد کی شرکت کا اہتمام کیا اور اس سے نتیجتہً حیدر آباد کے منصوبے میں توسیع ہوئی اور دو نئے کارخانوں کی بھی منصوبہ بندی ہو گئی۔ ان میں سے ایک چٹاگانگ میں اور ایک کراچی میں لگے گا۔ اس سے سینکڑوں افراد کو بہت جلد اور بڑی بااعتماد ملازمت مل جائے گی اور ملکی خوشحالی میں بھی اضافہ ہوگا۔ اپنے وطن سے دل سے محبّت رکھنے والے قاسم دادا کا یہ اقدام قابلِ صد تحسین ہے اور وہ ایک ایسے شخص ہیں جن کو قیادت قدرتی طور پر مِل جاتی ہے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ دوسروں کے مفاد کے لیے درست فیصلے کیسے کیے جاتے ہیں۔

قاسم دادا کی مصروفیتیں دن کے ہر لمحے جاری رہتی ہیں اور اپنے کاروبار کو بھی پوری طرح سنبھالنے کے باوجود وہ 'خدمتِ خلق' کے فرض کو فراموش نہیں کرتے۔ اپنے دفتر میں کام کا آغاز کر کے وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ وقت کی پوری پابندی کے ساتھ پہنچ جاتے ہیں۔ کبھی تاخیر نہیں ہونے دیتے۔ خواہ یہ کسی بورڈ کی میٹنگ ہو یا انہیں اپنے ٹیکنیکل ڈائریکٹر مسٹر برگ سے منگھو پیر میں ملنا ہو۔ وہ اپنے عملے کے ساتھ بھی اسی قربت اور باقاعدگی

سے کام کرتے ہیں جس طرح اپنے 'سماجی بھلائی' کے مشن کو نبھاتے ہیں۔ قاسم دادا اسٹیٹ بنک آف پاکستان کے سنٹرل بورڈ میں حکومت کی طرف سے پاکستان رفیوجی ری ہیبلیٹیشن فنانس کارپوریشن کے نامزد ڈائریکٹر بھی ہیں۔ سماجی بہبود کے وسیع تجربے اور ایسی ہی کئی انتظامی کمیٹیوں کے رُکن کی حیثیت سے وہ اس فرض کو نہایت عمدگی سے نباہ رہے ہیں۔

قاسم دادا اپنے گھریلو ماحول میں بیٹھے ہوئے بڑا سکون محسوس کرتے ہیں۔ اپنی پیاری بیگم، چار بیٹیوں اور ایک بیٹے سے انہیں نہایت گہری محبت ہے۔ کبھی کبھی وہ اپنے بچوں کو بھی اپنے ساتھ ہوا کے دوش پر لے جاتے ہیں۔ وہ اب تک ۱۴۰۰۰ ہوائی میل کا سفر کر چکے ہیں۔ پاکستان کے کسی غیر پیشہ ور ہوا باز نے اتنا سفر نہیں کیا۔ اپنی کمپنی کے جہاز میں وہ پشاور تک اور اُدھر امرتسر تک گئے ہیں اور ہمیشہ مسکراتے ہوئے لوٹے ہیں۔ کراچی ایرو کلب میں پہلے ایک نائب صدر اور اب انتظامی کمیٹی میں حکومت کی طرف سے نامزد رکن کی حیثیت سے دادا ان کے نہایت سرگرم ارکان میں سے ہیں۔ ان کا محبوب مشغلہ فوٹوگرافی بھی ہے۔ انسانوں اور جگہوں کی تصویریں اتار کر انہیں دلی مسرت ہوتی ہے

قاسم دادا اپنی تجارت کے سلسلے میں نو مرتبہ امریکہ جا چکے ہیں۔ ان کے والد محترم جنہیں اپنی ۹۳ سالہ عمر میں امریکہ اتنی دور جانے کا کبھی اتفاق نہ ہو سکا۔ انہیں اپنے پوتے بلکہ پڑپوتے دیکھنے کی خوشی بھی ملی۔ وہ دنیا سے نہایت محبت رکھتے تھے، اب قاسم دادا ان کے نقشِ قدم پر محو پرواز ہیں۔



محمدؐ علی رنگون والا

مسٹر رنگون والا جدید دور کے انسان ہیں جو مستقبل پر گہری نظر رکھتے ہیں اور کسی کو ناراض کیے بغیر بھی اس سے اختلاف رائے کر سکتے ہیں۔ یہی بات آپ کی بہترین خصوصیت اور کامیابی کی دلیل ہے اسی خوبی کی بنا پر مادی نقصانات، جنگ اور ترکِ وطن کی مشکلات کی الجھنوں پر قابو پانے کے قائل ہوئے ہیں۔ آپ نہ صرف ایک مشہور کاروباری شخصیت بلکہ پندرہ سے زاید تجارتی اداروں کی انتظامیہ میں اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ ان اداروں میں انشورنس کمپنیوں اور بنکوں سے لے کر ڈیگک، نیشنل سٹیل آف پاکستان اور برما آئیل ملز لمیٹڈ تک شامل ہیں۔ آپ اپنی ذاتی اہلیت کے علاوہ ملک کی کاروباری دنیا میں بھی نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

آپ کے نزدیک ملک کی خوش حالی اس صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے کہ ملک میں آزادانہ معیشت کو رائج کیا جائے اندرون و بیرون ملک سفر کے دوران مسٹر رنگون والا نہایت جوش و خروش کے ساتھ آزادانہ معیشت کے قیام پر زور دیتے رہے ہیں جس کے تحت لاکھوں افراد کو "سرخ فیتہ" سے نجات دلائی جا سکتی ہے۔

ہمیں فخر ہے کہ آج کل طیارے شب و روز مصروفِ سفر ہیں اور ہمارے پیغامات ایک گھنٹے سے بھی کم وقت میں سمندر پار پہنچ جاتے ہیں۔ فون اُٹھا کر شہر میں فوراً کسی کے ساتھ بات کر سکتے ہیں۔ ان باتوں کو ہم تسلیم کر چکے ہیں کیونکہ سالہا سال سے ان کا رواج عام ہو چکا ہے۔ مگر جب زرِ مبادلہ کے حصول کا مرحلہ درپیش ہو تو — حتیٰ کہ ہنگامی صورتِ حال یا موت و زندگی کے مسئلہ میں بھی — کنٹرول کے قواعد آڑے آجاتے ہیں اور کون کہہ سکتا ہے کہ ایک سفر یا کاروباری معاملہ طے کرنے میں کتنے قوانین کا خون کر دیا جاتا ہے۔

زائد قیمت پر زرِ مبادلہ حاصل کرنے کے نہ معلوم کتنے طریقے رائج ہیں اور نہ معلوم کتنے شہری یہ طریقے اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ مگر جس آزاد معیشت کے قیام کے مسٹر رنگون والا خواہاں ہیں۔ وہاں یہ قابلِ افسوس طریقے ختم ہو جائیں گے۔ آپ نے بتایا کہ بہت سے ترقی پذیر ممالک غیر ملکی امداد کی بدولت راتوں رات امیر بن گئے ہیں لیکن اگر ہم اپنی مدد آپ کے اصول کو تسلیم نہیں کریں گے تو غیر ملکی امداد بھی ہمارے کام نہیں آسکتی۔ قرضے اور امداد ہماری کوششوں میں معاون تو ثابت ہو سکتے ہیں، مگر ہماری ذاتی دلچسپی اور محنت کا بدل ثابت نہیں ہو سکتے۔

"ہمتِ مرداں مددِ خدا" کی پرانی کہاوت پر اگر سوچ سمجھ کر — اور خصوصاً تعلیم کے میدان میں عمل کیا جائے تو یہ صحیح ثابت ہو سکتی ہے۔ مسٹر رنگون والا تمام ملک میں برتھ کنٹرول کی سہولتیں رائج کرنے کے بھی حامی ہیں۔ مگر عوام کو ان کے فوائد سے آگاہ کرنے کی بھی ضرورت ہے اور ملک میں بڑوں کے سکول بھی اتنے ہی اہم ہیں جتنے کہ بچوں کے۔ مارک ٹوین کی تحریروں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ

"آڑو پہلے کڑوا بادام ہوتا ہے اور بند گوبھی پھول کی ترقی یافتہ صورت ہے۔ ایسے ہی آزاد معیشت کے ذرائع کمترین درجہ کے شہریوں کو بھی زیادہ سے زیادہ مواقع مہیا کیے جا سکتے ہیں اگر زرِ مبادلہ پر کنٹرول ختم کر دیا جائے تو درآمد شدہ خام مال سے تیار ہونے والی اشیاء ضروریہ عوام کو سستے داموں مل سکتی ہیں اس طرح عوام کو روزی آسانی کے ساتھ مل سکتی ہے اور وہ خواہ مشکل کے ساتھ ہی — اپنے بچوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کر سکتے ہیں۔ ہر شخص بآسانی جان سکتا ہے کہ محمد علی رنگون والا ملک کو مالی طور پر "آزاد" کرانے کے لیے ہر ممکن قربانی کے لیے تیار ہیں اس سلسلہ میں آپ کی تربیت کو بھی گہرا دخل ہے آپ اپنے والدین کے واحد بچے تھے اور شاید اسی وجہ سے آپ میں خود اعتمادی کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے آپ انتالیس سال قبل رنگون (برما) کے مقام پر پیدا ہوئے۔ مگر آپ کے والدین نے آپ کی بے جا ناز برداری نہیں کی۔ بلکہ محبت کے ساتھ ساتھ سختی کے ساتھ آپ کی راہنمائی بھی کی۔

اس وقت آپ پانچ بچوں کے باپ ہیں دوسری جنگِ عظیم کے دوران برما پر جاپانی حملہ کے وقت آپ کو سب کچھ چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ بغیر کسی قابلِ ذکر سرمایہ کے آپ بمبئی پہنچے۔ جہاں سوتی کپڑے اور بساطی کا چھوٹا موٹا کاروبار شروع کر دیا، ۱۹۴۷ء میں قیام پاکستان کے بعد یہ کاروبار چھوڑ کر آپ کراچی آگئے جہاں تیل کی مصنوعات کا کاروبار شروع کر دیا اور انتھک محنت سے جلد ہی اس کو عظیم الشان کاروبار کی صورت دی۔ جس کے آپ تنہا مالک تھے اس وقت آپ کراچی میں ایک کارخانہ کے مالک ہیں جہاں پانچ سو سے زائد افراد ملازم ہیں حال ہی میں پشاور کے قریب نوشہرہ کے مقام پر آپ نے بناسپتی گھی کا کارخانہ قائم کیا ہے جس کے آپ چیئرمین ہیں۔ دونوں

کارخانے ملک کی کافی ضروریات پوری کر رہے ہیں ان کارخانوں میں مویشیوں کا چارہ بھی تیار ہوتا ہے جس کا کافی حصہ برآمد کر کے زرِ مبادلہ کمایا جاتا ہے۔

مسٹر رنگون والا کی نجی زندگی نہایت سادہ ہے آپ شان و شوکت کے خواہاں نہیں ہیں آپ پیدائشی مخیر ہیں مگر دکھاوے یا شہرت سے دُور بھاگتے ہیں۔ اجتماعی اداروں کی بجائے ذاتی طور پر ملک کے پانچ ہزار "دوراجی" لوگوں کی مالی امداد کرتے ہیں مسٹر رنگون والا کے کہنے کے مطابق "ملک کے دس فی صد دوراجی مالدار ہیں، پینسٹھ فی صد درمیانے درجہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ جبکہ پچیس فی صد انتہائی غریب ہیں۔ مگر دوراجی طبقہ کو امداد خیرات کے طور پر نہیں دی جاتی بلکہ اس کے تین مقاصد ہیں۔ سب سے بڑا مقصد تو یہ ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بھیک مانگنے یا فاقے کرنے پر مجبور نہ ہو، مسٹر رنگون والا اور آپ کے خوشحال دوست فرصت کے وقت جمع ہو کر ان کی بہبود کے منصوبے تیار کرتے ہیں اپنے غریب بھائیوں کو ضروری تربیت دلا کر ان کو کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ سکول، ہسپتال اور اعلیٰ تعلیمی ادارہ کی تعمیر کا منصوبہ بنایا جاتا ہے جہاں ہر دوراجی بوقتِ ضرورت داخل ہو سکے۔ اگر کوئی غریب دوراجی انتقال کر جائے تو اظہارِ افسوس کے ساتھ ضروری مالی امداد بھی مہیا کی جاتی ہے اگر کوئی یتیم ہو جائے تو اس کی دیکھ بھال کا بندوبست بھی کر دیا جاتا ہے۔ مستقبل قریب میں زیادہ سے زیادہ سکول کالج اور خواتین کے صنعتی مراکز تعمیر کیے جائیں گے اس سلسلہ میں لیاقت نیشنل ہسپتال کے قریب ہی ضروری عمارات تعمیر کی گئی ہیں۔ یہ عمارتیں ان کی برادری نے دوسروں سے امداد قبول کیے بغیر اپنے وسائل سے تعمیر کی ہیں۔



ائر مارشل نور خان

رڈیارڈ کپلنگ نے آج سے ایک صدی پیشتر کہا تھا۔
"مشرق مشرق ہے، اور مغرب مغرب۔ ان کا آپس میں ملاپ نہیں ہو سکتا۔"
وقت گذرتا رہا اور ہوائی جہاز کی ایجاد نے مشرق اور مغرب کے درمیانی فاصلے سمیٹ دیئے۔ ہوائی جہاز اور لوگ دونوں نور خان کو پسند کرتے ہیں۔ جن کی مساعی جمیلہ سے مشرق اور مغرب کا ملاپ ہوا ہے۔ مغرب سے یہاں آنے والے لوگوں کو ہر طرح کی سہولتیں، میسر ہیں جو پاکستان سے اُن کی محبت میں اضافے کا باعث ہوئی ہیں۔ وہ ملک کی قومی ہوائی کمپنی کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ کے سفر سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

ایر وائس مارشل نور خاں نے اجنبی ممالک میں خود کو کبھی اجنبی محسوس نہیں کیا۔ وہ امریکہ یا برطانیہ کا دورہ کر رہے ہوں۔ خواہ روس یا چین کا ہمیشہ اپنے اور ان ممالک کے درمیان خیر سگالی کے رشتوں کا ضرور ذکر کریں گے۔ ان تعلقات کو قائم کرنے میں اُن کی شبانہ روز کوششوں کو بڑا دخل ہے۔

قوتِ تسخیر، انتھک جذبے اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے وہ ایک ایسے انسان ہیں، جنہوں نے کائنات کے بیکراں فاصلے طے کیے ہیں۔ مختلف رنگ و نسل کے لوگوں کے درمیان پہنچ کر اپنی دُور اندیشانہ معاملہ فہمی اور عقابی نگاہوں کی وجہ سے پاکستان کے عزت و وقار میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔

آج پاک فضائیہ سے تعلق رکھنے والے نور خان اکتالیس برس پہلے ایک فوجی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ اُن کے قابلِ عزّت والد ملک مہر خان تھے، جنہیں ملازمت کے دوران نمایاں خدمات کے صلے میں کئی اعزازات ملے۔ جواں عزم نور خان کی تعلیم کرنل براؤن کیمبرج سکول اور پرنس آف ویلز رائل انڈین ملٹری کالج میں ہوئی۔ انہوں نے برطانیہ کے رائل ایئر فورس سٹاف کالج سے گریجویشن کی اور جنوری ۱۹۴۱ء میں رائل انڈین ایئر فورس میں کمیشن حاصل کر کے بھرپور ارادوں کے ساتھ اپنی فضائی زندگی کا آغاز کیا۔

دوسری جنگِ عظیم کے دوران انہوں نے لڑاکا اور غوطہ خور بمباروں کے سکواڈرن میں کام کیا اور جنوب مشرقی ایشیا کی مہمات میں سرگرم خدمات انجام دیں۔ جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو وہ پاک فضائیہ کے ساتھ منسلک ہو گئے اور رسالپور کالج کے کمانڈنٹ کی کلیدی آسامی پر مامور کئے گئے۔ بعد میں وہ ایئر ہیڈ کوارٹرز میں ڈائریکٹر، تنظیم اور اسسٹنٹ چیف آف ایئر اپریشنز، سٹاف مقرر ہوئے۔ ۱۹۵۶ء میں انہوں نے فضائیہ میں ایک عظیم الشان کارنامہ سرانجام دیا اور پاک فضائیہ کے لڑاکا سکواڈرنز کو پسٹن سے جیٹ طیاروں کے دَور میں لے آئے۔ ۱۹۵۷ء میں پاک فضائیہ کی تنظیم نو کے لیے جو کمیٹی تشکیل کی گئی وہ اس کے چیئرمین تھے اور انہوں نے

اِس اہم یونٹ میں نئی روح پھونک دی۔

پاک فضائیہ میں انہیں جو ذمہ داریاں سونپی گئیں، وہ ان سے بکمال خوبی عہدہ برآ ہوئے اور ۱۹۵۹ء میں انہیں ڈیپوٹیشن پر پاکستان انٹرنیشنل ایرلائینز کا مینجنگ ڈائرکٹر مقرر کیا گیا۔ پی۔ آئی۔ اے۔ کے تمام ملازمین انہیں پیار سے "ایم ڈی" کہتے ہیں۔ وہ طویل قامت، سنجیدہ اور ہر دلعزیز شخصیت کے مالک ہیں، جنہوں نے دیگر ہوائی کمپنیوں کی تنظیم و تشکیل کو مدِ نظر رکھتے ہوئے پی۔ آئی۔ اے کو ترقی کے نئے نئے راستوں سے ہمکنار کیا ہے۔ اِس سال فروری سے وہ پی۔ آئی۔ اے کے ساتھ ساتھ شہری ہوابازی کے چیف ایڈمنسٹریٹر بھی مقرر ہوئے ہیں۔

ایر وائس مارشل کی مصروفیات لامتناہی ہیں لیکن وہ وقت کی صحیح قدر جانتے ہیں اور اس کے ایک ایک لمحے سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اِن کے دن ایک پارچہ باف کی شٹل سے زیادہ تیز ہیں اور وہ "آج کا کام کل پر مت چھوڑو" کے مقولے پر یقین رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کرنا چاہتے۔ اُن کا اپنا مقولہ ہے، "ایک آج آنے والی دو 'کلوں' کے برابر ہے۔" یہ الفاظ کتنے دانشمندانہ ہیں اور یہ اُس شخص کے الفاظ ہیں، جس نے ایک وقت کی معمولی سی اور غیر معروف ایرلائن کا سارا حلیہ بدل کر اُسے بین الاقوامی شہرت کی ایک بلند ترین پرواز بنا دیا ہے۔ پی۔ آئی۔ اے کی سُرعت پذیر ترقی، مزید سہولتیں، مضبوط زرِ مبادلہ، جیٹ طیاروں کے استعمال اور قابلِ فخر استعداد سے نور خان نے اپنے نوخیز ملک سے پُوری دنیا کو کیسا چیلنج دیا ہے۔

اپنے طیاروں کو بہتر سے بہترین بنانے کی خواہش میں خواہ وہ سمندر پار اُڑنے والے گرانڈیل جیٹ طیارے ہوں یا مشرقی پاکستان کی دلدلی زمین پر فضائی بس کے طور پر

استعمال ہونیوالے چھوٹے ہیلی کوپٹر تک نور خان تفصیل اور باریک بینی کے ہر مرحلے سے گذرے ہیں اور کچھ نہ کچھ حاصل کیے بغیر کہیں نہیں رُکے۔ معمولی شہری جنہوں نے ساری زندگی ریل گاڑی کا سفر تک نہ کیا تھا، اب ہوائی بس پکڑنے کے لیے دشوار گذار راہیں خوشی خوشی طے کرتے ہیں تاکہ اپنی منزل مقصود پر بروقت پہنچ سکیں۔ وہ مسافر بھی جو اب تک صرف بیل گاڑی کے بے آرام سفر سے آشنا تھے اب اپنے ملک میں ایک مقام سے دوسرے مقام پر پہنچنے کے لیے جدید طیّاروں میں سفر کر سکتے ہیں جہاں انہیں ہلکی پھلکی موسیقی سے لُطف اندوز ہونے، فلم شو دیکھنے، اچھے مشروبات اور لذیذ کھانے کے تمام مواقع میسّر ہیں۔ نور خان کے طریقے دُور دُور تک پسند کئے جاتے ہیں۔ ملکی عوام کی مدد کے لیے جو دو علیحدہ علیحدہ صوبوں میں بٹے ہوئے ہیں اس نے عام کرایہ اور کم کرایہ کی سروسیں جاری کی ہیں جو ملک کے ہر حصّے میں رواں دواں ہیں۔ یہ سروسیں جہاں ملکی ترقی کے لیے معاون ثابت ہوئی ہیں، وہیں پر انہوں نے انسانیت کی یہ خدمت بھی کی ہے کہ اب لوگ دریاؤں اور پہاڑوں کے پار بسنے والے اپنے رشتہ داروں کو بآسانی مل لیتے ہیں۔

ایر وائس مارشل نور خان کی زیرِ نگرانی پانچ سال کے عرصے میں پی۔ آئی۔ اے نے رفتہ رفتہ اپنے آپ ہی ترقی کی ہے۔ اگرچہ امریکی امداد پروگرام کے تحت پان امریکن کی طرف سے راہنمائی کا سلسلہ بند ہو گیا تھا۔ اس کے بعد بھی پی۔ آئی۔ اے پاکستان سے نکل کر برطانیہ۔ یورپ اور نئی دنیا تک پھیل گئی۔ بلا خوف و تردید یہ کہا جا سکتا ہے، کہ پی۔ آئی۔ اے نے روس اور چین تک پرواز کا سلسلہ قائم کر کے بامِ کمال پر کمند ڈال لی ہے جبکہ اس سے کہیں طاقت ور ملک یہ کام نہ کر سکے۔

ملک نور خان کی قوتِ استعداد اور ذاتی مساعی سے پاکستان کو اس قدر زرِمبادلہ

ملا ہے کہ ہر سال ہونے والے منافع سے قومی ہوائی کمپنی اپنی تنظیم نو اور نیا سامان خریدنے کے قابل ہو گئی ہے اور اب پی۔ آئی۔ اے اپنی پروازوں کا سلسلہ دُنیا کے اُن دارالحکومتوں تک بڑھانے کے لیے فکر مند ہے جو اس کی آمد کے منتظر ہیں۔ نور خان ایسی معروف قابل ہستی ہیں جنہوں نے پی۔ آئی۔ اے کو اور کئی قابل انسانوں سے بھی روشناس کرایا ہے۔ ان کے انتہائی قابل کمرشل مینجر جے۔ ایس۔ مرزا اور فعال پبلک ریلیشنز ڈائریکٹر عمر قریشی حقیقی معنوں میں اس ہوائی کمپنی کے لیے ہی جیتے، سانس لیتے اور سوتے ہیں کسی دن بھی انہیں اپنے ایم۔ ڈی کے ساتھ دُور دراز ملکوں میں پی۔ آئی۔ اے کے نئے راستوں پر بات چیت کرتے ہوئے پایا جا سکتا ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ کراچی، ایشیا کے سنگم پر واقع ہے اور ایک بڑے ہوائی اڈے کے ساتھ آتے جاتے دیو ہیکر جیٹ طیاروں کے ٹھہرنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ ایکسچینج کی سہولتیں اور باہمی تعاون دونوں کے لیے سود مند ہوگا۔

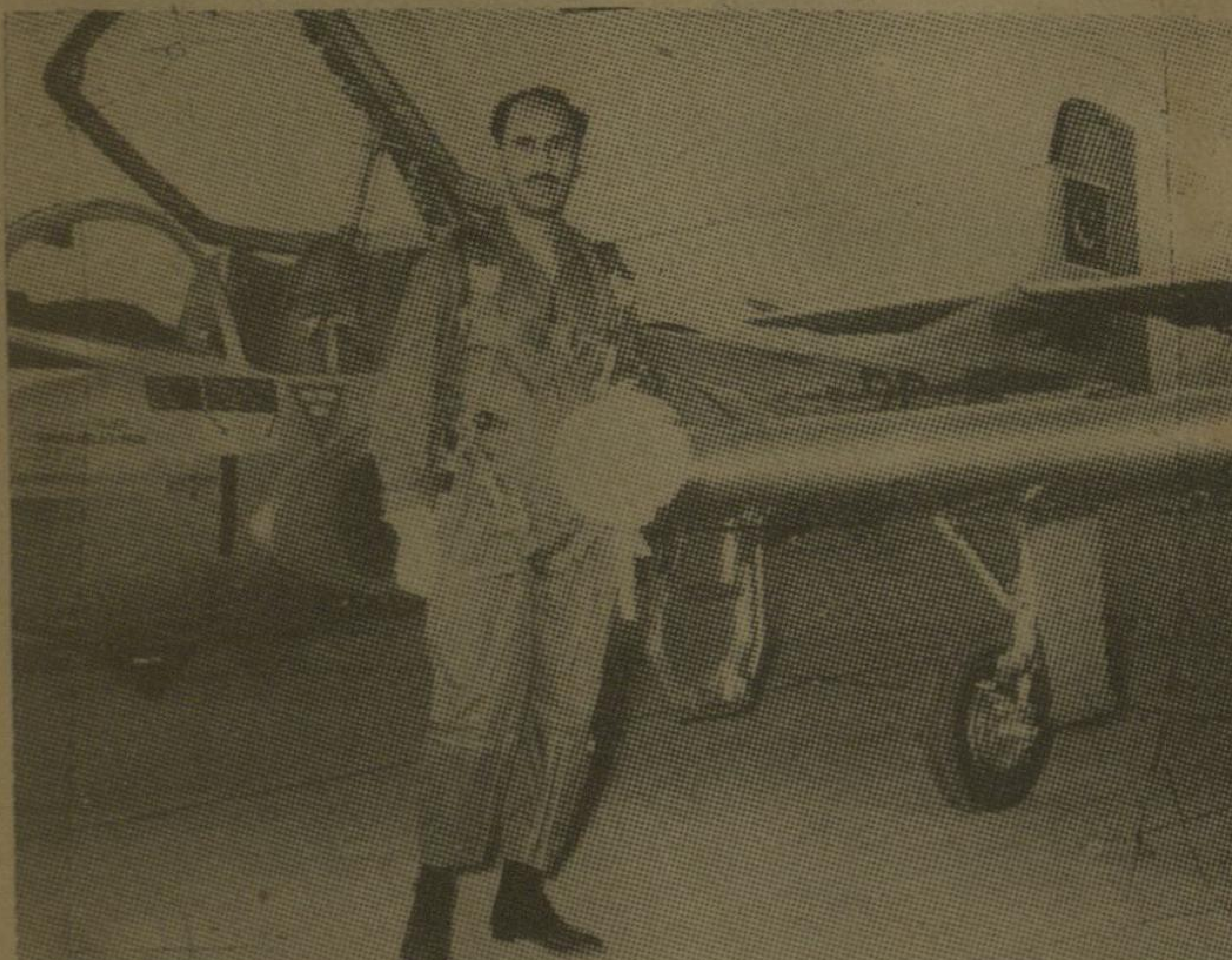
یہ ان کی معاملہ فہمی کی قوت کے طفیل ہی ہے کہ اپنے ہمسایہ افغانستان کی قومی ہوائی کمپنی "ایریانا" پی۔ آئی۔ اے کے اشتراک سے پشاور اور کابل کے درمیان سلسلہ پرواز جاری رکھے ہوئے ہے۔ "درہ خیبر دیکھیے۔ ایک غیر ملکی زمین کا سفر کیجیے"، یہ ان کے ایک اشتہار کے الفاظ ہیں۔ اس اشتراک کے نتائج نہایت خوشگوار ثابت ہوئے ہیں، پاکستان اور افغانستان کے عوام کے درمیان خیر سگالی کے جذبات اور ایک دوسرے پر اعتماد کی ایک نئی فضا پیدا ہو گئی ہے۔ جس میں جزوی طور پر ان مشترکہ پروازوں کا بھی ایک نمایاں حصہ ہے۔ اہلِ افغانستان بڑی خوشدلی سے پاکستان کے سفر پر آتے ہیں جبکہ پاکستانی بڑے جوش سے کابل دیکھنے جاتے ہیں۔

ائیر مارشل نور خان کو ہوائی کمپنی سے بیحد محبت ہے اور وہ آدھی سے زیادہ زندگی ہوا میں گذارتے ہیں پھر بھی وہ ایک ذمہ دار شوہر اور تین، سات سالہ، نو سالہ اور تیرہ سالہ بیٹیوں اور ایک گیارہ سالہ بیٹے کے شفیق باپ ہیں۔ حقیقت میں سارے کنبے کو ہوابازی سے بڑی محبت ہے، اگرچہ کم سن بچے زیادہ تر وقت گھر اور سکول میں علم حاصل کرتے ہوئے بسر کرتے ہیں۔ وہ کبھی کبھی اپنے پاپا سے اس جیٹ دور کے متعلق سوالات کر کے انہیں حیران کر دیتے ہیں کیونکہ ایر وائس مارشل کے بچپن میں تو ایسی باتیں ہوتی ہی نہیں تھیں۔ وہ آج شنگھائی میں ہیں کل لندن میں ہوں گے لیکن جن دنوں میں وہ وطن میں ہوں وہ ایک "ابا" کے دن ہوتے ہیں۔ جدید ترین ہوٹلوں کے سلسلے کے منتظم بین الاقوامی ادارے "پاکستان سروسز لمیٹڈ" کے چیئرمین اور پی۔ آئی۔ اے کے پولٹری فارم کے چیئرمین کی حیثیت سے وہ انٹرکانٹینینٹل میں ہونے والے عشائیوں میں اپنے خاندان کو بڑی مسرت سے لے جاتے ہیں یا مرغی خانے میں مرغیوں کے ہزاروں ننھے منے بچے دکھانے اور کبھی کبھی محض تفریح کے لیے وہ اپنے کنبے کو یہاں لے آتے ہیں۔ "سفر تحمل سکھاتا ہے اور حال اور مستقبل کے لیے کئی تصورات کو جنم دیتا ہے۔" یہ نور خان کا کہنا ہے۔ سفر کے متعلق ان کے نظریات نے انہیں انمول انعامات دیئے ہیں۔ ان میں لبنان کے صدر کی طرف سے ایک بیش قیمت تمغہ اور سب سے بڑھ کر یہ انعام کہ انہیں یقین ہے کہ پاکستان آج کی نسبت کل زیادہ معروف اور مشہور ہو گا۔

نور خان ان شہریوں میں سے ہیں جنہوں نے دنیا کے ہوائی راستوں پر اپنے ملک کا نام ثبت کر دیا ہے۔

(جب یہ مضمون لکھا گیا تو ائیر مارشل نور خان پی۔ آئی۔ اے کے سربراہ تھے۔ اگست

۱۹۶۵ء میں وہ پاک فضائیہ کے کمانڈر انچیف مقرر ہوئے اور ستمبر کی پاک بھارت جنگ



ائیر مارشل نور خان ۔ پرواز کے بعد فضائی مستقر پر

میں ان کی قیادت میں پاک فضائیہ نے بے مثال جرأت اور قابلِ فخر کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور اپنے سے چھ گنا بڑی بھارتی فضائیہ کی کمر توڑ کر رکھ دی ۔ پی ۔ آئی ۔ اے میں جہاں ان کی انتظامی صلاحیتوں کا ڈنکا بجتا تھا اب انہوں نے اپنے قائدانہ تدبّر کا لوہا بھی منوالیا ۔ ان کے شاندار کارناموں پر ان کو ایئر مارشل کا عہدہ اور ہلال جرأت کا اعزاز دیا گیا ہے ۔

محمدؐ وصال الدین



"جو شخص تعریف یا صلہ کی توقع کئے بغیر بھلائی کرتا ہے۔ انجام کار ان دونوں کا مستحق قرار دیا جاتا ہے۔" یہ جملہ مہابھارت سے لیا گیا ہے مگر ڈیڑھ سو سال ق م سے آج تک اس کو درست تسلیم کیا گیا ہے کیونکہ آپ سے بھی ہمیشہ ایسا ہی برتاؤ کیا جائے گا جیسا کہ آپ دوسروں سے کریں گے۔

موجودہ تمدن سے ہزاروں سال قبل جب یہ دنیا اپنے ابتدائی دور میں تھی۔ کاروباری ضابطۂ اخلاق عام نہیں ہوا تھا اور سادگی کا دور دورہ تھا۔ مہابھارت کے یہ الفاظ ایسے ہی موزوں تھے۔ جیسے کہ بیس صدیوں بعد دبلے پتلے اور باوقار وصال الدین کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ جو ملک کے ایک بلند مرتبہ حفاظتی ادارہ کے سربراہ ہیں۔ بطور امریکن لائف انشورنس کمپنی کے نائب صدر کے۔ آپ کے خیالات ایسے ہی ہیں جیسے کہ ایک باپ کے اپنے بچوں کے لیے ہو سکتے ہیں۔ اپنے عملہ سے آپ ایسی ہی توقعات رکھتے ہیں۔

"میں صرف ان کو بلند مرتبہ دینے کے لیے محنت کرتا ہوں۔ اپنا خیال بعد میں

کرتا ہوں۔"

ایسے خیالات و جذبات کا حامل وہ شخص ہی ہو سکتا ہے جس نے اپنی محنت سے ترقی حاصل کی ہو اور "وصال" ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے سترہ سال کی عمر میں ایسے وقت کام شروع کیا جب دوسرے لوگ کالج کے خواب دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ ہر نیا دن آپ کے لیے نیا معرکہ لاتا ہے اور ہر لمحہ نامعلوم امکانات اور نئے تجربات سے بھرپور ہوتا ہے۔ آپ نے اپنی زندگی کا آغاز ترپن برس قبل کیا اور اب بھی اپنی عمر سے دس سال چھوٹے معلوم ہوتے ہیں۔ ۱۹۲۸ء میں آپ نے بھارت کے ضلع ڈیرہ دون میں "سن لائف آف کینیڈا" میں انشورنس ایجنٹ کی حیثیت سے کام شروع کیا۔ اپنی محنت اور لگن کی بدولت لگاتار ترقی کی منازل طے کرتے گئے۔ جلد ہی آپ کو معلوم ہو گیا کہ آپ انشورنس پالیسی ہر جگہ فروخت کر سکتے ہیں۔

اسی زمانہ میں آپ نے قیام پاکستان کی جدوجہد میں حصہ لینا شروع کیا اور ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک ضلع مسلم لیگ کے صدر رہے۔ مگر آپ کی جدوجہد اور آپ کی جماعت کی مضبوطی سے خوفزدہ ہو کر یوپی کی ہندو حکومت نے آپ کو جیل میں ڈال دیا اور دسمبر کا سرد موسم آپ نے اسی جیل میں گذارا۔ مگر جیل میں بیکار بیٹھنے کی بجائے بیمہ کے فوائد کی تشہیر کرتے رہے۔ تھوڑے عرصہ میں ہی تمام قیدیوں کو اپنا ہم خیال بنالیا۔ اور جب آپ جیل سے باہر آئے تو تمام قیدیوں کا بیمہ کر چکے تھے۔ اس کے بعد آپ سن لائف کمپنی کے مینجر مقرر کئے گیے۔ قیام پاکستان کے بعد آپ نے اس کمپنی کو خیرباد کہہ دیا۔ کراچی آئے تو ایک کمپنی کے کنٹرولر مقرر کیئے گیئے۔ بعد میں اس کمپنی کے مینجر بن گیے۔ اور ۱۹۵۴ میں امریکن لائف انشورنس کمپنی میں شامل ہوئے۔

وصال الدین کی زیر قیادت کمپنی نے اس شاندار انداز میں ترقی کی کہ آج یہ کمپنی ملک کو اس قدر فوائد پہنچا رہی ہے جو کسی دوسری کمپنی سے نہیں پہنچے۔ آپ کے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کسی دوسری کمپنی کے چیئرمین، ڈائرکٹر یا حصہ دار نہیں ہیں۔ بلکہ صرف ایک کمپنی کے نائب صدر ہیں۔ جس کے لیے آپ دل و جان کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ آپ نے بتایا کہ اس تنظیم سے چار ہزار افراد متعلق ہیں۔

محمد وصال الدین اپنی کمپنی کے لیے کافی سفر کرتے رہتے ہیں اور دنیا کے بیشتر ممالک میں آتے جاتے رہتے ہیں۔

ہر جگہ اپنی کمپنی کی تشہیر میں مصروف رہتے ہیں۔ غیر ممالک کے لوگوں پر بھی آپ نے اپنے کاروباری اصولوں کا سکہ بٹھایا ہے۔

اس سال کے اوائل میں آپ نے امریکن لائف کے پریذیڈنٹ مسٹر رابرٹ آئر سے ملاقات کی۔ جو اپنی اہلیہ کے ہمراہ پاکستان کے دورہ پر آئے تھے۔ مسٹر آئر پاکستان کی مختصر سے عرصے میں ترقی سے ازحد متاثر ہوئے اور آپ نے کہا کہ "پاکستان عظیم لوگوں کا عظیم ملک ہے۔"

امریکہ میں کافی لوگ پاکستان کا نام سن کر شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں، مگر مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی ہے کہ ہمہ جہتی ترقی نے ان شبہات کو بے بنیاد ثابت کیا ہے۔ آپ نے مقامی اخبار نویسوں کو بتایا کہ "ایلکو" پاکستان (امریکن لائف انشورنس کمپنی کا مخفف) ملک کی اقتصادی ترقی میں اپنا کردار بخوبی ادا کرنے کا تہیہ کر چکی ہے آپ نے بتایا کہ ہماری املاک میں سے سات کروڑ چونتیس لاکھ قرضے سرکاری کفالتوں، بانڈز، اور قومی تعمیر کے منصوبوں میں لگائے جا چکے ہیں۔ منافع کا نوے فی صد حصہ پالیسی ہولڈروں میں

تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کافی انکم ٹیکس بھی ادا کیا جاتا ہے۔ ڈھاکہ میں ہم نے پانچ منزلہ بہت بڑی عمارت تعمیر کی ہے یہ عمارت تاریخی پس منظر کی رعایت سے مغل طرز کا نمونہ ہے۔ اس کے متعلق مشرقی پاکستان کے عوام میں کافی جوش خروش پایا جاتا ہے "برقی دروازے" تو خصوصی توجہ کا مرکز ہیں جو چھوئے بغیر ہی کھلتے یا بند ہوتے ہیں، بلکہ لوگ تو اس کو طلسمی کارنامہ قرار دیتے ہیں۔ اس کا تصور کمپنی کے بانی مسٹر وی سٹار نے پیش کیا تھا جنہوں نے بارہ سال قبل سابق گورنر جنرل مسٹر غلام محمد کی دعوت پر کمپنی کی شاخ مشرقی پاکستان میں قائم کی تھی۔ میکلوڈ روڈ کراچی پر کمپنی کی زیر تعمیر گیارہ منزلہ عمارت بھی اسی طرز کی ہوگی، گو نئے کارناموں کے متعلق وصال الدین بھی مسٹر آئر جیسا ہی جوش و خروش محسوس کرتے ہیں مگر آپ کے جذبہ میں محبت کو بھی تھوڑا دخل ہے تھوڑے دنوں تک پاکستان کے تمام شہروں میں ہر پالیسی ہولڈر کو رہائش مہیا کیا جائے گی جس کی قیمت آسان اقساط میں وصول کی جائے گی اور پندرہ سال کے عرصہ میں وہ اپنے زیر قبضہ مکان کے مالک بن جائیں گے۔

اخبارات میں "اس ماہ کا بہترین سیلز مین" کے زیر عنوان فوٹو شائع کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا گیا ہے اس کا تصور بھی آپ ہی نے پیش کیا تھا۔ آپ اس بات کا خیال رکھتے کہ ہر ملازم کو اس کے فرائض کے بنیادی اصولوں سے بھی آگاہ کر دیا جائے۔ آپ ایک اچھے مضمون نگار بھی ہیں اور بیمہ کے کاروبار کے جملہ پہلوؤں سے متعلق آپ کے مقالات اخبار میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ اس سال آپ کی کمپنی کے چودہ ملازموں نے چارٹرڈ انشورنس انسٹی ٹیوٹ کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی تو آپ کی خوشی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ بنیادی طور پر آپ ایک خوش باش شخص ہیں اور جب کمپنی کے کلب نے خیراتی مقاصد کے لیے

ملکی وغیر ملکی فن کاروں کی مدد سے میلوں، رقصوں اور ثقافتی پروگراموں کا آغاز کیا تو آپ نے بخوشی اس کی اجازت دی۔ گذشتہ ثقافتی شو مشرقی پاکستان کے طوفان زدگان کی امداد کے لیے ہوٹل میٹروپول میں منعقد کیا گیا جس کے دوران دس ہزار روپے جمع کیے گئے۔ اور کمپنی کے عملہ نے بھی ایک روز کی تنخواہ اور کمیشن بطور چندہ دیا۔ عملہ کا یہ اقدام بلا ترغیب — ان سہولتوں کے جواب میں تھا جو کمپنی کی طرف سے ان کو مہیا کی گئی ہیں۔ یہ سہولتیں کمپنی کے امریکی ملازموں سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ اس سال ۲۴ رمئی کو آپ نے اپنی سالگرہ منائی اس موقعہ پر آپ کے خاندان کے ارکان اور عملہ کے بیشتر لوگ ایک ریستوران میں مدعو کیے گئے اس موقعہ پر آپ کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے آپ فیلڈ کے عملہ اور ایجنٹوں کے خلوص سے بھی از حد متاثر ہوئے، جنہوں نے آپ کو غیر معمولی تحائف پیش کیے۔

کمپنی کے عملہ کو جدید ترین سہولت یہ دی گئی ہے کہ وہ ہفتہ میں پانچ روز کام کرتے ہیں اور مسٹر وصال الدین کے الفاظ میں لوگ اس سے صحیح معنوں میں لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ ان کو آرام کے لیے کافی وقفہ مل جاتا ہے جس کے دوران وہ اپنے کواپریٹو سٹور سے کم قیمت پر ضروری اشیاء بھی حاصل کر سکتے ہیں۔

کتاب پریس میں جارہی تھی تو وصال الدین صاحب کو ایک اور ملی امتیاز مل گیا ——— صدر مملکت نے موصوف کو ملکی خدمات کے سلسلے میں اس سال 'ستارۂ خدمت' کے اعزاز سے نوازا ہے۔





چین میں
پی، آئی، اے
کی افتتاحی
پرواز کا
خیر مقدم

چراغ تلے

مشتاق احمد یوسفی

مشتاق احمد یوسفی نے اردو مزاح کو ایک نئے مزاج سے آشنا کیا ہے یہ مزاج اس کا اپنا مزاج ہے —— اس رنگا رنگ مجموعے میں ایسے رچے ہوئے مزاج کی جھلکیاں نظر آتی ہیں جو چوٹ کھا کر بدمزہ نہیں ہوتا۔ طرز تپاک اہلِ دُنیا دیکھ کر اس کی پیشانی پر بل نہیں پڑتے بلکہ سوچ کی گہری لکیریں اُبھر آتی ہیں جو دیکھتے دیکھتے تبسّم زیرِ لب میں تحلیل ہو جاتی ہیں۔ وہ ہنسی ہنسی میں کام کی بات کہہ جاتا ہے۔ دوسروں پر ہنسنے سے پہلے اپنے ہی داغوں کی بہار دکھا کر دوسروں کو ہنسایا ہے اور پھر خود بھی اس میں شریک ہو گیا ہے۔

یُوسفی کا مزاح شگفتہ و شاداب ہے اور اس کا طنز کڑی کمان کا تیر۔ ان مضامین میں تفکّر و تفنّن کا ایک خوبصورت امتزاج ملتا ہے اور تحریر کا تیکھا اور رسیلا اسلوب، مشاہدے کی وسعت اور طبیعت کے نکھار کا پتہ دیتا ہے۔ وہ لہجے کے اُتار چڑھاؤ کی نزاکتوں سے واقف ہے اور الفاظ کا مزاج پہچانتا ہے۔

یہی چیز ایک ایک لفظ کو تلوار اور ہر ایک مضمون کو خندۂ تیغِ اصیل بنا دیتی ہے

فوٹو آفسٹ کی خوبصورت چھپائی

سفید کاغذ مجلد ۴/۰۰

مکتبۂ جدید۔ لاہور

سرچشمۂ حیات کلیدِ اعظم

روحانی قوت اور دل کی مرادیں حاصل کرنے کے انمول راز

"روحانی قوت پر ہم سب کا ایمان ہے۔ دعا کے پُراثر اور نتیجہ خیز ہونے پر ہم سب کو یقین ہے۔ حق تعالےٰ سے ایک زندہ اور منفعت بخش تعلق قائم کرنے کی آرزو ہم سب کے دلوں میں ہے لیکن یہ راستہ جس قدر دلنواز ہے اُسی قدر نشیب و فراز سے پُر اور دشوار گذار گھاٹیوں سے اٹا پڑا ہے اور اکثر اوقات پہلے ہی قدم پر راہرو یا راستے سے بھٹک جاتا ہے یا بھول بھلیوں کا شکار ہو کر رہ جاتا ہے۔

اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہماری مناسب رہنمائی نہیں ہوتی۔ کوئی انسان ایسا نہیں ملتا جو اس راستے پر ہماری دستگیری کرے اور نہ ایسی کتابیں دستیاب ہیں (بالخصوص اردو میں) جن میں کسی صاحبِ نظر اور صاحبِ ایمان نے اس وادیٔ دلکش کی خود سیر کر کے ہمیں سیدھے راستے اور صاف صاف طریقے پر نشانِ منزل کا پتہ دیا ہو۔

ایسے میں جناب فیروز نظامی کی تصنیف "سرچشمۂ حیات" دیکھ کر حیرت انگیز مسرت ہوتی ہے۔ نظامی صاحب جدید انداز کے تعلیم یافتہ اور ہمارے ملک میں موسیقی کے مانے ہوئے استاد اور ماہرِ فن ہیں مگر اس کو حسنِ اتفاق کہئے یا ہماری خوش بختی کہ وہ روحانیت کے بھی ویسے ہی رمز شناس نکلے۔ انھوں نے کائنات کی حقیقت، روح کی عظمت، اور حق تعالےٰ سے مدد اور رہنمائی حاصل کرنے کے نظم و آداب پر ایسے سادہ، واقعاتی اور دلنشیں اسلوب میں اظہار حقائق کیا ہے کہ اردو زبان میں اس سے پہلے ایسی کامیاب اور دل پر اثر کرنے والی کتاب مَیں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔

مجھے یقین کامل ہے کہ یہ کتاب ہمارے ملک کے بے شمار انسانوں کے لئے قوتِ ایمانی اور خوشحالی و کامیابی کی راہیں کشادہ کر دے گی۔"

پروفیسر محمد عثمان
گورنمنٹ کالج۔ لاہور

قیمت ۲/۵۰

مکتبۂ جدید، لاہور

لذّتِ آوارگی

اے ڈی اظہر

ڈاکٹر جسٹس ایس اے رحمٰن

جج سپریم کورٹ، پاکستان

شاعری دل کی زندگی سے عبارت ہے۔ جنابِ اظہر اپنی زندہ دلی کے باعث معروف ہیں اس لئے تعجّب ہوتا، اگر وہ سخن شناس ہونے کے علاوہ سخن گو نہ ہوتے، بہر حال اس کتاب سے ظاہر، بلکہ اظہر ہے کہ دلِ زندہ نے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا اور انھوں نے چمنِ شعر میں بلبلوں کی ہمزبانی نہیں چھوڑی۔ مجھے امید ہے کہ اہلِ ذوق اس متین و رنگین مجموعے سے حظ اٹھائیں گے اور جنابِ اظہر کی لذتِ آوارگی کی کماحقہّ، داد دیں گے۔

ایس اے رحمٰن

سائز: بڑا
قیمت مجلد سفید کاغذ ۰۰/ ۸
" سستا نیوز ایڈیشن ۰۰/ ۳

مکتبۂ جدید، لاہور

جہاں گرد کی واپسی

مصنف : ہومر

مترجم : محمد سلیم الرحمٰن

اس عظیم رزمیے کا ہیرو : ادسیوس نہ کوئی برخود غلط سورما ہے نہ نیم دیوتا، مگر اسکی شخصیت کے بے شمار پہلو ہیں۔ اودسیوس کی ذات ایک طرح سے امیر حمزہ اور عمرو عیار کا مجموعہ ہے۔ امیر حمزہ شجاعت و وجاہت کے نمائندہ ہیں اور عمرو مکر و فن کا۔

ادسیوس اس داستان میں کہیں دلیری کو بروئے کار لاتا ہے اور کہیں عیاری کو، بلکہ یہ کہنا صحیح ہوگا کہ اس کے خاص خاص کارنامے دلیری اور عیاری کا دلکش امتزاج ہیں۔ لیکن ادسیوس میں ایک صفت ایسی ہے جو امیر حمزہ اور عمرو عیار دونوں میں نہ تھی، اور یہ چیز اسے ان دونوں سے بلند و بالا کر دیتی ہے یہ اپنی بیوی اور اکلوتے بچے اور وطن عزیز کی لگن کے رُوپ میں اپنی پرانی جڑوں کی تلاش ہے یہ تلاش اتنی شدید ہے کہ ہر ترغیب پر غالب آجاتی ہے اس لکڑھارے کی طرح جس نے سونے اور چاندی کے کلہاڑے کو ٹھکرا دیا تھا اور سچ بولا تھا اور اپنے پرانے دھرانے لوہے کے کلہاڑے پر اکتفا کی تھی۔ اودسیوس نے بھی امر جوانی اور حسین دیویوں کی سدا بہار صحبت کو ٹھکرا دیا اس کشمکش کو ظاہری دنیا کے گردابوں، ہیجانوں، ہنگاموں اور ہفت خوانوں میں اپنی گہری اور سچی روح کی تلاش کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔ اودیسی، جہاں گرد اودسیوس کی کہانی، دنیا کے اولین عظیم شاعر ہومر کا شہکار ہے۔ اسے اردو کے جواں سال و جواں فکر شاعر محمد سلیم الرحمٰن کے الفاظ میں پیش کیا جاتا ہے۔

خوبصورت اور دلکش ٹائپ کی چھپائی

بڑا سائز، سفید کاغذ، مجلد — قیمت -/12

مکتبہ جدید، لاہور



مصنفه
جو گذشته نو سال سے
پاکستان میں ہیں۔